

الاسلام

حصہ دوم

از

علامہ ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی

نفیس اکیڈمی

بلاس اسٹریٹ کراچی

قیمت دس روپے



جملہ حقوق محفوظ !

ناشر

چوہدری محمد اقبال سلیم گاہندی

مالک

نقشہ اکیڈمی و مسعود پبلشنگ ہاؤس

ملا سس اسٹریٹ کراچی  
DATA ENTERED

۲۳۲۹۵۶

فون

خالد اقبال گاہندی

بہ اہتمام

اپریل ۱۹۰۲ء

طبع اول

اپریل ۱۹۶۹ء

طبع دوم

منطوعہ

(بانتہام مستقیض احمد صدیقی انٹرنیشنل پبلس کراچی میں چھپا)



# حرف اول

امام محمد اقبال سلیم گاندھی

علامہ ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی گورکھپوری کی مشہور و مقبول کتاب الاسلام

پیش خدمت ہے۔ علامہ عباسی اس بیسویں صدی عیسوی کی پہلی چوتھائی میں ایک بہت بڑے فاضل، روشن دماغ، صاحب قلم اور وسیع مطالعہ رکھنے والے عالم تھے۔ وہ انگریزی زبان کے بھی مصنف تھے اور عربی و فارسی کے بھی اچھے عالم تھے۔ انھوں نے ان اعتراضوں اور بے جا حملوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا جو غیر مسلم اور متعصب مستشرقین کی طرف سے مذہب اسلام اور تعلیمات اسلامی پر بار بار ہوتا رہتا ہے۔ ان کے پاس قیمتی کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ اور اس ذخیرہ میں وہ ہمیشہ اضافہ کرتے رہتے تھے۔

اپنی اس کتاب الاسلام میں انھوں نے جہاں بے جا اور جاہلانہ اعتراضات کا مدلل و مسکت جواب دیا ہے۔ وہاں ہر قسم کے عقلی، تاریخی اور علمی دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ دین اسلام اور اسلامی تعلیمات اللہ جل جلالہ کی طرف سے دنیائے انسانیت کے لئے ایک نعمت اور سب سے بڑی نعمت ہے۔ اس نعمت خداوندی کی قدر نہ کر کے انسانیت اپنا نقصان کر رہی ہے اور ان دکھوں اور دردوں سے گرا رہی ہے جن کا مداوا صرف اس نعمت کی قدر پہچاننے اور اس سے فائدہ حاصل کرنے سے ہی ممکن ہے۔

یہ کتاب بہت مقبول ہوئی تھی اور اہل علم نے اس کتاب کے متعلق بڑے تعریفی ملاحظات لکھے تھے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کتاب جتنی اس وقت مفید مان گئی تھی اس سے زیادہ مفید اس وقت ثابت ہو سکتی ہے اور جس قدر اس کی ضرورت اس وقت ہو سکتی تھی آج اس سے کہیں زیادہ اس کی ضرورت ہے اگرچہ :

ستیزہ کا رہا ہے ازل سے تا امروز  
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی!



لیکن شاید اس زمانے میں شرار بولہبی بڑی قوت کے ساتھ چراغ مصطفوی سے جنگ آزما ہے۔ افکار و اعمال کی دنیا میں ایک خلفشار سا پہا ہے۔ جو جتنا دانا سمجھا جاتا ہے اتنا ہی بے یقین ہے۔ اور جو جس قدر آزادی فکر کا مدعی ہے اتنا ہی زیادہ ذہنی انتشار کے پیچ در پیچ پھندوں میں الجھا ہوا ہے۔

غرض اس یقین کے ساتھ کہ آج اس کتاب کی ضرورت کل سے زیادہ ہے، ارادہ کر لیا گیا کہ اس کتاب کا ایک جدید ایڈیشن شائع کیا جائے۔ ویسے بھی یہ کتاب مطبع مینٹھوڈسٹ پبلشنگ ہاؤس لکھنؤ میں ۱۹۰۲ء میں چھپی تھی اور اب کمیاب ہی نہیں بلکہ نایاب ہو چکی ہے۔

نہیں اکیڈمی کی طرف سے نایاب کتابوں کی جدید اشاعتوں کا جو سلسلہ جاری ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ کتاب اس سلسلہ کی ایک مفید اور کارآمد کتاب ثابت ہوگی۔ اور اس خدا سے بزرگ و برتر سے جس کے قبضہ میں انسانوں کے قلوب ہیں دعا کرتے ہیں کہ اس کتاب کو ناظرین کے لئے مفید اور کارآمد اور ایمان و ایقان کی استواری کیلئے اسے ایک سبب بنا کر ہماری اس حقیر کوشش کے سر پر قبولیت کا تاج رکھ دے۔ آمین

تبلیغ



## فہرست مضامین

## باب چہارم

شخصی معاملات اور ضابطہ عدالت

۱۰	فصل ۳۲	شرکت کاروبار
۱۶	فصل ۳۳	توریت
۱۷	.	آیات قرآنی
۲۱	.	ہندوؤں کا قانون
۲۲	.	یورپ کا قانون
۲۵	.	دیگر مختلف قومیں
۲۶	.	ہند کے مسلمان
۳۱	فصل ۳۴	وصیت
۳۳	فصل ۳۵	بیع
۳۵	.	آیات قرآنی
۳۹	فصل ۳۶	ہبہ
۵۱	فصل ۳۷	وقف کار خیر
۵۲	فصل ۳۸	نکاح
۵۵	.	ہندوستان کے مسلمانوں میں شادی بیاہ
۵۹	.	ازدواج میں بے احتیاطی
۶۲	.	محرمات نکاح
۶۵	فصل ۳۹	مہر
۶۶	فصل ۴۰	طلاق
۶۹	فصل ۴۱	کثرت ازدواج



۹۱	عقد بیوگان	فصل ۲۲
۱۰۴	ہندو بیواؤں کی فریاد	"
۱۰۵	اہمات مومنین ازواج مطہرات رسولؐ	فصل ۲۳
۱۲۱	مدالتی کارروائی	فصل ۲۴
۱۲۱	عہدہ قضاہ	"
۱۲۴	ولیالیہ	"
۱۲۴	پنچایت	"
۱۲۵	شہادت	فصل ۲۵
۱۲۶	شفعہ	"
۱۲۷	مفقود الخیر	"
۱۲۹	حقیقت اسلام	فصل ۲۶
۱۳۴	رسالت	"
۱۴۰	کارخانہ قدرت پر نصوص قرآنی	فصل ۲۷
۱۴۸	حکمت اور فلسفہ کے متعلق آیات قرآنی	فصل ۲۸
۱۵۰	اسلام اور فلسفہ	فصل ۲۹
۱۵۷	آفرینش ارض و سما	فصل ۵۰
۱۷۷	سحر (جادو)	فصل ۵۱
۱۷۹	مسئلہ جبر و اختیار قضاہ و قدر	فصل ۵۲
۱۹۸	قصص قرآنی	فصل ۵۳
۲۰۱	ابوالبشر آدمؑ و حضرت نوحؑ - ذوالقرنین	"
۲۰۸	حضرت ابراہیمؑ	"
۲۱۲	حضرت یوسفؑ	"
۲۱۳	حضرت داؤدؑ	"
۲۱۴	حضرت سلیمانؑ	"
۲۱۵	حضرت موسیٰؑ	"

## باب پنجم

عقائد و علمی مباحث



۲۱۶	حضرت خضرؑ	فصل ۵۳
۲۱۷	قارون	.
۲۱۸	حضرت یونسؑ	.
۲۱۹	حضرت عیسیٰؑ	.
۲۱۹	اصحاب کہف	.
۲۲۱	لقمان	.
۲۲۱	اصحاب فیل	.
۲۲۲	شیطان اور جن	فصل ۵۴
۲۲۲	قومی ترقی	فصل ۵۵
۲۲۸	ضعف اسلام	فصل ۵۶
۲۳۰	مذہبی نفاق	فصل ۵۷
۲۳۲	دنیا خوش رہنے کی جگہ نہیں	فصل ۵۸
۲۳۸	لیست الشباب لیبور	فصل ۵۹
۲۵۱	موت	فصل ۶۰
۲۵۲	لذات دنیا	فصل ۶۱
۲۵۲	اجبارا	فصل ۶۲
۲۵۹	حرص	فصل ۶۳
۲۶۱	خلق الانسان ضعیفا	فصل ۶۴
۲۶۲	نطق اور دل و دماغ سے اسکا تعلق	فصل ۶۵
۲۶۶	ترک حیوانات	فصل ۶۶
۲۷۲	آب زمزم	فصل ۶۷
۲۷۸	جھاڑ پھونک دعا و تعویذ	فصل ۶۸
۲۸۱	اسلام اور غلامی	فصل ۶۹
۲۸۶	سود خواری	فصل ۷۰
۲۸۹	رسم پردہ	فصل ۷۱

بنا  
پیر  
پیر  
پیر



۲۹۲	روح اور مسئلہ تناسخ	فصل ۴۲
۲۹۲	تجہیز و تکفین	فصل ۴۳
۲۹۶	مختلف مباحث پر نفوس قرآنی	فصل ۴۴
۲۹۶	شہادت	،
۲۹۶	صبر	،
۲۹۶	حب دنیا	،
۲۹۷	صادق البیانی والفاظی وعدہ	،
۲۹۸	شفاعت و رسالت	،
۲۹۹	بداخت	،
۲۹۹	صدقہ	،
۲۹۹	مال یتیم	،
۳۰۰	شاعری	،
۳۰۰	عوام و صلاہ	،
۳۰۰	مسلمانان ہند کی حالت زار	فصل ۴۵



# باب چہارم (۱۴)

شخصی معاملات اور

ضابطہ عدالت



## فصل ہفتم

### شرکت کا دوبارہ

انسان اپنی خلقت میں ایک دوسرے کا محتاج پیدا ہوا ہے۔ بنی نوع انسان کو باہم مل جل کر کام کرنا ناگزیر ہے۔ کوئی قوم کوئی فرقہ کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں چند آدمیوں کا ایک دل ہو کر شرکت باہمی سے کاروبار کرنا محمود نہ خیال کیا جاتا ہو۔ یہی شرکت کبھی انفاق کے لفظ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ بہر حال یہ مسلم ہے کہ دنیاوی کاروبار میں ایک انسان کا دوسرے انسان سے مدد مانگنا یا بہ شرکت اس کے کام کرنا لایا بدی ہے۔ اب بحث یہ ہے کہ کن کن امور میں شرکت مناسب ہے۔

اعلاظم امور میں شرکت کے نفع یا اس کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور کیونکر کیا جائے جب دنیا میں کوئی فرد بشر اس سے بے نیاز نظر نہیں آتا۔ گفتگو صرف یہ ہے کہ خانگی امور میں بھی شرکت نفع بخش اور آسائش رسا ہو سکتی ہے۔ یہاں شرکت سے مراد ایک کا دوسرے سے مدد حاصل کرنا نہیں ہے ورنہ یہ حالت تو کسی صورت میں مضر نہیں سمجھی جاسکتی اور نہ کوئی شخص اپنے کو دوسروں کی اعات سے کسی حالت میں مستغنی کہہ سکتا ہے ہم ماندر و بود کی شرکت سے بحث کرتے ہیں اس شرکت میں جہاں سیکڑوں فائدے ہیں وہاں ہزاروں مضر تیریں بھی ہیں اس کی بدولت بغض اور حسد کو ترقی ہوتی ہے۔ خانگی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں انفاق کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ ایک دوسرے پر تکیہ کرنے لگتا ہے اس لئے ہمت اور جفا کشی سلب ہو جاتی ہے۔ آدمی نکملا ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان سب باتوں پر نظر ڈال کر یہ بات مستحق خیال کی گئی ہے کہ خانگی اور جزوی معاملات میں شرکت سے گریز کیا جائے۔ قومی باتوں میں، اہم معاملات میں یا ایسے کام میں جسکو عوام سے تعلق ہو شرکت بیشک نفع بخش ہوتی ہے۔ بلکہ انسانی ترقی کا مدار اسی پر ہے۔ لیکن خانگی معاملات میں اس سے جتنا نفع حاصل ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ زہمتیں اٹھانا پڑتی ہیں۔ تمام عالم کے باشندوں



کے طرز تمدن پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ دانشمند تو ہیں اپنے خانگی معاملات میں شرکت سے بہت زیادہ اجتناب کرتی ہیں۔ اور اس قسم کی شرکت کو ام الجہالت جانتی ہیں۔ انگریزوں کو دیکھئے کہ وہ اپنے خاندان والوں سے کس طرح برتاؤ کرتے ہیں۔ اپنے یگانے بھائی بھتیجے سے شرکت رکھنا کیسا وہ حتی الوسع یہ چاہتے ہیں کہ باپ بیٹے بھی یکجانہ رہیں۔ بیٹے ذرا ہوشیار ہوئے کہ کسی بورڈنگ ہاؤس میں داخل کئے گئے وہاں سے نکلے تو فکر معاش میں پڑے۔ مگر باپ سے بالکل الگ ہو کر۔ معیشت کی صورت بندھی تو گھر لسانے کی سوچی لیکن وہ بھی کبھی کبھی باپ سے بھی استمراحت کئے بغیر۔ ان میں باپ بیٹے کی یکجائی کا زمانہ بہت مختصر ہوتا ہے۔ جب تک بیٹا خود معاش پیدا کرنے کے قابل ہوگا باپ اس کا بھوکوں مرنا گوارا نہ کرے گا۔ خرچ سے ضرور مدد کرے گا لیکن یہ نہ ہوگا کہ بیٹے باپ کے ساتھ سکونت اختیار کریں اور اس طرح باپ کی آزادی میں خلل ڈالیں۔ یہاں ان حالتوں کا تذکرہ نہیں ہے کہ باپ اپنے کسب معاش یا اجراء پیشہ میں دلسوز ملازمین یا معاونین کا محتاج ہو اور اس غرض سے وہ اپنے بیٹوں کی معیت مزاج لفقور کرے اس قسم کی یکجائی ممالک یورپ میں بھی دیکھی جاتی ہے مگر اس طور پر بیٹے اور باپ کی شرکت وہیں تک قائم رہے گی جہاں تک غرض مشترک کو تعلق ہے ان کے خانگی معاملات پھر بھی علیحدہ علیحدہ رہیں گے۔ انگریزوں میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کے پاس کسی منصبی کام کے انصرام میں اپنے کی غرض سے نہیں آکر ٹھہر گیا تو چلتے وقت خالسا ماں نے خرچ خوراک کا بل پیش کر دیا۔ ہم لوگوں کا طرز تمدن اس کو بہت ہی مکروہ بتاتا ہے۔ لیکن فی الواقع یہ ہماری بھول ہے اس میں کوئی اشکراہ نہیں یہ معاملہ کی صفائی ہے۔ جب تک ہم خود اپنے قوت بازو سے کماتے ہیں دوسرے کا احسان کیوں لیں۔ یا جب کوئی ہماری بخششوں کا محتاج نہیں ہے تو ہم اس کے ساتھ کیوں سلوک کریں۔ تحائف اور ہدایا کا بھیجنا خواندہ نہماں ہونا یہ دوسری باتیں ہیں جن سے محبت کو ترقی ہوتی ہے۔ لیکن جب ہم کسی دنیاوی کام کی غرض سے کہیں آئیں تو کیا ضروری ہے کہ کسی عزیز کے گھر ہی ٹھہریں۔ کوئی دوسری جگہ ٹھہرنے کے لائق عیدہ نظر نہ آئے اور اس لئے اپنے کسی رشتہ دار کے پاس جا آئیں تو یہ کیا کہ خواہ مخواہ اس پر اپنے خرچ کا بار بھی ڈالیں۔

ہندوستان میں شرکت کا معاملہ بالکل نرالہ ہے۔ اب تو کچھ ترمیم ہو چلی ہے ورنہ وہ پہلے تو تین تین اور چار چار لہشتیں گزر جاتی تھیں مگر خاندان کی حالت مشترک رہتی تھی۔ کبھی کبھی ممبروں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ جاتی تھی لیکن کاروبار مشترک رہتا تھا۔ خاندان میں ایک ہی شخص امام یا پیشوا ہوتا تھا باقی سب مقتدی ہوتے تھے یا نیم غلام ہوتے تھے۔ اس قسم کا طرز تمدن بیشک مصلحتوں پر نظر ڈال کر



اختیار کیا گیا تھا۔ مصالح سے ہم کو اس وقت گفتگو نہیں ہے۔ کہنا یہ ہے کہ نفع سے ضرر بڑھا ہوا ہے۔ ہندوستان میں آزادی بہت کم ہے۔ ہمیں پست طبیعتیں بھی ہوئیں۔ خیالات محدود۔ دل غلاموں سے بھی زیادہ کمزور۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آب و ہوا کا یہ اثر ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا بھی ہو لیکن ان برائیوں کے پیدا کرنے میں یہ طرز تمدن ضرور شریک غالب ہے۔

عربوں کے اصول بھی انگریزوں سے ملتے جلتے ہیں وہ اپنے خانگی کاروبار میں کسی کی شرکت پسند نہیں کرتے۔ مال عرب پیش عرب۔ اپنا مال اپنے قبضہ اور اختیار میں ایک کو دوسرے سے لگاؤ نہیں حتیٰ کہ زن و شو کے درمیان بھی مال و دولت اور اثاثہ کی تفریق ہوتی ہے۔ اس برتاؤ کے اثر سے سوچی خوشی بھی آزادی اور بے فکری (جس کو لطف زندگی کہتے ہیں) عربوں کو اس گئی گزری حالت میں بھی حاصل ہے وہ بیان کرنے کی چیز نہیں ہے بلکہ آنکھوں سے جا کر دیکھنے کی چیز ہے۔

برٹش عدالتیں ہمیشہ ملکی رسم و رواج کی پابند ہوتی ہیں۔ ہندوؤں میں شرکت خاندانی اس درجہ عام ہے کہ عجزان خاندان ہنود کی نسبت قانونی قیاس شرکت کا قائم ہوتا ہے اور خاندان کا منقسم ثابت کرنا اس فریق کے ذمہ ہوتا ہے جو ایسا بیان کرے یہ اصول ہمارے نزدیک بہت زیادہ ترقی کا مانگ ہے۔ تجارت کرنے کو کرمی کرنے یا کسی اور اعلیٰ ذریعہ سے غیر ملکوں کا سفر کر کے دولت پیدا کرنے میں ہر سمجھدار کو یہ خطرہ ہو سکتا ہے کہ اس کی محنت میں حصہ لینے کی غرض سے وہ لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے جو چھپے بھائی یا اس سے بھی دور کے رشتہ دار ہیں۔

ہند کے مسلمانوں نے بھی اپنے پڑوسیوں کا طرز تمدن اختیار کیا اور ان میں بھی اس قسم کے شوق اور خیالات بہت زیادہ پھیل گئے۔ اگر ایک شخص ذرا فارغ البال ہے تو تمام کنبہ اس پر بار ہے۔ وہ تو ترقی کرنا چاہتا ہے مگر کنبہ پروری کا بوجھ اسے ابھرنے نہیں دیتا۔ لوگ اس قسم کے سلوک کو نہایت مستحسن سمجھتے ہیں اور مفلس اعزہ اپنے اس استحصال بیجا کو عیب نہیں سمجھتے۔ لیکن ہمارے نزدیک منعم اور منعم لہ دونوں برسر خطا ہیں۔ اگر ہم کو خدا مالدار کرے تو دوسروں پر احسان کرنا اقتضائے شکران نعمت ہے۔ لیکن گفتگو یہ ہے کہ احسان کا پیرایہ اور شکران نعمت کا طریقہ کیا ہے۔ کوئی غریب بھائی ہمارا دست نگر ہو تو ہم کو چاہیے کہ اس کے لئے کاشتکاری کا بندوبست کرادیں۔ میل مول لے دیں۔ کھیت ٹھہرا دیں گھر۔ اثاثہ اور کچھ دنوں کے کھانے کا سامان مہیا کرادیں اور پھر اس سے کہیں کہ تم الگ اپنے بال بچوں میں آزادی کے ساتھ بسر کرو۔ اگر وہ اس ڈھب کا نہیں ہے تجارت کا خواہش مند ہے یا کسی حرفت و صنعت کی طرف اس کی طبیعت راغب ہے یا نوکری کرنا چاہتا ہے تو ویسا سامان کر دیں۔ اگر سچ



پوچھتے تو سچے سلوک کی یہ سب صورتیں ہیں۔ باقی رہی مروجہ صورت وہ ہمارے نزدیک نہ سچی سخاوت ہے نہ پوری ہمدردی بلکہ ایک قسم کی بریا کاری اور خاصی فرعونیت ہے۔ کوئی غریب بھائی مدد کے لئے آیا۔ اس کا کھانا مقرر کر دیا۔ دونوں وقت وہ گلسِ خواں اغنیا بوند کا مصداق ہے۔ لوگوں میں مشہور ہے کہ فلاں رئیس کے دسترخوان پر بیسیوں آدمی روٹی کھاتے ہیں۔ تمام کنبہ کا بار اس کے سر پر ہے نام تو بہت بڑا پایا لیکن فی الواقع جو کچھ کیا اپنی خود غرضی سے۔ یہ جتنے گھر میں بھرے ہوئے ہیں غلام سے بھی بدتر حالت میں ہیں اور نوکروں سے بھی زیادہ کام کرتے ہیں۔

ہم مختلف پیرایہ سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ شرکت بسا اوقات بجائے نفع کے مصرت پہنچاتی ہے لیکن یہ بحث چندان محتاج ثبوت نہیں ہے۔ کم و بیش سب ہماری تحریر سے اتفاق کریں گے۔ اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اس شرکت کے مسئلہ نے انگریزی عدالتوں یا انگریزی انصاف پر کیا اثر ڈالا۔

ایک تو ہندو خاندان مشترکہ کی صورت ہے۔ کبھی تو پیشوائے خاندان دوسرے کمزور ممبروں کی حق تلفی چاہتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بے تعلق اشخاص اپنے متمول رشتہ داروں کی مکسوبہ جائیدادوں میں حصہ لینے کی غرض سے اسے خواہ مخواہ اپنا پیشوا ٹھہراتے ہیں۔ دیوان اور فوجداری کے مقدمات کی سلیں الٹی جائیں تو نہ معلوم کتنے مقدمے ایسے نکلیں گے جنکی بنیاد نہیں سے شروع ہوئی ہے۔

دوسری صورت اشتراک کی یہ ہے کہ اکثر دیہات کی پٹے داریاں مشترک ہیں نمبر دار یا زبردست حصہ دار چاہتا ہے کہ آسامی اسی کے اختیار میں رہے دوسرے حصہ داروں کا وہ خواہ مخواہ منہجربا رہے۔ جتنے ہیں سب اس کے دستِ گم رہیں اور دوسرے کمزور حصہ دار ہیں کہ اپنا رنگ علیحدہ جمانا چاہتے ہیں یہی آگے چل کر نفاق کا سبب بن جاتا ہے۔ اگر غور سے دیکھنے اور کل نزاعات کے ابتدائی اسباب پر نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جتنے مقدمات دیوانی، فوجداری اور کلکٹری عدالتوں میں دائر ہوتے ہیں ان میں سے نصف اسی پٹے داری مشترک کے سبب سے قائم ہوتے ہیں۔ ان دفتروں کے مٹانے کے لئے تقسیم کا ایک چارہ کار قانونی ہے مگر اس کی کارروائی میں اتنی تاخیر ہوتی ہے اور فریق متمول کو جائز و ناجائز کا رد وائی کے مواقع اتنے ملتے ہیں کہ کمزور شرکا تقسیم کے نام سے گھبراتے ہیں۔ کیونکہ تقسیم سے قبل جھوٹی، سچی حصہ داری کی صفت قائم بھی رہتی ہے۔ مالگزار کی گھر سے دینا نہیں پڑتی ہے تقسیم میں کہیں بجز اور ناقابلِ زراعت زمین حصہ میں آئی تو سرکاری مالگزار کی بھی گھر سے دینا پڑے گی۔ گو اس قسم کے معاملات بہت کم ہوتے ہیں۔ کمزور حصہ داروں کے لئے تقسیم سے اچھا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ مگر نا سمجھ لوگ اس عمدہ چارہ کار کے اختیار کرنے سے بہت زیادہ گریز کرتے ہیں اور ایک سیدھی راہ کے بھولنے سے ایسے ایسے



نقصان اٹھاتے ہیں کہ ناگفتہ بہ۔

یہاں تک تو شرکت کاروبار کی مذمت ہی مذمت بیان کی گئی۔ اب کچھ اس کی سببیاں بھی لکھنا چاہیے۔ شرکت کاروبار صرف خانگی معاملات میں یا جزئیات میں نامناسب ہے۔ ورنہ بڑے معاملات میں شرکت ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر کامیابیوں اور ترقی کا مدار ہے۔ یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ جتنا ہی ہم کو چھوٹے معاملات میں شرکت کا شوق ہے اتنا ہی بڑے معاملات میں شرکت سے نفرت ہے۔ ہم جانتے ہی نہیں کہ بڑے بڑے معاملہ میں شرکت سے دنیا کی دوسری قومیں کیا کیا منافع اٹھاتی ہیں۔

ہندوستان میں مشترک کاروبار کی ایک بہترین یادگار موجود ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہند کی حکومت اسی ذریعہ سے حاصل کر لی۔ لیکن ہم سے کبھی یہ نہ ہو گا کہ کوئی کوٹھی اشتراکی قائم کر کے کچھ اپنا جوہر دکھائیں انگریزوں کے منہ چڑھانے کو ہندوستان میں بھی سیکڑوں لیٹڈ کمپنیاں قائم ہو گئیں۔ لیکن کامیابیاں زیادہ تر انہیں کمپنیوں کو ہوئیں جو انگریزوں کے ہاتھوں میں تھیں یا جن میں شریک غالب پوروہین تھے۔

اب ہم دکھاتے ہیں کہ شرع محمدی نے ان دو قسموں کی شرکتوں کی نسبت کیا بتایا ہے اس میں شبہ نہیں کہ خانگی معاملات کی شرکت اسلام نے بہت زیادہ ناپسند کی ہے۔ اس کے ثبوت میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ سند میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ آنحضرت کی متعدد ازواج مطہرات تھیں۔ جن میں سے ہر ایک کے مکانات جدا تھے اور گھانے پینے کا سامان بھی علیحدہ تھا۔ باری باری سے آنحضرت ازواج مطہرات کے گھروں میں شب باش ہوتے تھے۔ اور خود آنحضرت کا قیام بھی اپنے ازواج کے گھروں میں گویا بطور مہمان کے ہوتا تھا۔ یعنی آنحضرت کی چیزوں اور ازواج مطہرات کی چیزوں میں امتیاز کیا جاتا تھا۔ اور ہر ایک کو اپنے اسباب میں آزادانہ حقوق حاصل تھے۔ اسکے بعد حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ کے ساتھ جو برتاؤ آنحضرت کا تھا وہ بھی قابل لحاظ ہے۔ حضرت علیؑ آنحضرت کے چچا زاد بھائی تھے اور آنحضرت نے مثل فرزند کے انکی پرورش کی تھی۔ حضرت علیؑ کے ماں باپ مرچکے تھے سوائے آنحضرت کے دوسرا ان کا مربی نہ تھا آنحضرت نے جب اپنی چہیتی بیٹی حضرت فاطمہؑ کو ان کے ساتھ بیاہا تو پہلے حضرت علیؑ سے ان کا اثاثہ بچو اگر خانہ داری کا سامان مہیا کروا لیا تب کہیں حضرت فاطمہؑ کو ان کے حوالے کیا۔ آنحضرت کو بیٹی اور داماد کی روٹی دو بھرنہ تھی۔ بلکہ محض اپنے طرز عمل سے یہ تعلیم کرنا مقصود تھا کہ شادی کرنے کے بعد زن و شوہر اپنے کنبے سے علیحدہ ہو کر رہیں گے جب ہی وہ آزادی کا مزہ اٹھائیں گے اور دین و دنیا کے فائدے حاصل کر سکیں گے مزید توضیح



کے لئے ۱۰ اخوة اسلامیہ فصل ۱۹ کتاب ہذا پڑھنا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بڑے بڑے امور میں مسلمانوں کے اشتراک پسند کرنے سے ظاہر ہے کہ پیغمبر اور بعد پیغمبر کے خلفائے اربعہ کل بلاد اسلام کے تہا شہنشاہ تھے معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی چند روزہ لڑائیاں نظر انداز کی جائیں۔ تو بنو امیہ بھی تنو برس کے قریب تمام بلاد اسلام پر قابض تھے۔ فرانس سے لے کر ہندوستان اور تاتاریک جہاں اب اس تہذیب کے زمانہ میں بھی بیسیوں شہنشاہ جدا جدا حکومت کرتے ہیں۔ تہا بنو امیہ حکمران رہے۔ بنو عباس بھی شروع شروع تمام بلاد اسلام پر تہا قابض تھے کچھ دنوں کے بعد اندلس نکل جانے پر بھی تمام افریقہ اور ایشیا کے بلاد اسلام پر اپنے عروج کے زمانہ میں تہا بنو عباس کی حکومت تھی ان حکومتوں کو یوں سمجھیے کہ بادشاہ کوئی چیز نہیں ہوتا۔ اراکین دولت حکومت کی جان ہوتے ہیں۔ مشرق سے مغرب تک جتنے اراکین دولت تھے وہ نسل عرب سے تھے۔ باپ دادا سے وہ سبق سنتے آئے تھے جس میں رسول اللہ نے اہم کاموں کو بالاتفاق انجام دینے کی بابت تاکید کی تھی یہ اسی سبق کا اثر تھا کہ جب تک مسلمانان عرب یا حکومت تھے کبھی ان کو یہ خیال بھی نہیں آیا کہ وہ علیحدہ علیحدہ حکومتیں کریں لیکن وہی ملک جب دوسری قوم کے حاکموں اور گورنروں کے ہاتھ آیا تو وہ شرکت کی برکات نہ سمجھ سکے اور جا بجا خود مختارانہ روش اختیار کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ یہ بھی واضح رہے کہ جب تک سلطنت عربوں کے ہاتھ میں تھی بادشاہ سلطنت کو کاروبار شرکت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں سمجھتا تھا اور نہ خود کو کوٹھی شراکتی کے منبر سے بڑھ کر جانتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ تمام یورپین مورخ بالاتفاق کہتے ہیں کہ دنیا کی شہنشاہی عربوں سے اچھی کسی کے نہیں کی۔ سلاطین اسلام نے زمانہ مابعد میں جو حالت اختیار کی وہ اس طرز سے بالکل جداگانہ تھی جس پر سلاطین عرب قائم تھے اور یہی وجہ روز بروز ان کے انحطاط کی ہوئی۔ غرض کہ جس طرح اس وقت دنیا کی زندہ قومیں خانگی معاملات میں شرکت ناپسند کرتی ہیں اور بڑے بڑے کاموں میں شرکت کی دلدادہ ہیں یہی کیفیت تمام مسلمانوں کی زمانہ عروج میں تھی۔ رہے نام اللہ کا۔ کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔



## فصل نمبر ۳۳

### توریت

نکاح اور وراثت یہ دو باتیں انتظام عالم قائم رکھنے کے لئے نہیں تو تمدنی حالت کو اعلیٰ درجہ پر رکھنے کے لئے بہت ہی اہم ہیں۔ مسلمانوں کو اس پر ناز تھا کہ ان دو مباحث پر ان کے قانون اتنے عمدہ اور مستحکم اصول پر ہیں کہ اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ ناز تھا کہ یہ مطلب ہے کہ اب اس پر ناز نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس خود ہند کے مسلمانوں کا تو یہ خیال ہے کہ خدا نے اگر قرآن میں کچھ غلطی کی ہے تو وہ انہیں مشلوں کے متعلق کی ہے۔ ہمارے نزدیک جن لوگوں کے خیالات ایسے ہوں وہ ہرگز ہرگز بھی مسلمان نہیں ہیں۔ ہم مسلمان ہو کر شراب پیئیں۔ بد افعال کے مرتکب ہوں۔ سود کھائیں اور دل میں ہم سمجھیں کہ برا کرتے ہیں تو ہم صرف مسلمان ہیں دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتے لیکن اس کے ساتھ اگر ہم یہ خیال کریں کہ شراب ایسی پاک اور عمدہ چیز قرآن میں من عمل الشیطان کہی گئی ہے تو یہ سراسر نامناسب ہے زنا کرنے والوں کے لئے جو سخت سزا قرآن میں لکھی گئی ہے ہرگز مناسب حال نہیں ہے۔ سود کھانے کو اکل نادر لکھلے یہ بالکل ہی مصلحت عامہ کے خلاف ہے۔ تو ہمارا یہ سوچنا یہ معنی پیدا کرے گا کہ قرآن کے احکام موجودہ زمانہ کے موافق نہیں رہے اب ایک دوسرا نبی اور دوسری کتاب نازل ہونا چاہیے جو موجودہ ضرورتوں کو سمجھے اور موجودہ حالت کے موافق ہو۔ جب ہمارا یہ اعتقاد اپنے مذہب اور مذہبی کتاب کی نسبت ہوا تو ہم مسلمان کہاں رہے۔ اقرار باللسان صرف ایک منافقانہ فعل رہ گیا۔ لقد بق بالقلب کہاں رہی اور ہم بے اس کے مسلمان کہاں رہے۔ قرآن کو دل سے ناپسند کریں اور اس کے حکم کو خلاف مصلحت جانیں اور پھر مسلمان کے مسلمان بنے رہیں۔ اچھا اسلام ہے۔

ابتداءً اسلام میں ایک یہودی اور ایک مسلمان میں کچھ جھگڑا ہوا۔ یہودی آنحضرت



محمد کو رسول اللہ نہیں مانتا تھا لیکن ان کو ایک اچھا منصف تسلیم کرتا تھا۔ مسلمان نام کا مسلمان تھا لیکن دل سے منافق تھا۔ اس خاص جھگڑے میں وہی برسر خطا تھا اس لئے اسے کسی منصف مزاج کی بھی ضرورت نہ تھی۔ یہودی نے آنحضرتؐ کو فیصلہ کے لئے ثالث مقرر کیا۔ مسلمان اس خیال سے راضی ہو گیا کہ شاید مذہبی خیال سے آپ میرے موافق فیصلہ کریں گے۔ جب آنحضرتؐ نے اس منافق کے خلاف فیصلہ کیا تو وہ راضی نہ ہوا اور عمر بن الخطابؓ کے پاس یہودی کو لے آیا اور چاہا کہ یہاں سے دوسرا فیصلہ اپنے موافق صادر کرے۔ عمر بن الخطابؓ کو جب معلوم ہوا کہ یہ مسلمان برسر خطا ہے اور پیغمبر خدا کے فیصلہ کو غلط سمجھ کر مجھ سے اس کے خلاف امید رکھتا ہے تو وہ مکان کے اندر چلے گئے اور تھوڑی دیر میں ننگی تلوار لے کر نکلے اور اس منافق کو قتل کر دیا اور کہا کہ "اب حق اور باطل میں فرق ہو گیا۔ زبانی فیصلہ سے یہ مردود کبھی راضی نہ ہوتا" اسی واقعہ سے حضرت عمرؓ کو الفاروق خطاب دیا گیا۔ مسلمان ہو کر جو توریث کے متعلق جھوٹی تدبیریں سوچتے ہیں اور احکام خدا اور رسولؐ کی قدر نہیں کرتے وہ خود سمجھیں کہ زمانہ رسولؐ میں وہ کیا سمجھے جاتے۔

نکاح کے متعلق جو خوبیاں مذہب اسلام میں رکھی گئی ہیں ان کا بیان فصل نمبر ۳۸ "نکاح" میں ہو گا۔ یہاں صرف مسائل توریث اور انکی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں۔

### آیات قرآنی

"ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکہ میں مرد دل کا حصہ ہے اور اسی طرح عورتوں کا بھی تھوڑا بہت مال باپ اور رشتہ داروں کے ترکہ میں حصہ ہے اور ٹھہرایا ہوا ہے۔ تقسیم ترکہ کے وقت رشتہ دار یتیم اور مساکین آ موجود ہوں تو ان کو بھی اس میں سے کچھ دیدیا کرو اور نرمی سے گفتگو کرو۔"

(سورہ نساء رکوع ۱)

"تمہاری اولاد کے حق میں اللہ بتاتا ہے کہ مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ دیا جائے اور اگر عورتیں ہی ہوں تو دو سے زیادہ کو ترکہ کی دو تہائی اور اگر ایک ہو تو اس کو آدھا۔ میت کے ماں باپ میں سے ہر ایک کو (اگر اس میت کے اولاد نہ ہو) ترکہ کے چھٹواں حصہ اور اولاد نہ ہو اور ماں باپ دونوں وارث ہوں تو ماں کو ایک ثلث اور میت کے سبھائی بہنیں ہوں تو ماں کو ایک سدس ترکہ کی

لے للرجال نصيب مما ترك الوالدان والاقرابون وللنساء نصيب مما ترك الوالدان والاقرابون مما قل منه ا مفروضاً اذا حضر القسمة اولوا القربى واليتيمى والمسكين فآرز قوہم منہ وقولوا ہم قولا معروفاً۔



کی تقسیم اداے وصیت (اگر میت نے وصیت کی ہو) یا قرض کے بعد ہے۔ تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ اور بیٹوں میں سے کون تم کو زیادہ نفع پہنچائے گا۔ اللہ کی طرف سے جسے مقرر ہے کہ وہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ اگر تمہاری بیویاں اولاد نہ چھوڑیں تو تم کو نصف ترکہ ملے گا اور اولاد ہو تو چوتھائی ترکہ کی یہ تقسیم اداے وصیت (اگر میت نے وصیت کی ہو) یا قرض کے بعد ہے۔ اور تمہارے ترکے میں تمہاری بیویوں کا حصہ اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو ایک چوتھائی ہے اور اولاد ہو تو آٹھواں حصہ ترکہ کی یہ تقسیم اداے قرض یا تعمیل وصیت کے بعد ہے۔ اگر میت نے کچھ وصیت کی ہو۔ کوئی مرد یا عورت بے اصل و فروع ہو اور اخیانی بھائی یا بہن چھوڑے تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ہے اور اس سے زیادہ ہوں تو وہ ایک ثلث میں شریک ہیں ترکے کی یہ تقسیم بعد اداے قرض یا تعمیل وصیت کے ہے اگر میت نے وصیت کی ہو اور ضرر ان میں نہ ہو۔ یہ اللہ کی وصیت ہے۔ اللہ دانا اور بردبار ہے۔ اللہ کی یہ حدیں ہیں۔ جو کوئی اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرے گا اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا۔ جسکے نیچے نہریں جاری ہیں اور جہاں ہمیشہ رہنا ہو گا اور یہ بڑی کامیابی ہے۔ جو کوئی اللہ اور اللہ کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کی حدوں سے بڑھ جائے گا اسے اللہ دوزخ میں ڈالے گا اور اس پر ذلت کا عذاب ہو گا۔

(سورہ نساء رکوع ۲)

مان باپ اور رشتہ دار جو کچھ چھوڑیں اس کے حق وارہم نے ٹھہرا دیئے ہیں اور جن لوگوں کے ساتھ تمہارے عہد و پیمان ہیں کچھ حصہ ان کو بھی دے دو۔ ہر چیز اللہ کے پیش نظر

لے یو حکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل خط الانثین فان کن نساء فوق الانثین فلین ثلثا ماترک وان کانت واحدة فلما النصف ولا بویہ لکل واحد منہما السدس مما ترک ان کان له ولد فان لم یکن له ولد وورثہ ابواہ فلامہ الثلث فان کان له اخوة فلامہ السدس من بعد وصیتہ یوصی بہا اودین اباؤکم وانباءکم لاتدرون ایہم اقرب لکم نفعاً فریفة من اللہ ان اللہ کان علیما حکیماً وکم نصف ماترک ازواجکم ان لم یکن لہن ولد فان کان لہن ولد فلکم الربع مما ترکن من بعد وصیتہ یوصی بہا اودین و لہن مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد فان کان لکم ولد فلین الثمن مما ترکتم من بعد وصیتہ تو صون بہا اودین وان کان رجل یورث کلثا او امراة و لا اخ او اخت فلکل واحد منہما السدس فان کانوا اکثر من ذالک فہم شراک فی الثلث من بعد وصیتہ یوصی بہا اودین غیر مضار وصیتہ من اللہ واللہ علیم علیم۔ تلک حدود اللہ ومن یطع اللہ ورسولہ یدخل جنت تجری من تحتہا الانہار خلدین فیہا انک الفوز العظیم ومن یعص اللہ ورسولہ و یعد حدودہ یدخل ناراً خالداً فیہا ولہ عذاب مہین۔



ہے سورہ نساء رکوع ۵۔

پیغمبر! لوگ تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں تو کہہ دو اللہ کلام کے بارے میں تم کو حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی مرد اولاد مر جائے اور اس کی بہن موجود ہو تو بہن کو اس کے ترکے کا آدھا اور بہن لا ولد مر جائے تو اس کے کل مال کا وارث بھائی ہوگا۔ اگر بہنیں دو ہوں تو دونوں کو ترکے کا دو تہلٹ ملے گا۔ اور اگر بھائی بہن ہوں کچھ مرد اور کچھ عورتیں تو دو عورتوں کے برابر ایک مرد کا حصہ ہوگا تمہارے بہکنے کے خیال سے اللہ تم سے کہوں کھول کر بیان فرماتا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ سورہ نساء رکوع ۲۴۔

ان آیات قرآنی سے فقہ نے مختلف صورتیں پیدا کر کے مسائل وراثت کو اتنے عمدہ طور پر ظاہر کیا ہے کہ کسی طرح اس سے اچھی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ مختصر یہ ہے کہ جن کے حصے قرآن میں معین ہیں۔ وہ ذوی الفروض کہلاتے ہیں ان کے حصے دینے کے بعد عصبات کو جو عموماً ایک جدی ہوتے ہیں حصہ ملت ہے بعد از ان ذوی الارحام پاتے ہیں جس میں دوری اور مادری رشتہ دار شامل ہوتے ہیں۔

سورہ نساء میں چند مقامات پر آپ زیادہ غور کیجئے۔ شروع میں خدا نے مردوں کا حصہ عورتوں سے دو چند قرار دیا ہے اب اس پر بھی مرد شکر نہ کریں تو سخت نافرمانی ہے اولاد کے ہوتے ہوئے والدین کو حصہ دینا بعض جہلائے عرب کو پسند نہ تھا اس لئے ان نا فہموں کے لئے وسط رکوع میں خدا کہتا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ یا اولاد میں سے تم کو کون زیادہ نفع پہنچائے گا۔ اس کا منشاء یہ ہے کہ خدا تم سے زیادہ سمجھتا ہے۔ تم لوگ یہ خیال نہ کرو کہ میرا ترکہ یوں تقسیم ہوتا تو اچھا تھا۔ اور یہیں سے صریح تردید اس خیال کی بھی ہوتی ہے کہ بیٹوں کے ہونے سے یا بیٹیوں میں جائیداد کے رہنے سے بقائے نام

لے وکل جعلنا موالی مما ترک الوالدان ولاقربون والذین عقدت ایمانکم فاتوہم نصیبہم ان اللہ کا علی کل شیء شہیداً۔ مسلمان جب مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے گئے تھے رشتہ داروں سے قطع تعلق ہو گیا تھا اس وقت آپس میں لوگوں نے بھائی چارہ کر لیا تھا۔ پھر جب اسلام پھیلا ہر ایک کے شرعی وارث موجود ہوئے اور آیت تو ریت بھی نازل ہو چکی تھی تب یہ حکم ہوا کہ جن سے عہد و پیمانہ ہے یا جن سے حسن سلوک ہے ان کو بھی کچھ جیتے جی دیدو یا مرنے کے بعد انکے حق میں وصیت کرو۔ وصیت کی تفصیل میں شرح بیان کیا جائے گا کہ وصیت کے مصالح کیا ہیں اور کسی حالت میں وصیت ایک تہلٹ سے زیادہ روا نہیں ہے۔

لے لیستفتونک قل اللہ لیتکم فی الکلمۃ ان امرؤ اہلک لیس لہ ولد لہ اخت فلہا نصف ما ترک و مہر بڑھا ان لم یکن لہا ولد فان کانتا اثنتین فلہما الثلثین جاترک وان کانتا احوۃ رجالاً و نساءً فللذکر مثل حظ الانثیین بین اللہ لکم ان تفضلوا اللہ بکل شیء علیم۔



رہے گا اور مورث کو کچھ نفع پہنچے گا۔ اس کے بعد ہی خدا کہتا ہے: اللہ کی طرف سے حصے مقرر ہیں کہ وہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ یعنی یہ حصے جو مقرر ہیں خدا کے مقرر کئے ہوئے ہیں کوئی اس سے عدول نہ کرے۔ کسی کے دل میں یہ خیال نہ گزرے کہ یہ حصے مصلحت وقت کے خلاف ہیں کوئی ایسا بے ادب خیال دل میں لائے گا تو خدا کو معلوم ہو جائے گا۔ وہ دلوں کی بات جانتا ہے۔ کیا تم کو خدا کے حکیم ہونے میں شبہ ہے اور تم سمجھتے ہو کہ تم خدا سے اچھا قانون بنا سکتے ہو۔ ہرگز نہیں۔ خدا نے اخیر میں کہدیا کہ دین یا وصیت تقسیم کر کے سے پہلے جب ہی قابل لحاظ ہے کہ اس میں ضرر نہ ہو یعنی جب محض ورثا کی محرومی کے لئے وصیت یا دین عاید نہ کیا گیا ہو۔ سیدھے سیدھے طور پر سمجھا کر اور پھر حکم خدا پر چلنے والوں کے لئے جنت کی بشارت دے کر انسان ایسی سرکش مخلوق کے لئے اخیر کو ع میں پھر خدا صاف صاف کہتا ہے کہ۔ جو کوئی اللہ اور اللہ کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کی حدوں سے بڑھ جائے گا اسے اللہ دوزخ میں ڈالے گا۔ اور اس پر ذلت کا عذاب ہوگا۔ اب وہ حضرات جو خدا کے حکم اور خدا کے وعدوں کو محض امر موہوم سمجھتے ہیں۔ حقوق غضب کرنے میں نڈر ہیں مرنے کے بعد خوب سمجھ جائیں گے کہ خدا کے وعدے کیسے سچے ہیں۔ لیکن افسوس کہ اس وقت کی سمجھ کچھ کام نہ آئے گی۔

مذہب اسلام نے توریث کا قانون بنانے میں مفصلہ ذیل امور پر لحاظ رکھا ہے۔

۱:- ایک کو دوسرے کی کمانی یا دوسرے کے مال میں حق نہیں ہے۔ ہر ایک کو اپنی محنت مزدوری پر بھر دسہ کرنا چاہیے۔ متوفی کے اعزہ کو محض اس لئے ترکہ دیا جاتا ہے کہ متوفی کے بعد اس کے مال کے تصرف کے لئے کوئی انتظام نہ ہوگا تو جھگڑے پیدا ہوں گے۔

۲:- مرنے والے کی دولت اس کے تمام اعزہ میں جہاں تک ہو سکے متفرق ہو کر تقسیم ہونا چاہیے کہ وہ تمام لوگ فائدہ اٹھا سکیں جو اس کی حیات میں متمتع ہوتے تھے یا متمتع ہونے کا حق رکھتے تھے۔

۳:- عورتوں کو خود کما کھانے کے ذریعے بہت کم ہیں اس لئے ان کے حقوق تخصیص کے ساتھ قرآن میں محکوم ہوئے۔

۴:- اس لحاظ سے کہ مردوں پر دوسروں کے نان و نفقہ کا بار ہوتا ہے مردوں کا حصہ عورتوں سے دو چدر رکھا گیا ہے۔

۵:- شرع میں یہ بہت ناپسندیدہ سمجھا گیا ہے کہ ایک شخص ضرورت سے بہت زیادہ متمول ہو جائے اور دوسرا بہت زیادہ مفلس ہو کر گزاران کرے شرع کے احکام ہر امر میں مساوات چاہتے ہیں اس لئے متوفی کے ترکہ میں بھی بہت سے حصے کر دیئے جاتے ہیں۔



قرآن میں حکم ہے کہ جب کوئی مرے اور نر کہ تقسیم ہونے لگے تو افتضائے شکر گزاری یہ ہے کہ ورثا مورث اپنا حصہ لیں تو بس اس کے ان تمام اقربا اعزہ اور پڑوسیوں کو کچھ کچھ دیں جو وقت تقسیم کے موجود ہوں یہ حکم نہایت تعیم کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس لئے فرض نہیں ہوا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل اسلام کے نزدیک مورث کے ترکہ میں حصہ لینے کی نوعیت کیا ہے۔ بعض مکینہ خصلت جو مورث کی دولت پر اپنے مکسوبہ مال سے زیادہ اپنا حق قائم کر کے اس کے مرنے کے متمنی بیٹھے رہتے ہیں ان کو اسلام نہایت ہی ناپاک سمجھتا ہے۔

### ہندوؤں کا قانون

ہندوؤں میں خاندان مشترکہ ہو تو لڑکیاں یا بوائے عموماً ترکہ نہیں پاتیں۔ بیٹے کی موجودگی میں باپ بالکل محروم رہتے ہیں۔ خاندان مشترکہ میں عورتوں کا حق کچھ بھی نہیں ہوتا اور جب ہوتا ہے تو ایسا کہ خاندان کے منقسم ہونے کی حالت میں کل کی بیاہی ہوئی بیوی کل پر قبضہ کر لیتی ہے اور ماں باپ متہ تکتے رہ جاتے ہیں ان کے یہاں بہنیں کسی حالت میں وارث نہیں ہوتیں۔ کھینچ کھا پنچ کر بھانجوں کو تو برٹش عدالتوں نے ورثا میں شامل کر دیا ہے لیکن بہنیں ہنوز محروم ہیں۔ جائیداد ضبط سرکار ہو جائے گی مگر بہن کو نہ ملے گی۔ عجیب قانون ہے۔ معلوم نہیں ہوتا کہ ہندو منقسموں کو عورتوں سے کیوں اتنی خلش تھی اس موقع پر مجھے ایک گفتگو یاد آئی۔ میں (دو وقت) ایک روز اپنے ایک ہندو دوست سے گفتگو کر رہا تھا وہ اپنے یہاں کے مسئلہ توریت کی خوبیاں بیان کر رہے تھے اور میں ان کے نقائص بیان کر رہا تھا کہ اسی اثناء میں ان کے پیچھے ایک ہندو فقیر (گداگر) آکر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنے دوست سے کہا کہ خواہ مخواہ اگر آپ مرجائیں تو آپ کی تمام املاک یہ بابا جی جو پیچھے کھڑے ہیں پاسکتے ہیں لیکن آپ کی بہن نہیں پائے گی۔ اس پر میرے دوست نے پوچھا کہ یہ کیونکر ممکن ہے۔ میں نے کہا یہ تو بہت صاف مسئلہ ہے ہر ایک اس سے واقف ہے کہ بہنیں کسی صورت سے وارث نہیں ہوتیں۔ بہن کے لئے مرد بن جانا دشوار ہے اور جب تک وہ عورت ہے محروم رہے گی۔ لیکن بابا جی ممکن ہے کہ دو جھوٹے گواہ عدالت میں گزار کر خود کو آپ کا گور بھائی ثابت کر دیں اور جائیداد کے مالک بن جائیں جیسا کہ جو آپ تو ہمارے دوست سے نہ بن آیا۔ لیکن انھوں نے یہ کہا کہ تم کو یہ عجیب دھن ہے کہ خواہ مخواہ اپنی شرع کے مسائل کو تمام دنیا کے قوانین پر افضل سمجھتے ہو یہ عجیب تمہاری طرح اور بھی چند مسلمانوں میں پایا گیا ہے۔ آجکل چند ہندو بھی ایسے ہیں جو اپنے مسائل کو تمام عالم پر فوقیت دیتے ہیں۔ تم ایسے مہمان قوم کو مالی نو لیا ہو گیا ہے کہ گٹھے گز رہے زمانے کی باتیں اس زمانے



میں پیش کرتے ہو اور موجودہ تہذیب سے مقابلہ کرتے ہو۔ جو بات پہلے تھی وہ مزور مناسب وقت تھی لیکن اب زمانہ بدل گیا زمانے کے موافق جو باتیں ہیں اب وہی قابل تقلید ہیں۔ پرانی باتوں پر حاشیہ چڑھانا بالکل بے کار بے سود ہے۔ میں نے اس کے جواب میں جو کچھ کہا اس کا خلاصہ بیان کرنا مضمون سے کسی قدر الگ مزدور ہو جاتا ہے لیکن خالی از دلچسپی نہیں ہے۔

میں نے کہا: میں مسلمانوں کے موجودہ قواعد کو ہرگز عمدہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتا اگر میں ایسا کروں تو میری غلطی ہے۔ اور اسی طرح اپنے موجودہ زمانے کی باتوں کو ہنود مناسب ثابت کرنے کی کوشش کریں تو وہ بھی غلطی پر ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ اپنے عروج کے زمانے میں اسلام کے تمام مسائل پر از حکمت تھے تو بے موقع نہیں ہے اور اسی طرح ہنود اگر یہ دکھانا چاہیں کہ اپنی ترقی کے زمانہ میں ہنود میں تمام خوبیاں ہر قسم کی موجود تھیں تو بھی بے موقع نہیں ہے۔ بے شک ہندو کے زمانہ عروج کو گزرے ہوئے اتنا عرصہ ہوا کہ وہ اپنے عروج کی تمام باتیں جان نہیں سکتے اور نہ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا حالت ان کے تمدن کی زمانہ عروج میں تھی پھر بھی جہاں تک ان کے علماء دریافت کر سکے انہوں نے اچھی طرح ثابت کر دیا کہ زمانہ عروج کے عادات و مراسم زمانہ حال سے بالکل بھی مطابق نہیں ہیں اور جو برائیاں اس وقت ہیں وہ ان کی ترقی کے زمانہ میں ہرگز ہرگز نہ تھیں برخلاف اس کے مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ ابھی تین صدی قبل تک تمام عالم پر یہ روشن تھا کہ مسلمانوں کی رفتار، گفتار، عقائد، عبادات، معاملات اور تمدن دوسروں کے لئے قابل تقلید تھے اور دنیا میں کوئی تمدن مسلمانوں کے تمدن کے برابر نہ تھا۔ ابھی زمانے نے کوئی بہت بڑا پٹا نہیں کھایا ہے وہی لیل و نہار ہیں اور وہی رفتار زمانہ ہے۔ مسلمان اپنی خوبیاں چھوڑ بیٹھے اور تاریکی میں آگے ہو نہار قوموں نے ان کی خوبیاں اختیار کر لیں اور روشنی میں آگئیں۔ عربوں نے جو روشنی فرانس سے سر ہند تک اور سرحد یمن سے سرحد چین تک ایک دل ہو کر پھیلائی اور بعد ازاں کسی قدر تنزل کے ساتھ لیکن پھر بھی دوسری قوموں سے کہیں بڑھ چڑھ کر مسلمانوں کی مختلف طاقتوں نے اس روشنی کو خلیج بنگالہ تک پورب میں اور سرحد جرمنی اور آسٹریلیا تک مغرب میں وسعت دی اگر اس روشنی کے اسباب کا ہم ذکر کریں تو یہ تحقیقات علمی مایخو لیا کی مد میں داخل ہوگی ہرگز نہیں۔ ہم صرف یہ دکھانے ہیں کہ ہیرے کا ٹکڑا تین سو برس تک کسی خاکستر میں دبے رہنے سے اپنی اصلی آب و تاب نہیں کھو سکتا۔ ہمارا یہ کہنا بالکل بے تصبیح ہے۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ جس طرح دو نقطوں کے درمیان میں خط مستقیم ایک ہی ہو سکتا ہے اسی طرح دنیا میں ترقی کرنے کی راہ مستقیم جیسے راہ خدا کہتے ہیں اصولاً



ایک ہی ہے۔ جس راہ پر ہنود اپنی ترقی کے زمانے میں چلے اسی راہ پر یونانی اور رومی اپنے اچھے دلوں میں چلے۔ مسلمان بھی اپنے زمانہ عروج میں اسی راہ پر تھے اور عیسائی بھی اس زمانے کے اسی راہ پر ہیں بے شک اس وقت کے عیسائی اپنی رفتار میں موجودہ مسلمانوں سے زیادہ تر راہ مستقیم پر ہیں۔ لیکن اس امر کو ہم کیا کوئی ذی عقل بھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ کبھی راہ مستقیم پر مسلمان نہ تھے اور اسی طرح یہ بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہنود کبھی اس راہ مستقیم پر نہ تھے۔ ہم کوئی نئی بات نہیں کہتے ہیں بلکہ صرف یہ کہتے ہیں کہ ہاں مسلمان بھی اسی راہ مستقیم پر تھے۔ اس پر اگر ہم اتنا اور مستزاد کر دیں کہ راہ مستقیم جب مسلمانوں کے زیر مشق تھی تو زیادہ تر بار و تلق تھی تو چندان بے موقع نہ ہوگا۔ ہزار برس تک مسلمانوں کا قرآن تمام کرہ ارض اپنی روشنی پھیلائے ہوئے تھا جسکی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ احکام قرآن پر غیر قومیں بھی انکی خوبیوں کے لحاظ سے مفتون تھیں اور کبھی ان کو یہ خیال نہ ہوتا تھا کہ ان پر کسی قسم کا اعتراض ہو سکتا ہے اب اگر ان پر زلمنے کی گردش سے کچھ خاک پڑ گئی ہے اور ہم اس خاک کو جھاڑ کر عوام کے سامنے انکی خوشنما صورت پیش کرتے ہیں تو یہ کوئی انوکھا کام نہیں ہے اور نہ اس میں کسی قسم کی ہٹ دھرمی ہے۔

## یورپ کا قانون

یہ بات صرف اہل اسلام میں ہے کہ یورپ، ایشیا، افریقہ جہاں کہیں وہ ہیں ان کی تواریث قرآن کے موافق ہے۔ اگر وہ غیر قوم کی رعایا ہیں جب بھی تواریث میں عدالتیں ان کے درمیان انھیں کا قانون جائز رکھتی ہیں۔ اسے برکات اسلام میں شمار کرنا چاہیے۔ ورنہ یورپ ایسے مہذب ملک کے عیسائیوں کے لئے جتنے ممالک ہیں اتنے ہی قانون ہیں بلکہ ایک ہی ملک میں مختلف جائدادوں کے لئے مختلف قوانین جاری ہیں۔ مثلاً انگلستان میں زمینداروں کا قانون جدا ہے اور دیگر مال و اسباب اور زر نقد کے لئے جدا ہے وہاں زمینداری میں جائداد اور خطاب ہمیشہ بڑے لڑکے کو ملتا ہے اگر باپ نے دوسری اولاد کے لئے کچھ وصیت کر دی تو خیر ورنہ بڑے لڑکے کی مرضی پر ہے کہ اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ کچھ سلوک کرے یا نہ کرے۔ اسی کے قریب قریب تعلقہ داران اودھ کے لئے بھی گورنمنٹ نے قانون بنا دیا ہے ہندوؤں میں راج بھی بڑے لڑکے کو ملتا ہے لیکن شاید یہ فرق ہے کہ ہندوستان کے راجہ قانوناً مجبور ہیں کہ اپنے بھائی بہنوں کی خوراک اور پوشش کا سامان کر دیں۔ انگلستان کے پیرس اس پابندی سے بھی غالباً آزاد ہیں۔ انگلستان میں زمینداری کا قانون زمانہ جاہلیت کی یادگار ہے کیا معنی کہ جب روٹنس انگلستان سے چلے گئے تو برٹینس (قدیم باشندگان انگلستان) نے فائٹس اینٹکو سیکسن کی غلامی میں



آئے جنہوں نے انگلستان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے آپس میں بانٹ لئے اور ان ٹکڑوں کے باشندوں کو زمین کی ملکیت میں کچھ حق نہیں دیا۔ بعد ایں گلو سیکسن کے جب نارمن آئے تو انہوں نے بھی یہی طریقہ قائم رکھا اور بجائے اینگلو سیکسن سرداروں کے نارمن سردار مختلف ٹکڑوں کے قابض اور حاکم ہو گئے اسی اثناء میں جب سلطنت ہند کی گئی تو تمام سردار رکن سلطنت قرار پائے لیکن بادشاہ نے یہ جرأت نہ کی کہ ان سرداروں کے حقوق زمینداری میں کچھ مداخلت کرے اور نہ زمانہ جاہلیت کے اس قاعدے کو کہ ہمیشہ خلف اکبر تھا قابض رہے وہ مٹا سکے تہذیب پھیلنے پر تو شان حکومت میں فرق آگیا۔ لیکن توریث کا یہ قاعدہ بدستور قائم رہا کہ زمینداری تہذیب کا کوئی حصہ اگر کچھ ترسیم ہوئی تو اتنی کہ وصیت کا اختیار مورث کو دیا گیا اور تہذیب کے ساتھ اس وصیت کا دستور بھی بڑھتا رہا لیکن وصیت کا موقع نہ ملنے کی حالت میں جو حق تلفی اکثر اولاد کے حق میں ہو سکتی ہے اس کا کوئی تدارک اب تک نہ ہوا برخلاف اس کے مسلمانوں نے حکومت قائم کرتے ہی دل کڑا کر کے امیر و غریب سب کو اصول انصاف کی ایک رسی میں باندھ لیا اور سمجھے کہ انصاف ہی کرنے میں سلطنت کو قوت پہنچے گی اور شخصی تشخص سے بچائے مدد پہنچنے کے ضعف آئے گا۔ شاہ غسان کی حکایت مشہور ہے کہ وہ عیسائی بادشاہ تھا اور دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا تھا۔ حضرت عمرؓ کے سامنے وہ ایک بازاری آدمی کے مقابلے میں فریق مقدمہ بنا۔ کچھری اپنی عزت اس معمولی آدمی سے زائد نہ پا کر جب شاہ غسان گھبرا یا تو حضرت عمرؓ نے اسے آگاہ کیا کہ اسلام تشخصات کا مٹانے والا اور تمام بنی نوع انسانی کو ایک راہ پر چلانے والا ہے۔

علاوہ زمینداروں کے اور جاؤد کی نسبت انگلستان کا قانون اور نیز یورپ کے دیگر ممالک کے قوانین ہندوؤں کے قوانین سے بدجھا چھے ہیں اور ممکن ہے کہ بہت سی باتیں مسلمانوں سے لی گئی ہوں کیونکہ ترکے کا بہت سے حصوں میں تقسیم ہونا اور ایک وقت میں ذکور اور اثنا اور چھوٹوں بڑوں کو ملنا مسلمانوں کی طرح ان میں بھی ہے ورنہ یورپ کے ایام جاہلیت میں جسکی لاکھی اسکی بھیس ترکے کا مختلف حصوں میں تقسیم ہونا اور مختلف رشتہ داروں کو ملنا زمانہ امن کا یہ مہذب دستور لوٹ کھسوٹ میں کہاں پیدا ہو سکتا تھا اور اگر یہ کہا جائے کہ رومن لاکھی تقلید تمام یورپ میں کی گئی ہے تو پھر اختلاف کا باعث کیلئے ہے۔ بہر حال رومن لاکھی اثر مسلمانوں کی تقلید۔ ملکی رسم و رواج، مقنون کی رائیں سب مٹا کر مختلف حالتیں مختلف مقامات پر پیدا ہو گئیں ہم چند مثالی توریث کا مقابلہ کر کے فرق دکھاتے ہیں۔ اچھے برے کی نسبت ناظرین رائے قائم کریں یورپ میں اور لادز کور اور اثنا



کو برابر حصے ملتے ہیں اور مسلمانوں میں مردوں کو عورتوں سے دوگنا ملتا ہے۔ مسلمانوں میں مردوں کو دوگنا اس لئے نہیں ملتا کہ مرد عورتوں سے زیادہ پیارے ہیں بلکہ اس لئے کہ ان کو عورتوں سے زیادہ احتیاج ہوتی ہے مردوں پر بیویوں کا نان و نفقہ فرض ہوتا ہے اور عورتوں پر اپنے شوہروں کا کھلانا فرض نہیں ہے بلکہ اپنی اولاد کی پرورش کا بار بھی ان پر نہیں ہوتا یہ بھی شوہروں ہی کے سر پر ہوتا ہے۔ فرانس میں اقربا کی موجودگی میں شوہر کو کچھ ترکہ نہیں ملتا۔ انگلستان میں سب کا سب شوہروں کو ہی مل جاتا ہے۔ اسلام میں یہ اعتدال رکھا گیا ہے کہ اگر اولاد ہو تو شوہر کو چوتھا اور اولاد نہ ہو تو نصف۔ نصف سے زیادہ وہ نہیں پاتا فرانس میں زوجہ کو بھی اقربا کے ہوتے ہوئے ترکہ نہیں ملا۔ یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرانس میں حقوق زنا شوئی اتنے بھی نہیں ہوتے جتنے مسلمانوں میں مدخولہ عورتوں کے ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ مدخولہ عورتوں پر کبھی کبھی منکوحہ کا قیاس ہوتا ہے تو وہ زوجہ بن کر وارث ہوتی ہے۔ انگلستان میں زوجہ تنہا ہو تو اسے نصف ملتا ہے اور باقی بیت المال میں چلا جاتا ہے مسلمانوں کے یہاں زوجہ کے ہوتے ہوئے کبھی بیت المال میں ترکہ نہیں جاتا بیویوں کا حصہ مفروضہ زیادہ سے زیادہ ایک چہارم ہے لیکن دوسرے رشتہ داروں کے نہ ہونے کی حالت میں سب کا سب اسے مل جائے گا۔ انگلستان میں اگر زوجہ اور زوجہ کی اولاد ہو تو زوجہ کو ایک تہائی ملتا ہے اور مسلمانوں میں ایسی حالت میں ایک ثمن ملتا ہے یہ کمی عورتوں کے مدارج گھٹانے والی نہیں ہے۔ بلکہ اور وراثت کے حقوق کی نگہبانی کرنے والی ہے۔ صلاوہ بریں تعداد مہر ایک ایسی چیز ہے جو تقسیم ترکہ پر مقدم ہے اور تعین مہر کا اختیار بیویوں کو اور ان کے اولیاء کو پہلے سے حاصل ہوتا ہے اس لحاظ سے مسلمانوں کا ایک ثمن انگلستان کے ایک ثلث سے تمام جوانب پر نظر کر کے کسی طرح کم نہیں ہوتا۔

## دیگر مختلف قومیں

بعض قومیں دنیا میں ایسی ہیں کہ ان میں مردوں کو وراثت پہنچتی ہی نہیں اس خیال سے کہ مرد خود کما سکتے ہیں متوفی کا سارا ترکہ عورتوں کو دیا جاتا ہے یا رسیوں میں لڑکیوں کا حق اتنا مضبوط ہے کہ ان کے مرنے پر ان کے شوہر قائم مقام ہوتے ہیں یعنی داماد اور بیٹے برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں۔ ابھی حال میں بمبئی ہائی کورٹ سے ایک مقدمہ کا فیصلہ ہوا ہے۔ جس میں یہ بحث تھی کہ اگر داماد پہلی بیوی کے غم کو دل سے بھلا کر دوسری شادی کر لے جب بھی وہ پہلی بیوی کے خاندان میں حصہ پاسکتا ہے ؟ حکام نے تجویز کیا کہ جب داماد وارثوں کے ذمہ میں شامل ہے تو اس کا رد وارث نہایا نہ رہنا کوئی



فرق نہیں ڈالتا۔ اب ان قوانین کے مقابلہ میں شرعی قانون کا اعتدال ملاحظہ کے قابل ہے۔ کہیں عورتیں کچھ پاتی ہی نہیں اور کہیں مردوں کے برابر پاتی ہیں اور بعض جگہ مردوں کو محروم کر کے سب کا سب پاتی ہیں۔ مسلمانوں کا اعتدال قابل قدر ہے کہ وہ ہر حالت میں پاتی ہیں لیکن مردوں سے نفرت اور یہ کمی بیشی جن وجوہات پر مبنی ہے اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اب اس پر بھی بعض مسلمان باوجود دعویٰ مسلمان کے ہندوؤں کے قانون کی پیروی کرتے ہیں۔ اپنی طمع سے اندھے۔ گونگے اندھے ہو رہے ہیں تو وہ "ختم اللہ علی قلوبہم و علی سمعہم و علی ابصارہم غشاوہ" کے مصداق نہیں ہیں تو اور کیا ہیں۔

### ہند کے مسلمان

ہند کے جاہل مسلمان تو ریشہ کے متعلق ہندوؤں کی پیروی کرتے ہیں۔ اور تعجب تو یہ ہے کہ بعض لکھے پڑھے مسلمان بھی اس بارہ میں قرآن کو ناقص تصور کرتے ہیں برسٹن گورنمنٹ کی عدالتوں کی وجہ سے شرع محمدی کے احکام ان میں بہ جبر نافذ کئے جاتے ہیں ورنہ خود فراموش رعایا کا بس چلتا تو اب تک کبھی کے یہ معدوم ہو گئے ہوتے۔ جن مسلمان خاندانوں میں ہندوؤں کی پیروی اس بارہ میں اچھی سمجھی جاتی ہے انکی تمدنی حالت ہندوؤں سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ اشتراک خاندان اور حق نان و نفقہ یہ دو باتیں تو مسلمانوں میں پیدا ہوتی نہیں اور بلا ان کے متعلق کئے ہوئے ہندوؤں کا قانون وراثت جب مسلمانوں کے گھروں میں نافذ ہوتا ہے تو وہ آدھا تیترا آدھا بیڑ بہت ہی برا ہوتا ہے۔ ہندوؤں کے دیگر عادات اور مراسم کے اعتبار سے ان کے لئے ان کا قانون زائد تکلیف دہ نہیں ہے لیکن مسلمانوں کے لئے تو وہ نہایت ہی محرب اخلاق ہے۔ مثلاً ایک ساتھ دو لڑکیاں رام کلی اور زبیدہ (ایک ہندو دوسری مسلمان) بیاہی گئیں۔ دونوں ساتھ بیوہ ہوئیں اور بیوہ ہونے کے بعد دونوں بارہ برس تک اپنے میکے میں رہ گئیں رام کلی تو ترکہ شوہری نہیں پاسکتی تھی۔ ہاں زبیدہ پاتی لیکن ہندوؤں کے میل جول سے متاثر ہو کر سسرال والوں نے اسے ترکہ شوہری میں اسے حصہ دینا پسند نہ کیا۔ اب بعد بارہ برس کے دونوں کے میکے والے مفلس ہو گئے اور وہ سسرال چلیں رام کلی ترکہ نہیں پاسکتی تھی لیکن نان و نفقہ پانے کا اس کا ایسا زبردست حق تھا کہ جب تک جیتی رہتی نافذ کر اسکتی تھی۔ انگریزی عدالت موجود ہے سسرال والوں کی کیا مجال کہ عذر کرتے۔ یہ گئی اور نہایت پیار سے اس کی آؤ بھگت ہوئی۔ زبیدہ جو پہنچی تو سسرال والوں نے ڈولی تک اترنے نہیں دی وہ جانتے تھے کہ شوہری ترکہ میں ایک ربح اس کا تھا جو تمادی ایام کی نذر ہو گیا



اب اسے گھر میں ٹھہرا کر کون بکھڑا پیدا کرے۔ کل کو ہمارے قبضہ کی نوعیت پر بحث ہوگی تو اس کا ڈولی سے اترنا غضب ڈھلے گا۔ دس گواہ محلہ کے گزر جائیں گے کہ برابر آمدورفت لگی رہتی تھی اور سسرال والوں کا قبضہ موافق نہ تھا۔ ہندوؤں میں لڑکیاں ترکہ نہیں پاتیں لیکن ترکہ کے عوض میں شادی سے قبل اور شادی کے بعد ان کو۔ انکے شوہروں کو اور انکی اولاد کو رسم و رواج کے پیرائے میں مختلف مواقع پر بہت کچھ ملا کرتا ہے۔ مسلمانوں کی لڑکیاں ان چیزوں سے محروم رہتی ہیں۔ اپنے دستور کے مطابق اور پھر آئندہ چل کر ترکہ پداری سے محروم رہتی ہیں۔ ہندوؤں کے دستور کے مطابق اور اس طرح اپنی ہندو بہنوں سے زائد گھائے میں رہتی ہیں۔ ہندوؤں میں عورتوں کو ترکہ پداری کا خیال بھی نہیں ہوتا اور اس لئے جو کچھ بطور خیرات اور حسنت کے پاتی ہیں بے انتہا شکر گزار رہتی ہیں اور خوش رہتی ہیں اور اس طرح ان کی تمدنی حالت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ مسلمان لڑکیاں احکام شرع کے مطابق امیدوار رہتی ہیں اور بھائیوں کے ساتھ خود کو برابر کا پٹی دار جانتی ہیں اور جب ملنے کے وقت نکاسا جواب پاتی ہیں تو کدورت پیدا ہوتی ہے اور لطف صحبت میں فرق آتا ہے اور یوں بہت کچھ بے لطفیوں کا سامان پیدا ہوتا ہے اس حالت تذبذب سے تو یہ بہتر ہے کہ مسلمان ایک دل ہو کر گورنمنٹ سے قانون پاس کروالیں کہ شاستر کے مطابق انکے حقوق کا تصفیہ ہو کرے۔ ذرا ہیٹھی ہوگی مگر ہمیشہ کے لئے یہ غلش تو رفع ہو جائے گی۔ ایسی ہی اور بہت سی مثالیں ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جن مسلمانوں کے گھروں میں دیکھا دیکھی دھرم شاستر کے توریثی مسائل جاری ہیں وہ بہت ہی بد قسمت ہیں۔

غرض کہ مختلف قوم کے مختلف قوانین ہیں۔ ہر ایک بجائے خود اپنے قانون کو سب سے اچھا سمجھتا ہے۔ مسلمان کہتے ہیں کہ شرعی توریث کے قاعدے دنیا کے تمام گزشتہ اور موجودہ قوانین سے اچھے ہیں۔ ممکن ہے کہ غیر مذہب والے بھی دلائل اور نتائج پر غور کر کے یہ کہیں کہ مسلمانوں کا قانون وراثت بے شک افضل القوانین ہے۔ لیکن مسلمانوں کے لئے ایسا عقیدہ رکھنا تو گویا ان کے دین و ایمان کا جزو ہے۔ بہت سے مسلمان ایسے ہیں کہ جب خود غرضی متعلق ہوئی اور طمع سے آنکھوں پر اندھیری چھائی تو پھر ان کے نزدیک اچھے اور برے کا فرق نہیں رہتا طبیعتیں الجھتی ہیں اور دل میں سوچتے ہیں کہ ہندوؤں کے قانون ہمارے قانون سے کہیں اچھے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اتنا خیال گزرتے ہی اسلام نے خیر باد کہہ دیا۔ جب شرعی احکام برے ٹھہرے تو اس کا بنانے والا حکیم مطلق نہ رہا۔ اب یا اللہ کے حکیم مطلق ہونے کا انکار کیا جائے یا قرآن کے کلام ربانی



ہونے سے انکار کیا جائے۔ یہی دو صورتیں ہیں اور دونوں صورتوں میں دائرہ اسلام سے آدمی خارج ہو جاتا ہے اس قسم کے دسویں سے زیادہ تر اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب فریق مقابل کمزور ہو۔ مثلاً کوئی متمول شخص گیارہ لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑ کر فوت ہو جائے تو لڑکوں میں باہم کوئی مناقشہ نہ ہوگا۔ ایک دوسرے سے دبتا رہے گا۔ لیکن وہ بیچاری لڑکی سب کی آنکھوں میں کھٹکے گی اگر یہ اپنا حصہ چھوڑ بھی دے تو لڑکوں کے حصہ میں کوئی افزونی نہ ہوگی۔ محض جزو قلیل کل ترکہ کا تیسواں حصہ اس بے چاری کو ملنے والا ہے۔ لڑکی ہے کہ بھائیوں پر فدا ہو رہی ہے جان نثار کئے دیتی ہے اور بھائی ہیں کہ اپنے متوفی والدین کو روز صبح اٹھ کر صلواتیں سنتے ہیں کہ پیدا ہوتے ہی کمبختوں نے اس کا گلا گھونٹ دیا ہوتا تو آج اس بلا سے ہم کو چھٹکارا ہوتا فریق مقابل کی کمزوری بھی بسا اوقات جرائم کی جرأت کراتی ہے۔ بہنوں کا باشرم ہونا۔ پردہ نشین ہونا فطرتاً بالانس اور کمزور ہونا بھائیوں کو بے رحم غاصب اور کمینہ خصلت بنا دیتا ہے۔ بھائی بھائی کا حق ماننے کی جرأت نہ کرے گا لیکن بہنوں کے مقابلہ میں نیک سے نیک بھائی بھی بعض اوقات بڑے سے بڑا دشمن ہو جاتا ہے۔

افسوس یہ ہے کہ زیادہ تر یہ خرابیاں ان خاندانوں میں دیکھی جاتی ہیں جو شریف کہلاتے ہیں۔ اہر ریاست اور شرافت قدیم زمانے سے ان کے گھرنے میں چلی آتی ہے۔ بہنوں کے حق میں بے رحم زیادہ تر ایسے ہی خاندان میں ملیں گے۔ کوئی پندرہ برس کے قریب ہوئے کہ ایک بڑے ذی علم اور اعلیٰ خاندان کے ایک شخص پر بہن نے پدری حق کا دعویٰ رجوع کیا تھا مدعا علیہ نے مدعیہ کے بہن ہونے سے صاف انکار کر دیا گواہوں کی کیا کمی تھی۔ فریقین کی طرف سے گواہ پیش ہوئے۔ مدعیہ اور اس کے گواہوں کا یہ بیان تھا کہ فریقین ایک باپ کی اولاد ہیں اور ایک ہی ماں کے لطن سے پیدا ہوئے اور ایک ہی ماں کی گود میں پلے۔ مدعا علیہ اور اس کے گواہوں کا یہ اظہار تھا کہ مدعیہ کی ماں بھیک مانگتی ہوئی مدعی علیہ کے باپ کے گھر آ کر لڑکی ہوئی اور اس وقت یہ لڑکی گود میں تھی اس قدر تعلق بھی مدعا علیہ بیان نہ کرتا لیکن دقت یہ تھی کہ اکثر خطوط میں وہ مدعیہ کو بہن لکھ چکا تھا۔

مدعیہ کے وکیل نے مدعا علیہ کے اظہار کے وقت مدعی علیہ سے پوچھا کہ اگر مدعیہ کا شوہر مدعیہ کو طلاق دیدے تو تم اس سے عقد کر سکتے ہو؟ یہ سوال پوچھنا تھا کہ مدعا علیہ کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ تمام جسم سے عرق جاری ہو گیا۔ عدالت نے یہ حکم روک دیا کہ اس آبرو باختہ کی کہاں تک بے عزتی کرے گی۔ ہم مقدمہ سمجھ چکے ہیں۔ غرض کہ مراد اولیٰ سے مدعیہ کا دعویٰ ڈگری ہوا اور جب تک اپنی سے فیصلہ صادر نہیں ہوا مدعا علیہ نے شرم سے اپنی صورت دوستوں



کو نہیں دکھائی۔ عدالت رنگ ہا دارد۔ عدالت اپیل کے حاکم نے دعویٰ مدعیہ کا ڈس مس کر دیا۔ بظاہر محض اس خیال سے کہ اگر مدعیہ بہن ہوتی تو ہرگز انکار نہ کیا جاتا۔ حاکم عدالت نے شاید اپنی طبیعت پر قیاس کیا۔ زمانہ کے رنگ کا لحاظ نہیں کیا۔

ایسی صورتیں تو بہت پیدا ہوتی ہیں کہ بہن نے دعویٰ کیا اور بھائی نے بہن کے وجود سے انکار کر دیا۔ اب ہم ان جان خراش صورتوں کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرتے ہیں جب یتیم لڑکیاں اپنے بھائیوں کے قبضہ میں آجاتی ہیں۔ بعض بکخت بھائی ایسے ہیں جو جائیداد نکل جانے کے خوف سے ان بے چاری بہنوں کا بیاہ نہیں کرتے اور کبھی ارادہ بھی کرتے ہیں تو اس شرط سے کہ نکاح سے قبل لڑکی کل جائیداد کا بہ نامہ بھائی کے نام لکھ دے۔ لڑکیاں پردہ نشین سہی لیکن کہاں تک نادان رہیں گی۔ آخر وہ بھائیوں کی خواہشوں سے واقف ہو کر اشارۃً کنایۃً اپنی رضامندی ظاہر کر ہی دیتی ہیں اور دل میں سمجھتی ہیں کہ اگر اس پدری دولت کی بدولت تمام عمر کنوارا بیٹھا رہنا ہے تو اس تول سے ان فلاں اچھا ہے۔ کتنا پردہ نظارہ ہے کہ ایک کنواری پردہ نشین لڑکی اپنی تمام پدری جائیداد سے دست برداری کا وثیقہ لکھ کر اس کے بدلے میں اپنے نکاح کی نسبت بھائی کی رضامندی مول لیتی ہے۔ بعض بعض صورتیں ایسی بھی دیکھنے میں آئی ہیں کہ بہنوں کی شادی کم حیثیت لوگوں سے محض اس لئے کر دی گئی کہ بہن کو ناجنس کی صحبت کے غم سے اتنی فرصت نہ ملے کہ وہ اپنے حقوق طلب کرنے کی کوشش میں مصروف ہو یا یہ کہ بہن کے شوہر کو کبھی برابری کا دعویٰ نہ ہو سکے اور نہ بہن اس شرم سے کبھی مراٹھا سکے۔ معاذ اللہ۔

اے بسا ابلیس کا دم روئے ہست

عرض کہ وہ حالت ناگفتہ بہ ہوتی ہے جبکہ بے ماں باپ کی لڑکیاں کبھی کبھی اپنے بے حیا اور طماع بھائیوں کی ولایت میں آجاتی ہیں۔

ایک صورت بھائیوں کے اختیار میں یہ بھی ہے کہ والدین سے جیتے جی کوئی ایسی تحریر کرا لیں جس سے آئندہ زمانے میں بہنوں کو نقصان پہنچے۔ مگر اس صورت میں اکثر ناکامی ہوتی ہے ایک تو شرعاً والدین کو یہ اختیار نہیں دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ترکے کی نسبت کوئی انتظام قرآن کے خلاف کریں اور دوسرے یہ کہ والدین سے یہ کب ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بچوں میں امتیاز کریں ان کے نزدیک دونوں آنکھیں برابر ہونی چاہئیں لیکن زمانہ انحطاط ہے جو کچھ ہو جائے تعجب نہیں ہے۔ بعض ایسے بودے دل کے بھی ہوتے ہیں جن کو اولاد دکور کی گفتگو مرعوب کر لیتی ہے یا خود انکی تنگی خیال رہبر بن جاتی ہے اور وہ بے تکلف اپنی اولاد اناٹ



کی حق تلفی کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہیں اور میں بھی تو اس قبیل سے ہیں جو ایام جاہلیت میں لڑکیوں کو قتل کر ڈالتے تھے یا تنگی کی حالت میں لڑکیوں کو ذبح کر ڈالتے تھے۔ ان لوگوں سے سوسائٹی کو احتراز لازم ہے اگر ان کا بس چلتا اور انگریزی گورنمنٹ کا خوف نہ ہوتا تو یہ بھی اپنی لڑکی کا گلا پیدا ہوتے ہی گھونٹ دیتے۔ پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دینے اور اپنے ترکے سے آئندہ کے لئے محروم کرنے میں اخلاقاً کوئی بہت بڑا فرق نہیں ہے۔ صرف اتنا ہے کہ پہلی صورت میں یہیں سزا مل جائے گی اور دوسری صورت میں خدا کے یہاں باز پرس ہوگی۔ زائد توضیح کے لئے نوبتہ کی فصل ۳۶ دیکھیے۔

بھائیو! اگر تم اپنے اور بھائیوں کا حق مارو تو تم صرف غاصب اور گنہگار ٹھہرو گے دائرہ اسلام سے خارج نہ ہو گے۔ لیکن جب تم بہنوں کے حق مارنے کی فکر کرتے ہو تو اللہ تمہارے قلوب کو دیکھتا ہے کہ تمہیں قرآن کے احکام سے نفرت ہے اس وقت تمہارے دل کی نوعیت ہی دوسری ہے جس قرآن کو تم چومتے چاٹتے ہو۔ طوطے کی طرح روز پڑھتے ہو۔ طاق پیرا سے سب سے اوپر کہتے ہو اور ادھر پشت تک نہیں کرتے اسی قرآن کو تم اس بارے میں بدترین کتاب سمجھتے ہو اور اسی کی بدولت تم خدا کو دل میں برا کہتے ہو۔ اب تم ہی بتاؤ تمہارے اسلام کی نوعیت کیا ہے؟



## فصل نمبر ۳۲

### وصیت

ایک مسلمان کے مرنے پر اس کی جائیداد کس کے قبضہ میں جائے گی؟ ہر وقت اس کا جواب معلوم ہو سکتا ہے۔ نہ خاندان کی تقسیم کچھ فرق ڈالتی ہے اور نہ وارثوں کا دور یا نزدیک رہنا کچھ فرق ڈالتا ہے قرآن میں ہر ایک کے حصے صاف طور پر معین ہیں۔

بعض صورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ اپنی خدمت اطاعت اور احسانات سے اغیار اعزہ سے بڑھ جاتے ہیں۔ اس لئے شرع نے یہ اجازت دی ہے اور یہ اجازت نہایت عدل و انصاف پر مبنی ہے کہ مورث اپنی ایک ثلث جائیداد کو اغیار کے حق میں وصیت کر سکتا ہے لیکن بقیہ دو ثلث جائیداد کی نسبت اس کو کسی قسم کا حق نہیں دیا گیا ہے۔ نہ وہ کسی وارث کو محروم کر سکتا ہے اور نہ وارثوں کے حق میں خلاف شرع تقسیم کی ہدایت کر سکتا ہے۔ وہ مجاز نہیں ہے کہ ورثاء کے حق میں کوئی وصیت کرے۔ جس خدا نے مرنے والوں کو متمول بنا رکھا تھا اسی خدا نے یہ بھی سٹھہرا رکھا ہے کہ مرنے کے بعد دولت کس کی طرف منتقل ہوگی۔

سب سے عمدہ وصیت نامہ قرآن ہے اور سب سے عمدہ تحریر قرآن کی آیتیں ہیں جو کوئی مسلمان ہو کر قرآن سے عمدہ وثیقہ اپنی اولاد کے حق میں لکھنا چاہے وہ گمراہ ہے۔ دنیا میں رسوائی اور خدا کے ہاں ذلت اور پھر یہ بھی نہیں کہ تمام دقتوں کے بعد کسی طرح کامیابی بھی حاصل ہو عدالتوں میں کسی طرح تو ریشا اور وصیت کے متعلق کوئی امر خلاف شرع جائز نہیں رکھا جاسکتا ہے جو شخص اپنے ترکے کی نسبت یہ چاہے کہ قرآن کے خلاف اسکی تقسیم ہو اس کے لئے صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو وہ اپنا مذہب بدل ڈالے یا جائیداد کو ایسی جگہ چھپا کر رکھدے کہ بجز یہود ذہنی استعمار کے



دوسرے پتہ نہ پاسکیں۔ جو لوگ دوسروں کے حق تلف کرنے کے لئے جا بجا رائیں پوچھتے ہیں اور قرآن اور حدیث کے صریح احکام کے ہوتے ہوئے تاویلیں ڈھونڈتے ہیں اور دوسروں کے حق مارنے کی تدبیریں سوچتے ہیں وہ گمراہ ہیں۔

ہدایہ کی عبارت ذیل میں درج کی جاتی ہے جس سے حدیث نبوی اور مسئلہ فقہ دونوں معلوم ہو جائیں گے۔

“ ولا تجوز لوارثه لقوله عليه السلام ان الله تعالى اعطى كل ذي حق حقه الا الوصية للوارث  
ولانه نباذی البعض باثارا لبعض ففی تجویزہ قطیعة الرحم ولانه حیث بالحديث الذی  
رونیاء۔“

ترجمہ: اگر کوئی شخص وارثوں کے حق میں وصیت کرے تو جائز نہیں ہے کیونکہ پیغمبر خدا کا صریح قول ہے کہ خدا نے تمام وارثوں کے حصے معین کر دیئے ہیں۔ معلوم رہے کہ وارثوں کے حق میں وصیت درست نہیں ہے۔ ایک کو ترجیح دیکھائے گی تو دوسرے کو خواہ مخواہ اذیت پہنچے گی اور ایسا کرنے سے قطع رحم لازم آتا ہے اور علاوہ بریں حدیث متذکرہ بالا کی رو سے ایسا کرنا ظلم ہے۔“

عام طور پر جہلا میں یہ مشہور ہے کہ مرنے والے کو وصیت کر کے مرنا چاہیے اپنے بعد جھگڑا لگا رکھنا نہ چاہیے یہ خیال جہاں تک ورثاء کے حق میں وصیت کرنے کی بابت ہے اور زیادہ تر ایسا ہی ہوتا ہے۔ بالکل غلط اور سراسر گمراہی ہے۔ جب توریث کی آیتیں اتریں تو اب مسلمانوں کے لئے ان سے اچھی وصیتوں کا خیال کرنا ذلت ہے ہاں دوسروں کا قرض باقی ہو تو اس کی ادائیگی کے بابت ضرور وصیت کر دینا چاہیے۔ یا اگر غیروں کا بار احسان ہو.....

..... یا دوسروں سے کچھ وعدہ کیا ہو یا دوستوں کے حقوق خدمت ہوں تو احسان کا بدلہ احسان ہے۔ مرنے کے قبل ان کے لئے وصیت کرنا مناسب ہے لیکن وصیت ایک ثلث سے زیادہ نہ ہو۔ اگر زیادہ ہوگی تو احکام شرع اسے باطل کر دیں گے۔ قرآن میں سورہ بقرہ کے بائیسویں رکوع میں وصیت کا تذکرہ ہے لیکن تمام مفسرین اس آیت کی نسبت متفق البیان ہیں کہ یہ آیت آیات توریث کے قبل اتری تھی اور جب آیات توریث میں تمام ورثاء کے حصے بیان کر دیئے ہیں جیسا کہ کتاب ہذا کی فصل ۳۳ توریث میں مذکور ہے تو پھر اس آیت کے مطابق وصیت کرنے کی ضرورت نہ رہی۔ وصیت کئے بغیر بھی وہ بات حاصل ہو جائے گی جسکی بابت وصیت کرنے



کا حکم کیا گیا تھا۔ عربوں کی حالت یہ تھی کہ مثل ہندوؤں کے اولاد ذکور تمام ترک پر قابض ہو جاتی تھی۔ متوفی کے والدین کو کچھ نہیں دیتے تھے اور نہ دیگر رشتہ داران قریبی کو کچھ دیتے تھے اس وقت یہ حکم ہوا۔

مسلمانوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ تم میں سے کسی کے سامنے موت آجود ہو اور وہ کچھ مال چھوڑنے والا ہو تو ماں باپ اور دوسرے رشتہ داروں کے حق میں واجبی طور پر وصیت کرے خدا سے ڈرنے والوں پر ان کے رشتہ داروں کا بھی حق ہے۔ پھر جو کوئی وصیت سن کر اسے بدل دے گا تو اس کا گناہ انہیں بدلنے والوں پر ہو گا بے شک اللہ سنتا اور جانتا ہے۔ سورہ بقرہ کو ع ۲۲۔

اس کے بعد جب ماں باپ اور دیگر رشتہ داروں کے بھی حصے مقرر کر دیئے گئے تو اس آیت کے مطابق عملی طور پر وصیت کرنے کی ضرورت نہ رہی بلکہ محض اصول سمجھانے کے لئے یہ آیت قائم رہ گئی وہ یہ کہ علاوہ اولاد ذکور کے ماں باپ اور دیگر رشتہ داران کے حقوق کی حفاظت کی طرف شرع محمدی میں بہت کچھ خیال کیا گیا ہے۔

---

۱۔ کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیر الوصیۃ الوالدین والاقربین بالمعروف حقا علی المتقین  
 فمن بدلہ بعد ما سمعہ فانما اثمہ علی الذین یبدلونہ ان اللہ سمیع علیم۔



## فصل نمبر ۳۵

### بیع

ایک چیز کا دوسری کے بدلے میں دینا بیع کہلاتا ہے اور اگر کوئی بدلہ دوسرے کی جانب سے نہ ہو تو اس کو ہبہ کہتے ہیں۔ بیع کے مسائل شرع محمدی میں بہت طوالت سے بیان کئے گئے ہیں۔ بہت سی صورتیں ایسی ہیں کہ فریقین چاہیں کہ بیع عمل میں آئے لیکن شرع بیع کے جواز کو روکتی ہے شرع میں یہ محکوم ہے کہ گھر کے فروخت کرنے سے کیا کیا چیزیں فروخت ہو جاتی ہیں۔ جا کر بیچنا کہاں تک جائز ہے بے دیکھے ہوئے چیزوں کی خرید و فروخت کن شرائط سے روا ہے۔ بیع میں عیب ظاہر ہونے کی صورت میں کیا کرنا چاہیے۔ بیع ناجائز کے متعلق واپسی زر ثمن کے احکام۔ اقالہ بیع یعنی بیع کے واپس کرنے کا بیان۔ تولیہ کا بیان یعنی خریدنے کے ساتھ ہی دام کے دام بیچ ڈالنا۔ یا نفع پر بیچنا جسکو مباحث کہتے ہیں۔ مال منقول و غیر منقول کی تفصیل۔ ربوا یعنی سود خواری کی ممانعت ان حقوق کا بیان جو داخل بیع ہوتے ہیں بیع اگر کسی غیر کی ظاہر ہو تو کیا ہو۔ سلم کا بیان یعنی پہلے قیمت کا دیدنا اور پھر کچھ دنوں کے بعد مال کا لینا وغیرہ وغیرہ بہت سی باتیں شرع محمدی میں بیع کے متعلق بیان کی گئی ہیں جن کے بالتفصیل بیان کرنے میں چند ان دلچسپی نہیں ہے اتنا جاننا کافی ہے کہ فقہی ضرورتوں سے احکام بیع بہت طوالت سے بیان کئے گئے ہیں اور مسلمان فقیہوں کی نہایت نکتہ چینی اور انصاف پسندی مسائل بیع پڑھنے سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے عالمگیر حکومت کے زمانے میں حقوق طے کرتے وقت کیسی باریک نظر سے معاملات دیکھے جاتے تھے ان تمام مسائل پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مضمحلہ ذیل امور پر لحاظ رکھا جاتا تھا۔



۱۔ ایک انسان دوسرے انسان سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔

۲۔ کوئی معاملہ قمار بازی کے طور پر نہ کیا جائے۔

۳۔ مال عرب پیش عرب رہے۔

۴۔ جہاں تک ممکن ہو معاملہ صاف رہے اور سادہ رہے۔ آئندہ کے لئے نزاعوں اور جھگڑوں کے دروازے نہ کھلیں اور نہ پیچیدہ معاملات کی بنیاد پڑے۔

## آیات قرآنی

”مسلمانو! جب تم ایک معیاد مقرر تک ادھار کالین دین کرو تو اس کو لکھ لیا کرو یا تمہارے درمیان میں کوئی دوسرا لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھ دیا کرے۔ لکھنے والے کو انکار نہ کرنا چاہیے۔ جیسا اللہ نے سکھایا ہے لکھ دیا کرے اور مقروض کو چاہیے کہ لکھاتا جائے اور اللہ سے کہ وہی اس کا کارساز ہے ڈرتا رہے اور کچھ کمی بیشی نہ کرے۔ اگر مقروض کم عقل ہو۔ معذور ہو یا خود نہ لکھا سکتا ہو تو اس کا ولی انصاف سے لکھا دے۔ اپنے لوگوں میں سے اطمینان کے دو مرد گواہ کر لو اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد و عورتیں۔ کیونکہ ایک بھول جائے گی تو دوسری یا دو دلا دے گی۔ گواہ جب بلائے جائیں تو وہ انکار نہ کریں۔ معیادی معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کے لکھ لینے میں کاہلی نہ کرو۔ خدا کے نزدیک یہ بہت ہی منصفانہ کارروائی ہے اور گواہی کے لئے بھی یہی طریقہ بہت ٹھیک ہے اور زیادہ تر قرین قیاس ہے کہ تم اس طرح آئندہ شک و شبہ نہ کرو گے۔ ہاں سودا دم نقد ہو جسکو تم لیتے دیتے ہو تو اس کے نہ لکھنے میں کچھ گناہ نہیں۔ خرید و فروخت کرو جب بھی گواہ کر لیا کرو۔ کاتب کو اور گواہ کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اگر ایسا ہوگا تو یہ تمہاری شہادت ہے۔ اللہ سے ڈرو اللہ تم کو معاملے کی صفائی سکھاتا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ اگر تم سفر میں ہو اور تم کو کوئی لکھنے والا نہ ملے تو رہن بالقبض کر لو۔ جب تم سے ایک دوسرے کا اعتبار کرتا ہے تو جس کا اعتبار کیا گیا ہے اسے چاہیے کہ قرض دینے والے کی امانت ادا کرے اور خدا سے جو اس کا کارساز ہے ڈرے۔ شہادت کو نہ چھپاؤ جو چھپاتا ہے وہ دل کا کھوٹا ہے۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو سب معلوم ہے۔ سورہ بقرہ کو ع ۳۹۔

۱۔ یا ایہا الذین آمنوا اذا تدانیتکم بدین الی اجل مسمی فاکتوبوه ولیکتب بینکم کاتب بالعدل ولا یاب کاتب ان یتب کما علم اللہ فلیکتب ولیملل الذی علیہ الحق ولیتق اللہ ربہ ولا ینحس منه (باقی صفحہ ۳۶ پر)



لین دین خرید و فروخت تمام معاملات کی نسبت کتنے مختصر طور پر سب باتیں اصول کے طور پر بیان کر دی گئی ہیں۔ یعنی جب ایک دوسرے سے لین دین کرے تو خود لکھ لے یا دوسرے سے ٹھیک ٹھیک لکھو لے۔ لکھنے والے کو چاہیے کہ جیسا اسے لکھنا آتا ہے حتیٰ الوسع ٹھیک ٹھیک لکھ دے اور دوسرے سے لکھوانے کی حالت میں مقروض کو چاہیے کہ وہ ٹھیک ٹھیک لکھوائے مقروض غیر مکلف ہو تو اس کے اولیاء یہی کام کریں۔ . . . . معاملات کے وقت دو گواہ ٹھہرائیے بھی محکوم ہے عورتوں کا حافظہ کمزور ہے اس لئے اس بارہ میں وہ دو ایک مرد کے برابر ہیں میعاد می معاملات جتنے ہوں اور اس لئے آئندہ انکی بحث پیدا ہونے والی ہو تو وہ چھوٹی ہو یا بڑی لکھنا ضروری ہے۔ خدا کے نزدیک یہی طریقہ یادداشت کا ٹھیک ہے اور گواہ مقرر کرنا بھی بہت مناسب ہے اور اس طرح امید ہے کہ آئندہ شک و شبہ پیدا نہ ہوگا۔ ہاں دم نقد سودا ہو ایک ہاتھ سے دینا اور دوسرے ہاتھ سے لینا ہو تو تحریر کی ضرورت نہیں ہے۔ خرید و فروخت کرتے وقت بھی گواہ کر لو۔ گواہ کو یا کاتب کو حیران نہ کرنا چاہیے کیونکہ ان کے ذریعہ سے مدد ملتی ہے۔ یہ سب طریقے جو بتائے گئے ہیں ان سے معاملہ میں صفائی پیدا ہوتی ہے۔ سفر میں اگر لکھنے والا نہ ملے تو جلدی میں قرض دینے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جب کو نقد دیا اس کی چیز رہن رکھ لی۔ لیکن رہن سے رہن سودی مراد نہیں ہے۔ جب اس طرح ایک دوسرے پر اعتبار کر کے قرض دیتا ہے تو چاہیے کہ بد معاملگی سے اس میں فرق نہ ڈالا جائے۔ خدا سے ڈرنا چاہیے وہ کارساز ہے۔ نیت درست رہے گی تو وہ ادائے قرض کی صورت بھی نکال دے گا۔ تمام معاملات میں شہادت کی تاکید ہے تو شاہدوں کو بھی چاہیے کہ وہ شہادت نہ چھپائیں۔ دل کے کھوٹے شہادت چھپاتے ہیں۔ اللہ سب کے دل سے آگاہ ہے۔ فقہانے ان آیات سے بہت سے مسائل نکالے ہیں۔ جہاں جہاں شاہدوں کی تعداد قرآن میں مذکور نہیں وہاں کم سے کم دو شاہد شرعاً ضرور ہوتے ہیں۔

دیکھئے صفحہ کا باقی) شياً فان كان الذی علیہ الحق سفیهاً او ضعيفاً ولا يستطيع ان یمل ہو فیمل ولیہ بالعدل  
 واستشهدوا شہدین من رجالکم فان لم یجئین فرجل وامراتین ممن ترضون من الشہد ان تفضل احدہما فتذکر  
 احدلما الاخری ولا باب الشہد اذا ما دعوا ولا تسموا ان تکبئوہ صغیراً او کبیراً الی اجلہ ذانکم اقسط عند اللہ واقوم  
 للشہادۃ رادنی الا تراتبوا الا ان تكون تجارۃ حاضرة تدیر و ہا بنیکم فلیس علیکم جناح الا تکتبوا باء شہدوا اذا تبا  
 یعتم ولا یضار کاتب الا شہدوا ان تفعلا فانہ فسوق بکم والتقوا اللہ ویعلمکم اللہ واللہ بکل شیء علیم وان کنتم علی سفر  
 ولم تجدوا کاتباً فزمن مقبوضہ فان امن بعضکم بعضاً فلیؤد الذی اذمن امانتہ ولتیق اللہ ولاتکتبوا الشہادۃ دین  
 بکتبہا فانہ اثم قلبہ واللہ بما تعملون علیم۔



اب بھی انگریزی عدالتوں میں بہت سی دستاویزیں ہیں جو بغیر دو گواہوں کے کالعدم سمجھی جاتی ہیں۔ بہت سے معاملات ایسے ہیں کہ وہ اگر تحریر نہ کئے جائیں اور گواہوں کی گواہی نہ ہو تو اجکل کی انگریزی عدالتیں انہیں کالعدم سمجھتی ہیں۔ قرآن میں گواہ لینا اور لکھ لینا نہایت افضل سمجھا گیا ہے اور قرآن میں اس کی بابت سخت تاکید ہے۔ جیسا کہ مفصلہ بالا آیتوں سے ثابت ہے۔ لیکن فقہانے ان آیات کو محض ترغیب دلانے والی سمجھا ہے۔ ان کے نزدیک اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر قاضی کے سامنے معاہدہ کرنے والا یہ بیان کرے کہ میں نے معاہدہ کیا اور معاہدہ سے فائدہ بھی اٹھایا لیکن معاہدہ تحریری نہیں ہوا اور دو گواہوں کی گواہیاں نہیں ہوئیں اس لئے وہ مجھ پر واجب التعمیل نہیں ہے تو اس پر سے معاہدہ کی تعمیل اٹھادی جائے۔

### خرید و فروخت میں عربوں کی تہذیب

اگر قومی تمدن کسی مضبوط اور پکے اصول پر مبنی نہیں ہے تو دولت کے ساتھ اسراف لازم ہے جب دولت بڑھتی ہے تو ساتھ ہی اسراف بھی بڑھتا ہے۔ معلمان اخلاق نے اسراف سے بہت کچھ ڈرایا ہے۔ لوگ دھیان نہیں کرتے اور نہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسراف دولت کی بنیاد کا گرانے والا ہے جس طرح دولت حاصل ہونے کے بعد دولت کی حرارت یعنی نخوت کا پیدا ہونا لازم ہے ویسے ہی یہ بھی لازمی ہے کہ کچھ دنوں کے بعد دولت کی قدر دلوں سے جاتی رہتی ہے اور اسی کا دوسرا نام اسراف ہے دولت کی قدر نہ کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ نخوت پیدا نہ ہو لیکن اس طرح کی ناقدری الشاذ کالعدم کے حکم میں ہے۔

آجکل انگلستان میں دولت کی کثرت ہے اور اس لئے وہاں کے باشندے اسراف کی بلا میں گرفتار ہیں۔ وہاں اسراف کی صورتیں مختلف ہیں۔ ہم صرف اس صورت سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو خرید و فروخت سے متعلق ہے۔ وہاں کے اہل دول جب کسی دکان میں چیز پر خریدنے جاتے ہیں تو نقد قیمت ادا کرنا نشان کے خلاف جانتے ہیں۔ اور لیڈیاں تو قیمت بھی دریافت نہیں کرتیں۔ گئیں اور پسند کی چیزیں اٹھالائیں دوکاندار نے جو چاہی قیمت لکھ لی ہے ایمان تاجروں کا تو ذکر نہیں ویانت دار تاجر بھی ایسے سودے میں سود۔ ہرجہ۔ حیرانی اور محنت بھی کچھ دل میں جو کہ ڈیوڑھا دونادام رکھ لیتے ہیں۔ امراد کی دیکھا دیکھی غرابا بھی وہی چال چلے۔ نقد قیمت دے کر سود لینا گویا مسافر مہول الاسم ہونے کی دلیل ہے۔ یہی طریقہ ہندوستان میں بھی جاری ہوا ہے



جو ہندوستانی دوکانیں انگریزی دکانوں کے طریقہ پر کھلی ہوئی ہیں ان میں بھی یہی راستہ اختیار کیا گیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی دکانیں جن میں بمشکل دس بیس روپیہ کھاپی کر بچتا ہے ان میں بھی ضرور ہے کہ دس پندرہ روپے ماہوار کا محرر بل بنانے کے لئے مقرر ہے پانچ پانچ روپے کے دو زائد پیا دے نقلے کے لئے معمور ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ طریقہ نہایت ہی ناپسندیدہ ہے۔ روپیہ کا مال خواہ مخواہ ڈیڑھ دو روپے کو اس طرح لینا پڑتا ہے۔ علاوہ گرانی کے خریدار کے لئے ایک یہ وقت ہے کہ اکھٹا دنیا اس کو اکھرتا ہے اور لبا اوقات وہ آسانی نہیں دے سکتا اور بہ آسانی نہ وصول ہونے کی دقتیں وہ خوب سمجھ سکتے ہیں جو صابن کی بٹی۔ لیمپ۔ نب بٹن۔ برش وغیرہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کی بدولت نوکری پیشہ انگریزوں کا اثاثہ روز کچھریوں میں نیلام ہوتے دیکھتے ہیں اس طور سے صرف خریداروں ہی کا نقصان نہیں ہوتا بلکہ دوکانداروں کا بھی ہوتا ہے۔ گو وہ غیر ممکن الوصول رقموں کا پرتہ دوسرے خریداروں پر بچھالیتے ہوں گے لیکن جب شروع سے ناہند ہی ناہند ہیں تو ان بیچاروں کا بھی ناک میں دم ہو جاتا ہے۔ یوں ظاہری بھڑک دیکھ لیجئے لیکن حساب دیکھنے سے معلوم ہو گا کہ درخت کا اندرونی حصہ بالکل سڑ کر کھوکھل ہو گیا ہے۔ ذرا تیز ہوا چلی اور گرا۔ بڑے بڑے شہروں میں انسالونسی کورٹ میں جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ دکانداروں پر کیا گزرتی ہے۔ زمانے کے دستور نے ہند کی تجارت کا لطف کم کر دیا ہے اور یہ ناپسندیدہ طریقہ جا نہیں کے لئے مضر ہے۔ اگر نقد قیمت دے کر خریداری کی جائے تو مال سستا ملے اور آئندہ دقتیں نہ ہوں۔ دکاندار خریداروں کو دعائیں دیں اور خریداروں کو کبھی دقتوں کا سامنا نہ ہو۔ عرب اپنے زمانہ عروج میں ملک التجار تھے۔ نہ قرض لیتے تھے اور نہ قرض پر معاملہ کرتے تھے۔ مال عرب پیش عرب "مثل مشہور ہے اب بھی بعض بلاد اسلام میں پرانے طریقے پر مسلمان تجارت کرتے ہیں اور نہایت آزادی اور بے فکری سے مال بچتے ہیں۔ خود بھی خوش رہتے ہیں اور خریداروں کو بھی خوش رکھتے ہیں۔



## فصل نمبر ۳۶

### ہب

صدقہ اور ہدیہ کا بیان اور ان دونوں کا فرق کتاب ہذا میں مفصل بیان ہو چکا ہے۔ یہاں ان دونوں کے متعلق احکام فقہ بیان کئے جاتے ہیں۔ صدقہ اور ہدیہ کے لئے فقہ میں ایک ہی لفظ "ہبہ" استعمال کیا گیا ہے۔

ہبہ ہمیشہ بغیر عوض کے ہوتا ہے اور جو بعوض ہوتا ہے وہ بیع کے حکم میں ہے ہبہ نہیں ہے۔ ہبہ مثل اور معاملات کے کبھی دھوکے سے بھی ہو جاتا ہے۔ پھیلا کر۔ دباؤ ڈال کر بیجا خوشامد کر کے اور کبھی فریب دے کر لوگ اپنا کام نکال لیتے ہیں۔ اگر ان صورتوں میں ہبہ کرنے والے کو ہبہ کے واپس لینے کا اختیار نہ دیا جائے تو نہایت بے انصافی ہوگی۔ ہر ملک کے قوانین میں یہ امر مذکور ہے کہ فریب۔ دغا۔ غلط بیانی۔ دباؤ۔ داب نا جائز سے یا بدحواسی سے کوئی معاملہ کیا جائے تو کالعدم ہے اور اس لئے ہبہ بھی ان صورتوں میں خواہ مخواہ کالعدم ہو جاتا ہے۔

شرع محمدی نے اور معاملات کے ساتھ ہبہ کے احکام اس بارہ میں شامل نہیں کئے ہیں۔ بلکہ اس کے لئے جدا احکام ہی مبنی بر عدل و انصاف بنا دیئے ہیں۔ یعنی یہ محکوم کر دیا ہے کہ ہبہ مکمل نہیں ہوتا جب تک واہب اپنا قبضہ اٹھانے اور موہوب راہبہ کو قبول کر کے شے موہوبہ پر اپنا قبضہ نہ کرے۔ اس کلیتہ سے مستثنیٰ ہے تو صرف وہ صورت جبکہ زوجہ یا اولاد نابالغ کے حق میں ہبہ کیا جائے۔ ہبہ کے قابل شرع محمدی میں وہی چیز سمجھی گئی ہے جس پر قبضہ ہو سکتا ہو اور واہب اس پر وقت ہبہ کے قابض ہو۔ واہب کے حق میں اس قدر سہولتیں اور رعایتیں



محکوم ہوئیں۔ پھر بھی حنفیوں نے (جنکا قانون اکثر بلاد اسلام میں نافذ ہے) خیال کیا کہ ممکن ہے کہ واپسوں کے حق میں اس طرح پورا انصاف نہ ہو اور اس لئے حکم صریح نافذ کیا کہ ہبہ کے ہر طور پر نافذ ہو جانے کے بعد واپس کو اختیار ہے کہ شے موہوبہ واپس کر لے۔

۱۔ بشرطیکہ شے موہوبہ ضائع نہ ہوئی ہو۔

۲۔ موہوب لہ کی ملکیت سے خارج نہ ہوئی ہو۔

۳۔ واپس مرنے گیا ہو۔

۴۔ شے موہوبہ میں ترقی نہ ہوئی ہو۔

۵۔ شے موہوبہ میں تبدیلی واقع نہ ہوئی ہو۔

۶۔ واپس اور موہوب لہ میں رشتہ زنا شوئی نہ ہو۔

۷۔ واپس اور موہوب لہ میں رشتہ داری بدرجہ محرمات نہ ہو۔

۸۔ ہبہ کے عوض میں کچھ نہ لیا گیا ہو۔

عرض کہ جب ایک شے مفت دی جاتی ہے تو لینے والے پر فرض ہے کہ وہ دینے والے کا ہمیشہ شکر گزار رہے اور اسکی نیت بدلنے نہ دے اور خوب سمجھ بوجھ کر اطمینان کی حالت میں لے تاکہ معاملہ کی صفائی میں ذرا بھی شبہ نہ رہے۔ شرع محمدی کا یہ مسئلہ بھی قابل قدر ہے کہ مرض الموت میں اگر کوئی شے ہبہ کی جائے تو صرف ایک تہائی اس کی موہوب لہ کو پہنچتی ہے ایسا ہبہ وصیت ہو جاتا ہے۔

اب دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ورثا کے حق میں ہبہ درست ہے یا نہیں۔ اگر ہبہ سے اولاد کے سوا دوسرے ورثاء کو محروم کرنا ہے تو ہبہ کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے لیکن اگر ہبہ سے مقصود ہو ایک اولاد کو دینا یا زیادہ دینا اور دوسری اولاد کو کم دینا یا نہ دینا تو ایسی ہبہ کے جواز میں اختلاف ہے فقہاء جواز کا فتویٰ دیتے ہیں لیکن اخلاقاً بہت برا بتاتے ہیں اور بعض محدثین ایسی ہبہ کو شروع سے کالعدم قرار دیتے ہیں۔

اس اختلاف کی وجہ قول رسول کے معنی سمجھنے پر مبنی ہے جسکا بہ تصریح بیان کرنا ہم مسلمانوں کی ہدایت کے لئے مناسب سمجھتے ہیں۔

نعمان اجلہ انصار رسول اللہ سے تھے ان کے باپ بشیر نے ان کو ایک غلام دینا چاہا۔ چونکہ پیغمبر خدا نے اصول اسلام اپنی صحبت سے سب کے دلوں میں جما دیا تھا اس لئے اس ہبہ کے



جواز میں ان سب کو شبہ ہوا اور انھوں نے چاہا کہ پیغمبرؐ کے پاس چل کر ان کو گواہ کریں اور اس طرح دریافت کر لیں کہ اس ہبہ میں کوئی نقصان تو نہیں ہے۔ پیغمبرؐ نے سکر ہبہ کو ناجائز بتایا اور نعمان کو جو غلام بشیر سے ملا تھا وہ پھر بشیر کے پاس واپس آ گیا۔

نعمان کے باپ نے رسول اللہ صلعم کے پاس آ کر کہا کہ میں نے اپنا ایک غلام نعمان کو دیا ہے۔ رسول اللہ صلعم نے کہا کیا اپنے تمام لڑکوں کو تم نے ایسا ہی غلام دیا ہے نعمان کے باپ نے جواب دیا کہ نہیں۔ پیغمبرؐ نے کہا کہ واپس لے لو اور ایک روایت میں کہا کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد میں عدل کرو۔ صحیح البخاری المجلد الثالث کتاب الہبہ

حدیثیں بالفاظ اور بہ معنی دونوں طرح منقول ہوئی ہیں۔ راویوں کا حافظہ اکثر لفظوں کو سمجھ کر معنی کا خیال رکھتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اصل راوی نے کبھی بالفاظ روایت کی اور کبھی بہ معنی۔ مختلف وقتوں میں مختلف سننے والوں کے ذریعے سے اختلاف شروع ہوا۔ جب حدیثوں کی تدوین کا وقت آیا تو جمیع اقوال نظر بہ احتیاط قلمبند کر لئے گئے۔ غرض کہ پیغمبرؐ خدا کے منہ سے جو الفاظ نکلے ان کو مختلف کتب احادیث میں یوں لکھا ہے۔

”رسول اللہ نے فرمایا۔ اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد میں عدل کرو۔“

(تمام کتب احادیث میں)

رسول اللہ صلعم نے کہا ہبہ واپس لے لو۔ (صحیح بخاری اور صحیح مسلم) ہبہ

رسول اللہ صلعم نے کہا مجھے گواہ نہ کرو میں جو روسم کا گواہ نہ بنوں گا۔ (مسلم)

اس امر میں میرے سوا کسی دوسرے کو گواہ کرو۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ میں حق ہی پر گواہ ہو

سکتا ہوں۔ (جامع صحیح مسلم و سنن نسائی)

۱۔ ان اباء اتی بہ الی رسول اللہ صلعم فقال انی نخلت ابنی ہذا فلما کان لی فقال رسول اللہ اکل ولدک

نخلتہ مثل ہذا فقال لا قال فارجه و فی روایتہ قال رسول اللہ صلعم اتقوا اللہ عدلانی اولادکم۔

۲۔ فقال رسول اللہ صلعم اتقوا اللہ لونی اولادکم۔

۳۔ فارودہ یا فارجه۔

۴۔ فلا تشہدنی فانی لا اشہد علی جور

۵۔ فاشہد علی ہذا غیرہا۔ لیس یصح ہذا فانی لا اشہد الا علی حق۔



ہیبہ میں تم اپنی اولاد کو برابر سمجھو جیسا کہ تم چاہتے ہو کہ وہ سب تمہاری اطاعت برابر کریں“ (صحیح مسلم)

”تمہاری اولاد کا یہ حق ہے کہ تم ان کے ساتھ عدل کرو۔ مجھ کو تم ظلم پر گواہ نہ کرو۔ تم چاہتے ہو کہ وہ تمہاری اطاعت برابر کریں؟ بشیر نے کہا ہاں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تم عدل نہ کرو گے تو وہ اطاعت نہ کریں گے“ (احمد)

”میرے سوا کسی اور کو گواہ کر لو“ (سنن نسائی)

”اپنا گواہ ہونا آنحضرتؐ کو وہ سمجھے“ (سنن نسائی)

”کیا اپنی اولاد میں تم نے برابری کا خیال نہ رکھا“ (سنن نسائی)

”اولاد میں مساوات کا خیال رکھو“ (ابن جان)

”واپس لے لے“ (موطا امام مالک)

”میں گواہی نہیں دیتا لیکن حق پر“ (عبدالرزاق)

”لڑکوں کا یہ حق ہے کہ تم ان کے ساتھ عدل کرو جیسا کہ تم کو یہ حق ہے کہ وہ تمہاری اطاعت کریں“

(سنن ابی داؤد)

ان تمام اقوال مختلفہ پر لحاظ کر کے جو نتیجہ علمائے متقدمین نے نکالا ہے وہ یہ ہے۔

۱۔ اعدلو بین اولادکم فی النخل کما تجبون بعد لوا بینکم فی البر۔

۲۔ ان لبتک علیک من الحق ان تعدل بینہم فلا تشہدنی علی جورا تحب ان یکونوا لیک فی البر

سوار قال بلی قال فلاذ۔

۳۔ فلا تشہد علی ہذا غیری۔

۴۔ فکرہ ان یشہد۔

۵۔ الا سویت بینہم۔

۶۔ سو بینہم۔

۷۔ فار تجعہ

۸۔ لا اشہد الا علی حق۔

۹۔ ان لہم علیک من الحق ان تعدل بینہم کما لک من الحق ان یبروک۔



سب کا ایک ہی مفہوم ہے۔ یعنی مساوات کا حکم اور اس کے خلاف کرنے کی ممانعت اور تصریح اس امر کی کہ ہبہ میں مساوات نہ ہو تو وہ جائز نہیں ہے اور ظلم ہے۔ اور اس کے بطلان کا حکم فحوائے عبارت سے عیاں ہے؛ (حافظ ابن حجر) اگر ان دلیلوں سے منع نہیں سمجھا گیا تو پھر معلوم نہیں کونسی دلیل سے منع سمجھا جائے گا۔ شوکانی (۲)

”اس سے مساوات اور عدل کا وجوب نکلتا ہے۔ کیونکہ یہ امر کی جگہ پر آیا ہے اور امر مقتضی ہے وجوب کا۔“ (امیر حسین در شفاء الامام)

”ان سب سے یہی نکلتا ہے کہ اولاد میں سوائے تسویۃ کے یعنی ان کے حقوق مساوی رکھنے کے سوا اور کچھ جائز نہیں ہے۔“ (امام احمد بن سلیمان در اصول الاحکام)

امام احمد بن سلیمان نے ایک قول ابن عباس کا نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ”دینے میں اپنی اولاد کے ساتھ مساوات کا خیال رکھو۔ اگر ایک کو ترجیح دینے کا اختیار ہوتا تو میں لڑکیوں کو ترجیح دیتا۔“

یہیں یہ لکھنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جتنی باتیں اوپر بیان کی گئیں وہ سب فقہاء کے نزدیک مسلم ہیں۔ جو کچھ ان میں اختلاف ہے نتیجہ نکالنے میں ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ تسویۃ دلینی سب اولاد کو برابر دینا، مناسب ہے اور اس کا ترک کرنے والا گنہگار ہے۔ اور بعض کا قول ہے۔ کہ تارک گنہگار تو ہے ہی نفس ہبہ بھی کالعدم ہے۔ تسویۃ مطابق حصص شرعی کے ہونا چاہیے۔ یا با اعتبار تعداد موہوب لہ کے ہونا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں مساوات بر حسب موارث ہونا چاہیے بر حسب روس۔

۱۔ کل تریح الی معنی واحد قد اشتکل علی الامر بالتسویۃ والنہی عن المخالفة والتصریح لعدم صحۃ البتہ التی لا

تسویۃ نہا وانما من الجور والتبئی علی البطلان بالفحوی۔

۲۔ اذا لم تغد ہذہ الاولۃ المنع فلا یدری ای دلیل یفیدہ۔

۳۔ دل ذلک علی وجوب المساوات والعدل لانه اورده مورد الامر والامر یقتضی الوجوب۔

۴۔ دل علی انه لا یجوز الا التسویۃ بین الاولاد۔

۵۔ سودا بین اولادکم فی العتیۃ فلو کنت مفضلًا فضلت النبات۔



امام احمد کہتے ہیں۔

” مساوات کی ضرورت میں علماء کا اختلاف نہیں ہے۔ جو کچھ اختلاف ہے کیفیت مساوات میں ہے۔ ابو یوسفؒ کا مذہب ہے کہ باپ بخشش میں پسر اور دختر کو برابر رکھے۔ اور محمدؐ نے کہا۔ نہیں۔ واجب ہے کہ علی حسب الموارثت ان میں مساوات کی جائے۔ یعنی پسر کو دو حصے دیئے جائیں اور دختر کو ایک حصہ اور وجہ اس کی یہ بیان کی کہ اگر باپ مر جائے اور کچھ نہ دے جائے تو اس کے ورثا اسی طریقہ سے ترکہ پائیں گے۔“

ان تمام اقوال پر نظر کر کے محدثین کی رائے یہ ہے کہ ہبہ میں مساوات واجب ہے۔ اور جس ہبہ میں بغیر کسی وجہ شرعی کے مساوات بین الاولاد نہ ہو وہ باطل اور کالعدم ہے ایسا ہبہ کرنے والا گنہگار اور سخت گنہگار تو تمام علمائے اسلام کے نزدیک ہے۔ لیکن اس امر میں اختلاف ہے کہ وہ باطل ہے یا نہیں۔ بعض علماء کے نزدیک وہ ضرور باطل ہے اور قاضی کے حکم سے کالعدم ہو سکتا ہے۔

جن وجوہ سے یہ رائے قائم کی گئی ہے انکی تصریح ذیل میں ہے۔

جب آنحضرتؐ نے فرمایا۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ (لیس تصح ہذا) تو پھر عدم جواز ہبہ غیر مساوی میں کیا شبہ رہ گیا۔

” میں سوائے حق کے دوسرے کسی امر کا گواہ نہیں ہو سکتا۔ (لا اشہد الا علی الحق) جس کا مطلب تصریح یہ ہو کہ یہ حق نہیں ہے۔ حق ہوتا تو میں گواہ ہوتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو حق نہیں ہے باطل ہے۔

” جو پر مجھ کو گواہ نہ کرو۔ (لا تشہدنی علی جور) جو کے باطل ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہے۔“

” لڑکوں کا تجھ پر یہ حق ہے کہ تو ان میں عدل کرے۔ (ان لینک علیک من الحق ان تعدل بینہم) جب عدل لڑکوں کا حق ہو تو باپ پر واجب ہوا۔ اور باپ کا جو فعل حق اور وجوب کے

لہ و لا خلاف فی ہذا بین العلماء و انما اختلفوا فی کیفیتہ التسویۃ فذہب ابو یوسف الا انہ لیساری بین الاتی والذکر فی العلیۃ وقال محمد بن سبیب ان یسوی بینہم علی حسب الموارثت للذکر مثل خط الانثیین و وجہ انہ لومات ولم یوطا مستحقو المال علی ہذا سبیل



خلاف ہو گا وہ باطل ہو گا۔

”واپس لے لو“ (فارجه) اگر ہبہ غلام کا بھروسہ لڑکوں کے جائز ہوتا تو آنحضرتؐ ہبہ کے واپس لینے کا حکم نہ دیتے۔ ہبہ شرعاً باطل تھا۔ جب ہی اس کی واپسی کا حکم دیا۔  
 ”اللہ سے ڈرو اور اپنے لڑکوں میں عدل کرو“ (اتقوا اللہ واعدوا بین اولادکم) انقا کے ساتھ یہاں عدل کو عطف کیا ہے۔ یعنی اللہ سے ڈرنا جس طرح واجب ہے اسی طرح لڑکوں میں عدل کرنا واجب ہے۔ احکام شرعیہ سے فقہی مسائل اخذ کرنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ اس قول میں کتنا زور ہے۔

حدیث میں نعمان کا بیان بھی منقول ہے۔ اس نے کہا: پھر میرے باپ نے وہ وہ عمدتہ واپس لے لیا۔ (فرج ابی فی تلک الصدقۃ) اصطلاح شرع میں ہبہ۔ نخل اور عطیہ اور کبھی کبھی صدقہ ایک ہی شے ہے۔ بشر انصار سے تھے۔ عربی زبان خوب سمجھتے تھے۔ انھوں نے ہبہ کو ناجائز سمجھ کر غلام واپس لے لیا۔

سالف سے ایک قول منقول ہے کہ آنحضرتؐ نے دو مرتبہ کہا کہ ”اپنی اولاد میں عدل کرو“ (اعدوا فی اولادکم) اصول میں یہ بات مان لی گئی ہے کہ کسی شے کا حکم دینا اسکی کی ضد کا منع کرنا ہے اور کسی شے کی ممانعت ہو نہیں سکتی جب تک وہ فاسد نہ ہو۔ (الامر بالشیئ ہی عن ضدہ والنہی عن الشیئ لیتلزم الفساد والمراد للبطلان)۔ فاسد اور باطل ایک ہی معنی میں ہیں۔

”اس پر میرے سوا دوسرے کو گواہ کرو۔“ (اشہد علیہ غیری) بس یہی قول ہے جسکی بنا پر یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ ہبہ باطل کا لعدم ہوتا تو آنحضرتؐ یہ نہ کہتے کہ دوسرے کو گواہ کرو۔ اول تو یہ کہ قول ضعیف ہے۔ یہی قول کیوں مرجح سمجھا جاوے اور اگر بالفرض آنحضرتؐ نے ایسا کہا تو اس سے جواز ہبہ تو پیدا نہیں ہوتا۔ ممانعت، تخویف، تحذیر اور تحدید کا مضمون البتہ پیدا ہوتا ہے۔

محمد ابن منصور جامع میں کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے جو کہا کہ ”میرے سوا کسی دوسرے کو گواہ کرو۔“ اس سے دوسرے کو گواہ کرنے کا حکم نہیں نکلتا۔ بلکہ اس سے محض تہدید علی سبیل الانکار مقصود ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ قرآن میں کہتا ہے۔ جو چاہو تم کہو۔ سچ ہے خدا کفار سے کہتا ہے کہ تم جو چاہو کرو اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ خدا نے کفر کو جائز رکھا ہے۔



اور اس کے کرنے کا حکم دیا ہے۔

۱۰ اپنی اولاد میں مساوات رکھو: (سادوا بین اولادکم فی العطیہ) اس سے حکم پیدا ہے۔

۱۱ ایسی ہیبت میں صلاحیت شرعیہ نہیں ہے (فان ہذا لیسخ) جس میں شرعی صلاحیت نہیں

وہ باطل ہے۔

۱۲ تجھ کو تو بھلا معلوم ہو گا کہ اولاد تیری اطاعت میں مادی ہوں: (الیسرک ان یکووا فی البر

سواؤ) اس سے مقصود آنحضرتؐ کا یہ تھا کہ اولاد میں تفضیل کرنا سبب انکے حقوق یعنی نافرمانی

کا ہو گا۔ حقوق اکبر کباڑ ہے اور اکبر کباڑ کا جو باعث ہو وہ ضرور البطل باطلات اور احرام محرمات

ہو گا۔

۱۳ میں فضیلت دیتا تو لڑکیوں کو فضیلت دیتا: (لو کنت مفضلاً لفضلت البنات) اور

عربی قاعدے سے اس کا مفہوم یہ ہوا۔

میں کسی کو ترجیح نہیں دیتا اس لئے لڑکیوں کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ (لکنی لا افضل احداً فلا

افضل البنات) اس سے تفصیل کی نفی اور بطلان کی دلیل صریح واضح ہے۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ جو رائے میں نے ظاہر کی ہے وہ میری رائے ہے۔ نعمان بن بشیر کی حدیث

سے اور شرع محمدی کے اعتدال اور اصول پر نظر کر کے بہت سے اکابر نے یہی رائے ظاہر

کی ہے کہ اولاد میں ہیبت کے وقت مساوات کا خیال رکھنا واجب ہے اور جس ہیبت میں مساوات

بین الاولاد نہ ہو وہ کالعدم اور باطل ہے۔

میں یہاں پر علامہ محمد ابن اسمعیل امیر میمانی کی کتاب سبل السلام فی شرح بلوغ المرام مطبوعہ

مطبع فاروقی دہلی ۱۳۰۷ھ کا صفحہ ۴۸ کا ترجمہ نقل کرتا ہوں۔

”باب ہیبت۔ حدیث اول نعمان بن بشیر سے روایت ہے۔ اس کا باپ نبی صلی اللہ

علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں نے اپنے اس بیٹے (نعمان) کو اپنا یہ غلام دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ اپنی تمام اولاد کو تم نے یوں ہی دیا ہے

بشیر نے کہا نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا۔ ہیبت واپس لے لو۔ اور

ایک روایت میں نعمان کا بیان ہے کہ میرا باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

پاس پہنچا کہ آنحضرتؐ کو اس ہیبت پر گواہ کرے۔ آنحضرتؐ نے پوچھا ایسا ہی ہیبت

۱۴ باب ہیبت۔ الحدیث الاول۔ عن النعمان بن بشیر ان اباه انی انبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال ان نخلت (باقی ۴۷ پر)



تمام اولاد کے حق میں کیا ہے۔ میرے باپ نے کہا نہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے حق میں عدل کرو۔ پھر میرا باپ واپس آیا اور وہ ہبہ پھیر لیا۔

اس پر سب کا اتفاق ہے اور مسلم کی ایک روایت ہے کہ :-  
آنحضرتؐ نے فرمایا :- میرے سوا کسی اور کو گواہ کرو اور پھر فرمایا تمکو اچھا معلوم ہوگا کہ سب اولاد بدرجہ مساوی اطاعت کرے۔ بشیر نے کہا۔ ہاں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تم عدل نہ کرو گے تو وہ اطاعت بھی نہ کرے گی :-

یہ اصل حدیث کی عبارت ہوئی۔ اس پر علامہ یحییٰ رحمۃ اللہ تعالیٰ شرح لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہبہ کرنے میں تمام اولاد کو مساوی درجہ میں رکھنا واجب ہے اور بخاری نے بھی ایسی ہی صراحت کی ہے۔ احمد اور اسحاق وغیرہ کی بھی یہی رائے ہے اور یہ بھی پیدا ہے کہ جس ہبہ میں مساوات بین الاولاد نہ ہو وہ باطل ہے۔ الفاظ حدیث دیکھو۔  
آنحضرتؐ کا حکم دینا کہ ہبہ واپس لے لو اور پھر فرماتا کہ اللہ سے ڈرو۔ اولاد کے درمیان عدل

انہی ہذا فلاناً کان لی فقال رسول اللہ صلی علیہ وسلم اکل ولدک نحلته مثل ہذا فقال لا فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فارجعہ و فی لفظاً فانطلق ابی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لیشہدہ علی صدقتی فقال افعلت ہذا بولدک کلہم قال لا قال فالتقوا اللہ واعدوا لہا بین اولادکم فرجع ابی فر و تک الصدقة متفق علیہ و فی روایتہ المسلم قال فاشہد علی ہذا غیری ثم قال الیرک ان یقولوا لک فی البر سوار قال بلی قال فلا اذن الحدیث دلیل علی وجوب المساواة بین الاولاد فی الہبتہ وقد صرح بہ البخاری و ہو قول احمد و اسحق و آخرین وانہا باطلہ مع عدم المساواة و ہو الذی یفیدہ الفاظ الحدیث من امرہ صلی اللہ علیہ وسلم بار جاعہ قیلہ التقوا اللہ و قولہ اعدوا بین اولادکم و قولہ فلا اذن و قولہ لا اشہد علی جور و اختلف فی کیفیۃ التسویۃ فقبل بان تكون عطیۃ الذکر و انثی سوار دہو ظاہر قولہ فی بعض الفاظ عند النساء فی الاسویۃ بینہم و عند ابن جبان سودا بینہم و الحدیث ابن عباس سودا بین اولادکم فی العطیۃ فلو کنت مفضلاً احد الفضلت النساء فرجہ سعید بن منصور و البیہقی باسناد حسن و قبل التسویۃ ان یجبل للذکر مثل خط الایمین علی حب التوریت و وہب الجہور الی انہا لا یجیب التسویۃ بل تندب و اطلوا فی الاعتدال من الحدیث ذکر فی الشرح عشرۃ اعدار کلہا غیرنا ہفتہ و قد کتبنا فی ذلک رسالہ جواب سوال و اصحافہا قوۃ القول بوجوب التسویۃ وان الہبتہ مع عدہا باطلہ



کرد۔ آپ کا فرمانا۔ تو وہ اطاعت بھی نہ کریں گے۔ آپ کا ارشاد کہ میں ظلم پر گواہ نہیں ہوتا ان سب سے یہی پیدا ہے۔ ہاں مساوات کی صورت میں البتہ اختلاف ہے۔ بعضوں نے کہا کہ مرد اور عورت کو برابر دینا چاہیے۔ کیونکہ حدیث کے الفاظ صریح یہی معنی رکھتے ہیں۔ مثلاً نسائی کے نزدیک عبارت یہ ہے: کیا تو نے اولاد میں مساوات نہیں رکھی؟ ابن جہان کے نزدیک آنحضرت کا قول یہ ہے: اولاد میں مساوات رکھو۔ ابن عباس کی حدیث یوں مشہور ہے کہ: اپنی اولاد میں تسویہ (برابری) رکھو۔ اگر کسی کو میں فضیلت دیتا تو عورتوں کو فضیلت دیتا۔ سعید بن منصور اور بیہقی نے باسناد حسن یہ نقل کیا ہے۔ اور بعضوں کی رائے ہے کہ تسویہ یوں ہونا چاہیے کہ مردوں کو حالت ہبہ میں دو عورتوں کے برابر دیا جائے جیسا کہ توریت کی حالت میں حصہ ملتا ہے اور بہت سے لوگوں کی یہ رائے بھی ہے کہ تسویہ واجب نہیں ہے بہتر ہے حدیث میں انہوں نے تاویل کی ہیں اور دس جہتیں لکھی ہیں۔ جن میں ایک بھی معقول نہیں ہے۔ میں نے اس باب میں ایک رسالہ بطور سوال و جواب کے لکھا ہے اور خوب توضیح سے ثابت کیا ہے کہ وجوب تسویہ کی رائے قوی تر ہے اور جس ہبہ میں تسویہ نہ ہو وہ باطل ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ دیگر بلاد اسلام میں ہبہ بین الا اولاد میں غیر مساوات محبت کے کم و بیش ہونے کی وجہ سے ہوگی اور علماء نے اسی خیال سے اس کو غیر مدوح یا باطل ٹھہرایا ہوگا۔ ہندوستانی مسلمان جو اپنی لڑکیوں سے محبت رکھتے ہیں لڑکوں سے ناخوش رہتے ہیں اور پھر یہ چاہتے ہیں کہ لڑکے ان کا ترکہ پائیں اور لڑکیاں نہ پائیں۔ وہ عورتوں کے حقوق کو جو قرآن میں مقرر ہیں خلاف عقل سمجھتے ہیں اور اس طرح خدا کے کلام کو خلاف حکمت جانتے ہیں اور خدا کو حکیم مطلق نہیں سمجھتے اور اس طرح ان کو ضد ہے کہ ان کے خاندان میں وراثت قرآن مجید کے مطابق جاری نہ ہو۔ اگر یہ صورت ان علماء کے سامنے پیش ہوتی تو وہ ہبہ کے باطل ٹھہرنے پر اکتفا نہ کرتے بلکہ واہب کے مرتد دین اسلام سے پھرنے والا ہو جانے کا بھی فتویٰ سناتے۔

شرع محمدی جس اصول پر مبنی ہے اس کا مقتضا بھی یہ ہے کہ ایسی ہبہ میں مساوات واجب ہو جن گھروں میں باپ اپنی اولاد کے ساتھ مساوات کا خیال نہیں رکھتا وہاں اولاد بھی باپ کی اطاعت دل سے نہیں کرتی۔ علماء نے لکھا ہے کہ: پھر یہ ترتیب منزل کی خرابی کا باعث ہوگا، میں کہتا ہوں کہ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بھائیوں میں اور بھائی بہنوں میں اور انکی اولاد میں



ہمیشہ کے لئے باہم ایک دوسرے سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ اس سے قومی نفاق کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور پھر نہایت خراب اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ہندوؤں کی حالت بلکہ اچھی ہے جہاں لڑکیاں جانتی ہیں کہ وہ شاسترا محروم ہیں۔ لیکن مسلمانوں میں جب یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ باپ کے مرنے پر لڑکیاں ضرور ترکہ پائیں گی۔ باپ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وصیت کے ذریعہ سے ان کو محروم کرے تو لڑکیاں ایک حق اپنا پیدا سمجھتی ہیں۔ اب اگر باپ کو اجازت دی جائے کہ وہ دوسرے ورثا کے حق میں ہبہ کر کے اپنی لڑکی کو محروم کرے تو اس سے خواہ مخواہ لڑکی کو شکوہ کا موقع ہوگا۔ امید ہی پیدا ہو جانے سے تو شکوہ کا موقع ہوتا ہے۔ شکوہ اکثر نفرت اور عداوت کا باعث ہوتا ہے۔ باپ کو وصیت سے روک کر یوں ہبہ کی اجازت دینا گویا اس کو جھوٹی کارروائی کرنے کی اجازت دینا ہے۔ اور یہ اور بھی برا ہے۔ غیر مساوی ہبہ کے عدم جواز کا حکم نہ ہوتا جب بھی یہ قیاس ہونا چاہیے تھا کہ ہبہ غیر مساوی مصالحت شرعی کے خلاف ہونے کی وجہ سے باطل ہے۔ لیکن یہاں تو صریح حدیث نبویؐ موجود ہے نہ اس میں تاویل کی گنجائش ہے اور نہ کچھ بھی پس و پیش کا موقع ہے۔

ہندوؤں کا یہ قانون ہے کہ باپ اپنے بیٹوں کی مرضی کے بغیر کسی کو خاندانی جائیداد نہیں دے سکتا اگر دے تو ایسا دینا کالعدم ہے۔ یہ مسئلہ شاستر کا انگریزی عدالتوں میں بہت زیادہ بارونق کر دیا گیا ہے۔ اب عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ باپ کے حقوق محدود ہیں۔ اس درجہ باپ کو محدود حالت میں رکھنا مسلمانوں کے اصول شرعی میں کسی طرح مستحسن نہیں سمجھا جاسکتا لیکن ایک اولاد کو یہ محرومی دوہری اولاد کے کچھ دینا بہت ہی برے جیسا اوپر بیان کیا گیا۔ اور عقل بھی کہتی ہے کہ یہ ممانعت نہایت ہی عدل اور انصاف پر مبنی ہے۔ ہم اپنی اس تحریر میں قوم کے دو مجتہد مسٹر جسٹس امیر علی اور مسٹر جسٹس بد الدین طیب جی قاضیان وقت کو توجہ دلاتے ہیں کہ اگر ان کے نزدیک محدثین کی رائیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں صحیح ہیں تو وہ کیوں اس امر کی کوشش نہ کریں کہ اس مسئلہ شرع کا نفاذ ہو اور باپ کے اختیارات اس بارہ میں محدود کئے جائیں بالخصوص ایسی حالت میں کہ عورتوں کے حقوق کی طرف سے مسلمان چشم پوشی کرتے جاتے ہیں اور ایسا ہبہ جس کا مقصد اولاد اناث کی محرومی ہے زیادہ تر رواج پکڑتا جا رہا ہے مسلمان قوم کو قوم کی حالت درست کرنا چاہیے اور قرآن اور حدیث کے مطابق اصلاح کی صورت سوچنا چاہیے قرآن و حدیث میں صرف اصول بیان کئے گئے ہیں ان سے ضرورت کے وقت مسائل اخذ کرنے کا کام مجتہدوں اور قاضیوں کا ہے۔ ججوں کو بھی قانون بنانے کا اختیار دیا گیا ہے۔ ہندوستان میں جہاں تمام عدالتیں محض عدالت انصاف ہیں ججوں کے اختیارات اور بھی وسیع رکھے گئے ہیں۔ جس زملے میں صرف اولاد



گی نافرمانی محرومی ارث کا سبب ہو سکتی ہے۔ باپ کے حقوق میں نعمان ابن بشیر کی حدیث کی وجہ سے دست اندازی کرنا فقہاء ضروری نہیں سمجھے لیکن اب کہ حقوق نساء پر حملے ہوتے ہیں اور شرع محمدی کے مسائل سے غلط طور پر ورثائے جائز کو نقصان پہنچانے کے خیالات پیدا ہوتے ہیں فقہاء کو وہ حدیث نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ جس طرح گورنمنٹ دختر کشی بند کرنے کی نسبت اور رسم سستی مٹانے کی بابت احکام جاری کرنا اپنا فرض سمجھی اسی طرح قاضیان و مفتیان وقت نعمان ابن بشیر کی حدیث کے مطابق اس وقت فتویٰ دینا ناگزیر سمجھیں تو کہیں سے شرعی قباحت نظر نہیں آتی۔



## فصل نمبر ۳۲

### وقف بکار خیر

وقف کو زیادہ تر ملکی اور اخلاقی معاملات سے تعلق ہے اور اس کا تذکرہ باب اول میں ہو سکتا تھا۔ لیکن وقف کبھی وصیت کی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی ہبہ کی صورت میں اس لئے وصیت اور ہبہ کے بعد اس کا بیان کرنا مناسب سمجھا گیا۔ صدقہ اور زکوٰۃ کے متعلق فصل ہفتم میں کہا گیا ہے کہ مفت دینا ہو تو اقربا اور پڑوسیوں کو دینا چاہیے۔ یہاں تک کہ ابو طلحہؓ نے ایک باغ اہل صدقہ کو خرچ کے لئے دینا چاہا تو آنحضرتؐ نے کہا کہ اپنے اقربا کو دو کہ زیادہ تر مستحق وہ ہیں۔ پھر دوسری جگہ پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ تبوک میں سامان فوج درست کرنے کے لئے جب چندہ کیا گیا تو حضرت عثمانؓ نے وہ سب کا سب مال دیدیا جسکو وہ تجارت کے لئے شام کی طرف بھیجنے والے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے وہ تمام مال دیدیا جو اس وقت ان کے گھر میں تھا اور کہا کہ ہاں بچے خدا کے سپرد کر دیئے اور حضرت عمرؓ نے اپنی آدھی دولت حوالے کر دی یہ چندہ نہایت خوشی سے آنحضرتؐ نے قبول فرمایا۔ ان امور سے صاف اور صریح طور پر عیاں ہے کہ موقع اور محل کو ہر وقت دیکھنا چاہیے اور نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ قومی کام مسلمانوں میں بہت زیادہ باوقوت نظر آتا ہے "شرکت کاروبار" (فصل ۳۲) میں ظاہر کیا گیا ہے کہ مسلمانوں میں شخصی معاملات اور قومی معاملات دو مختلف اصولوں پر مبنی تھے اور اس سے ان کو ترقی کے میدان میں بہت کچھ مدد ملتی تھی۔ وہیں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ مسلمانوں میں قومی خیالات بہت زیادہ تھے اور بغیر اس کے وہ اس درجہ پر نہیں پہنچ سکتے تھے جس پر پہنچے تھے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ بادشاہوں کی سلطوت اور سیاست اراکین دولت کو مطیع رکھتی تھی اور اس لئے حکومت کا ڈھچر ڈھیلا نہیں ہونے پاتا تھا یہ خیال بالکل



غلط ہے۔ اراکین دولت اور دوردور کے گورنروں اور صوبیداروں اور دیگر حکام ماتحت کو قومی خیال اتنا تھا کہ کہیں سے سرکشی کا وہم بھی دلوں میں نہیں آتا تھا۔ یہ امر قابل حیرت ہے کہ تین چار سو برس تک یورپ سے پچھم تک تمام اچھے حصے دنیا کے عربوں کے قبضے میں تھے اور ان عربوں نے ہمیشہ ایک بادشاہ کے زیر فرمان رہنا پسند کیا۔ اس حیرت افزا مثال سے زیادہ اور کیا ثبوت عربوں کے قومی خیالات کا ہو سکتا ہے۔ جس طرح عربوں نے ملکی معاملات میں اپنی قومی حالت دکھائی ہے اسی طرح انھوں نے اخلاقی حالت میں بھی بے مثل نمونہ دکھایا ہے۔ ان کے زمانہ عروج میں بڑے بڑے حنات اور خیرات کے کام ان کے ذریعہ سے قائم تھے اور گویا کار خیر کو وسیع پیمانے پر وقف کے ذریعہ سے قائم کرنا مسلمانوں کے زمانے میں مکمل ہو اور نہ اس سے قبل بجز عبادت گاہوں کے کوئی چیز دنیا میں کسی قوم اور کسی ملت کے نزدیک موقوفہ نہیں سمجھی جاتی تھی اور نہ عبادت گاہوں کے قائم رہنے کے لئے ان میں کوئی قانون یا کوئی آئین تھا۔ عبادت گاہوں پر لوگ مال اسباب اور جائیداد چڑھاتے تھے۔ اور کوئی شخص مذہبی خیال سے اس میں دست اندازی پسند نہیں کرتا تھا۔ بس جو کچھ تھا اتنا ہی تھا۔ ہنری ہفتم شاہ انگلستان نے جب انگلستان کی خالقاہیں اور ان کے ساتھ کی جائیدادوں کو ضبط کرنا چاہا تو کوئی قانون اس کا مانع نہ تھا صرف عوام کی بددلی اسے کچھ روز تک ڈراتی رہی اور پھر اس کی حکمت عملیوں اور درازدستیوں نے اس کا بھی خیال نہیں کیا۔

۴

اس مقام پر تاریخی حالات لکھنے نہیں ہیں احکام وقف بیان کرنے ہیں جو با اعتبار اصول کے بہت مختصر ہیں۔ صرف اتنا جاننا کافی ہے کہ جس طرح ہر ایک مسلمان اپنی تمام جائیداد کا ہبہ دوسروں کے حق میں کر سکتا ہے ہندوؤں کی طرح اس کی خود مختاری لڑکوں یا دوسرے اہالی خاندان کی مرضی پر موقوف نہیں ہے اسی طرح وہ اپنی کل جائیداد کو عوام یا پبلک کے حق میں بھی وقف کر سکتا ہے لیکن اگر وقف کرنے کا یہ منشاء ہے کہ وقف کرنے والا جیتے جی مختار کل بنا رہے اور اس کے بعد عوام کو مداخلت کا حق ہو تو ایسے وقف سے وصیت کے احکام متعلق ہوں گے۔ اور صرف ایک ثلث تک وقف نافذ ہوگا۔ یہ مسئلہ عام اصول الفضاہ پر مبنی ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ اپنے ورثائے شرعی کو ایک ثلث ترکہ سے زیادہ کی نسبت محروم کرے۔ ہندوستان میں جہاں تمام باتیں نام کے لئے ہیں وہاں وقف کا مسئلہ بھی برائے نام جاری ہے۔ زیادہ تر تو یہ ہوتا ہے کہ جب مرنے کے دن قریب ہوئے۔ تو مالک جائیداد کو یہ خیال گزرا کہ جائیداد خاندان سے باہر نہ جائے اور نہ وارثوں کی بدچلنیوں سے مہاجنوں کے پاس جائے اس لئے اس نے اپنی جائیداد کا وقف نامہ تحریر کیا اور وقف نامہ میں یہ



لکھا کہ جیتے جی واقف مختار کل ہے اور اس کے بعد اولاد ذکور میں سے سب سے بڑا لڑکا مہتمم ہوگا اور آمدنی اولاد ذکور میں بجز مساوی تقسیم ہوگی۔ اولاد اناث کو کچھ نہ ملے گا اور اگر یہ خیال آیا کہ کار خیر بھی کچھ لکھ دینا چاہیے تو یہ لکھ دیا کہ مہتمم کو چاہیے کہ دروازے پر جو مسجد ہے اس میں ایک پیسہ روز کا تیل روشنی کیلئے ضرور دیا کرے ایسا وقف شرعاً کالعدم ہوتا ہے۔ برٹس گورنمنٹ کی حکومت میں خدا دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے کہ اسکی بدولت ایسے اوقات پر یومی کونسل تک کالعدم قرار پائے اور شرع محمدی کی شرم رہ گئی۔ ناعقبت اندیش خود غرضوں کی بدولت اس کی توہین نہیں ہونے پائی۔



## فصل نمبر ۳۸

### نکاح

اسلام میں نکاح نہ تو ہندوؤں کی طرح کوئی مذہبی رسم ہے اور نہ دیگر قوموں کی طرح گلے کی پھالشی ہے۔ بے تو والد اور تناسل کے انتظام عالم قائم نہیں رہ سکتا اس لئے فطرت نے مردوں کو عورتوں کا اور عورتوں کو مردوں کا خلقتاً شیدا بنا دیا ہے۔ مردوں کو عورتوں کی طرف اور عورتوں کو مردوں کی طرف مائل کرنے میں جو جنون، فریفتگی، بدحواسی یا سراسیمگی پیدا ہوتی ہے اس سے بہت بڑا سبق خالق عالم کی صنایعوں کا حاصل ہوتا ہے۔ یہاں قانون قدرت کی تشریح کرنا نہیں ہے بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ اگر خلقت میں کوئی نقص ہے نہیں ہے تو مرد عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا اور نہ عورت بے مرد کے چین سے رہ سکتی ہے اور دونوں کی یکجائی ناگزیر ٹھہرتی ہے اس یکجائی کی نوعیت دوہی قسم کی ہو سکتی ہے۔ عورتیں مرد کی ہو کر رہیں یا حیوانات کے سے تعلق رکھیں کہ غرض حاصل ہوئی کہ جدائی ہو گئی۔ پھلی صورت زنا ہے۔ دوسری صورت نکاح ہے۔ زنا فی الواقع ایک نہایت برا فعل ہے جسکی پوری توضیح "زنا" (فصل ۲۲) میں کی گئی ہے۔ یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اس معنوں کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے اسے ضرور دیکھ لینا چاہیے۔ اب یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ زنا سے بچنا اور پھر فطرت کے اقتضا کو بھی پامال نہ ہونے دینا بس اسی کا نام نکاح ہے۔ نکاح کی صورتیں مذہب، مدت، ملکی رواج اور قومی خصائل کے اعتبار سے مختلف ہیں۔

ہندوؤں میں مذہبی رسم ہونے کی وجہ سے بچوں کا بیاہ گڈا گڈی کے بیاہ سے زیادہ ہرگز نہیں ہے۔ یورپ میں عمر کا بہترین حصہ گزر جانے پر نکاح ہوتا ہے۔ حیرت خندان معیوب نہیں ہے جتنا یہ امر نا پسندیدہ ہے کہ وہاں دیکھ بھال میں ضرورت سے زائد آزادی برتی جاتی ہے۔ ہند کے مسلمانوں



کی تو کوئی سند نہیں لیکن انکی مذہبی کتاب اور علمائے مذہب کے طرز عمل سے یہ بات پائی جاتی ہے کہ گوباپ صفر سنی میں بھی اپنے بچوں کو بیاہ سکتا ہے لیکن سن شعور کو پہنچنے کے بعد بیاہ کا ہونا زیادہ تر پسندیدہ ہے اور ایسا ہی ہوتا بھی ہے۔ باہمی پسند کے لئے شرع میں دور سے دیکھ بھال لینے کی بھی اجازت ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اعتدال شرع محمدی کا ضرور قابل پسند ہے۔

صفر سنی کی شادی کا عام طور پر رواج دینا یا ایسے نکاحوں کو چاہے وہ کیسے ہی مصلحت پر مبنی ہوں بالکل ہی ناجائز قرار دیتا۔ عمر کا اتنا بڑھا دینا کہ اخلاق مذمومہ اپنا گھر کر لیں۔ پسند کے متعلق فریقین کی مطلق عنانی کی کوئی حد نہ ہو یہ باتیں ایسی نہیں ہیں کہ انکی برائیاں بیان کی جائیں جب ہی سمجھ میں آئیں ہاں ایک بات ضرور قابل لحاظ ہے کہ زن و شو کی ناموافقیت تمام برائیوں پر بالا ہے انتظام عالم میں جس قدر اس سے فتور پڑتا ہے کسی چیز سے نہیں پڑتا۔ مسلمانوں میں نکاح کی غرض سے باہم ایک دوسرے کا دیکھنا گوارا ہے۔ مگر اتنا نہیں کہ ایک دوسرے کے حسن و قبح سے بخوبی واقف ہو جائے۔ اور آئندہ کے لئے تمدنی خرابیوں کی روک تھام ہو ان خرابیوں کے رفع کرنے کے لئے مسلمانوں نے طلاق اور خلع کی آزادی عطا کی اور یورپین قوموں نے اپنی تہذیب کے زمانے میں کورٹ شپ کی آزادی روار کھی لیکن یہ دونوں طریقے نامحود ہیں۔ لیکن مجبوری ہے کہ بغیر ان کے چارہ نہیں ہے طلاق اور خلع کی آزادی سے کورٹ شپ کی آزادی ضرور بری ہے لیکن ہندوستان میں جو یہ طریقہ جاری ہے کہ ایک طرف طلاق اور خلع کی ممانعت ہے دوسری طرف صفر سنی کی شادی کا رواج ہے۔ کبر سنی میں بھی بیاہ ہوا تو ایک کو نہ دوسرے کے دیکھنے کی اجازت ہوتی اور نہ اپنی آواز نہ رائے ظاہر کرنے کا حکم ہوتا۔ اس برے طریقہ مناکحت سے کورٹ شپ کا طریقہ بہر حال اچھلے ہے۔

### ہندوستان کے مسلمانوں میں شادی بیاہ

مسلمانوں میں نہ تو عیسائیوں کی طرح چرچ۔ پادری۔ رجسٹری اور سرٹیفکٹ کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہندوؤں کی طرح بین کھٹراگ کا نام بیاہ ہے۔ دو گواہوں کے سامنے فریقین یا دکلے فریقین نے ایجاب و قبول کیا اور نکاح ہو گیا۔ پھر لازمی ہے لیکن منہ سے اس کا اقرار بھی ضروری نہیں ہے وہ از خود واجب ہو جاتا ہے۔ لیکن صریح قرار دیا ہو جائے تو اچھا ہے۔ پیغمبر خدا نے حضرت علیؑ کے نکاح میں خدا کی تمجید کی تھی۔ نکاح کی ضرورت اور مقدرات باری تعالیٰ کی توضیح کی تھی وہ وقت اور تھا۔ ضرورت اور تھی۔ لیکن سنت نبویؐ کے لحاظ سے وہ خطبہ ہر نکاح میں پڑھ لیا



جائے تو اچھلے۔

آجکل ہندوستان کے مسلمانوں میں جو طریقہ نکاح کا رائج ہے اس میں عشوہ و زوائد کو بہت دخل ہے شرعی نکاح یا مسنون نکاح میں بہت سادگی ہونا چاہیے۔ ذرا بھی لغویات کو دخل ہوگا تو مسنون طریقہ جاتا رہے گا۔ ناپ اور گانا نکاح سے ایک جدا شے ہے۔ بیاہ کو اس کے ہونے نہ ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا وجود لہو و لعب میں داخل کیا جائے گا اور یہ نہ ہوگا تو کہا جائے گا کہ لہو و لعب کو دخل نہ تھا۔ لیکن نکاح کو مسنون طریقہ سے انجام دینے کے لئے تمام باتوں میں سنت نبوی کی تقلید ضروری ہے۔ رسول اور صحابہؓ کے زمانے میں جس طرح عقد نکاح ہوتا تھا وہ سیر کی کتابوں سے ظاہر ہے اگر اس سے کچھ زیادہ اہتمام کیا جائے گا تو رسول اللہ کی پیروی باقی نہیں رہے گی۔

بیاہ میں کھانا کھلانے کا بھی دستور شرع سے ہے۔ لیکن وہ اس طرح سے ہے کہ دو لہا اپنے اجباب کی ضیافت کرتا ہے اس کھانے کو اصطلاح شرع میں طعام ولیمہ کہتے ہیں۔ پانچ سو یا ہزار دو ہزار چار ہزار آدمی دلہن کے گھر براتی بن کر کھانا کھانے کے لئے جائیں اور بغیر اس جماعت کے بیاہ ہو ہی نہ سکے اس کا وجود کہیں بھی مسلمانوں کی قدیم تاریخ میں نہیں پایا جاتا اور نہ اب بھی دیگر بلاد اسلام میں کہیں اس کا چرچا پایا جاتا ہے۔

راجپوت کبھی بہ جبر بیاہ کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ عورتیں لڑ کر چھین لاتے تھے۔ اجنبی خاندانوں میں ہنود عموماً بیاہ کرتے ہیں اور اس لئے بہت سے نزاعی امور طے کرنے کے لئے دو لہا کے ساتھ ایک جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اجنبی خاندانوں میں دور دور شادیاں ہونے سے سفر دراز کرنا ہوتا ہے اور راہ کے مخدوش ہونے کی حالت میں براتی بن کر ساتھ جانا گویا ایک قسم کی قومی مدد ہے اب اس زمانے میں ہندوؤں کے لئے بھی براتے جانا افضل سا ہو گیا ہے اور مسلمانوں کے لئے انکی تقلید کسی زمانہ میں مناسب حال نہ تھی اور اب تو شرعی برائیوں کے علاوہ جہالت کی بو آتی ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ ایک مسلمان سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کی جماعت کے ساتھ اول اول سسرال میں قدم رکھنے کا کیا مطلب سمجھ سکتا ہے اس بری رسم نے مسلمانوں کے گھروں میں ایسی مضبوط جڑ پکڑی ہے کہ باسانی جاتی ہوئی نظر نہیں آتی اس جہالت کی بھی کوئی انتہا ہے کہ دو حقیقی بھائی باہم سمدھی ہونا چاہیں تو یہ لازم ہوگا کہ بیٹے والا ہزاروں آدمی راہ چلتے جن سے کبھی کی رسم نہیں اس لئے جمع کرے کہ وہ دوسرے بھائی کے گھر پر دھاوا کریں اور پھر یہ غیر ممکن ہے کہ ان ناخواندہ مہمانوں کے کھلانے پلانے میں دونوں حقیقی بھائی آپس میں لڑنے جائیں۔ تجربہ سے دیکھا گیا ہے کہ کوئی برات ایسی نہیں ہوتی کہ سمدھیوں میں شکر رنجی نہ ہوتی ہو۔ رسم و رواج کی پابندیوں



میں یہی تو برائی ہے کہ آزادی جاتی رہتی ہے۔ سچی خوشی مفقود ہوتی ہے اور دلوں میں کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں افسوس کہ بیاہ شادی میں برات لے جانے کی رسم بند نہیں ہوتی۔ قوم نے سمجھ لیا ہے کہ بیٹی پیدا کرنے کے جرم میں اس کے بیاہ کے دن سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کو ضرور کھلانا پڑے گا اور کھانے والوں کی تعداد کھلانے والوں کی مرضی پر منحصر نہ ہوگی بلکہ ایک غیر شخص کا یہ کام ہوگا کہ جتنے آدمیوں کو چاہے مدعو کرے۔ یہ نئی قسم کا کفارہ گناہ ہے جس کا ذکر کہیں فقہ کی کتابوں میں نہیں ہے اور ایک نئی قسم کی دعوت ہے جس کا تذکرہ کسی اخلاقی کتاب میں نہیں پایا جاتا۔

گو شرع کے مطابق مراتب ایجاب و قبول اب بھی نہایت سیدھے سادھے طور پر ادا ہوتے ہیں لیکن زن و شو کی مقاربت سے پہلے عورتیں وہ تمام رسمیں پوری کر لیتی ہیں جو ہندوؤں کے فیض صحبت سے ان میں پیدا ہوئی ہیں۔ اس غلط فہمی میں اکثر اصحاب گرفتار دیکھے گئے کہ باہر ناچنا گانا نہ ہوا اور اندر سب کچھ ہوا تو وہ سمجھے کہ شرعی نکاح ہوا۔ اندرون خانہ جو رسمیں ادا ہوتی ہیں ان کو بالتفصیل دیکھنا ہو تو جو کتاب مولوی علی امام بیرسٹر پٹنہ کی بہن کی تصنیف شائع ہوئی ہے اسے پڑھنا چاہیے اور اس کے پڑھنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس کے گھر کیا ہوتا ہے۔ مرد عورتوں کے مقابلہ میں خود کو کیوں مجبور محض سمجھتے ہیں؟ بعض جگہ تو عورتیں ناحق بدنام کی جاتی ہیں۔ عورتوں سے زیادہ مرد رسم درواج کے بندے ہوتے ہیں۔

اگر سیدھے سادے طور پر نکاح کیا جائے تو تین فائدے صریح پیدا ہوں گے۔ اول مذہبی خیال سے خدا خوش ہوگا۔ دوم زحمتوں سے نجات ہوگی۔ سوم زیر باری سے چھٹکارا ہوگا۔ خدا کی خوشی کی نسبت کچھ لکھنا فضول ہے منہ سے تو خدا کی خوشی سب ہی چاہتے ہیں۔ لیکن ایسے بہت کم دیکھے گئے ہیں جو خدا کا خوش کرنا دل سے چاہتے ہوں۔ اور جو حضرات ایسے ہیں کیونکہ زمانہ اچھوں سے خالی نہیں ہے ان کو اس تحریر سے بے نیازی ہے۔ ان کو کسی کے کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ہر وقت خیال کرتے رہتے ہیں کہ ان کے افعال اور اعمال سنت نبوی سے نہ زیادہ ہوں اور نہ کم ہوں۔

شادی بیاہ کی زحمتوں کی نسبت ایک حکیم صاحب کے مقولات سننے کے قابل ہیں

بھٹی لڑکا بالغ ہوا اور نسبت بھی پکی ہو گئی۔ لیکن شادی بیاہ کے کھڑاگ سے میرا جی گھبراتا ہے ہزار پانچ سو روپیہ کوئی مجھ سے لے کر پانی میں پھینک دے تو مجھے منظور ہے لیکن یہ منظور نہیں ہے کہ چار پھینے کے لئے اپنے ضروری کام چھوڑ کر گھر پر بیٹھوں اور سامان کرنا شروع کروں۔ جن صاحبوں نے یہ درد سر خریدا ہے ان کی صحت میرے سامنے ہے۔ ایک آدمی لکڑی کٹوانے کو تعینات ہے۔ سو کھی لکڑی ملتی



نہیں گیلا درخت کے ٹو جلد سوکھ نہیں سکتا۔ اچھا گھی بازار میں نہیں ملتا۔ دیہات سے منگوانے کا بندوبست نہیں ہو سکتا۔ بازار کا میدہ اچھا نہیں ہوتا اور گیہوں لپوانے کی زحمت سے بھی الجھتا ہے گوشت مصالحہ تو مول مل سکتا ہے۔ دیگ مانگنے کی ہوں تو کام چلے۔ صرف ایک دیگ نہیں۔ درمی، جاجم، فقبلہ سوز، لیمپ، چار پائیاں۔ تخت ایک کمریٹ کا پورا سامان کس سے اور کہاں سے مانگا جائے۔ یہ تو باہری سامان ہیں۔ جنکا انصرام مردوں کے لئے چندان مشکل نہیں۔ غضب تو یہ ہے کہ سنا رہو اگر گنا بنوانے کا بار کون اٹھائے۔ کپڑا۔ زیور۔ مختلف چیزیں دو چار ہوں تو تفصیل لکھی جائے۔ سیکڑوں چیزیں کہاں تک بیان کی جائیں۔ خزانہ قارون عمر نوح۔ صحت آدم میسر آئے جب بھی وقت پر ایک نہ ایک چیز ضرور گھٹے گی۔ اور کوشش ناکافی ثابت ہوگی۔

مجھ سے تو یہ گھڑاگ نہ ہو سکے گا۔ یا دوسرے لفظوں میں میں تو اتنا جاہل نہیں ہوں کہ خوشی سے اس کو منظور کر لوں۔ جب تک میرے سر میں دماغ دماغ میں عقل اور عقل میں نیک و بد کی تمیز ہے تو یہ غلطی مجھ سے کبھی نہ ہوگی۔ میں صاف لفظوں میں دلہن کے باپ کو لکھوں گا کہ میں شرعی خیال کا آدمی ہوں اور اپنے لڑکے کو بھی میں نے شرعی تعلیم دی ہے۔ خلاف شرع میں بال برابر بھی کوئی کام نہیں کر سکتا۔ لڑکا حاضر ہے جب چاہے بلوایئے اور نکاح پڑھوادیجئے۔ میری شرکت بھی غیر ضروری ہے نکاح جسکا ہوگا وہ جائے گا۔ مجھے خدمت گاروں کی طرح ساتھ جانا کیا ضروری ہے۔ اگر سنت نبوی کی تقلید منظور ہے تو بسم اللہ اور نہیں تو آپ کوئی دوسری نسبت ڈھونڈھیئے آپ سنت نبوی کی پیروی میں توہین سمجھتے ہیں تو میں آپ سے ناتہ رشتہ قائم کرنے میں اپنی توہین تصور کرتا ہوں۔“

مالی زیر باری کی نسبت زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہزاروں لاکھوں گھر برباد ہو گئے۔ رسم و رواج کی پابندیوں نے بڑے بڑے ہوشیار والدین سے اتنا خرچ کرادیا کہ جب دلہن گھر میں بیاہ کر آئی تو دلہن کے گھنے بیچ کر دونوں وقت کی روٹیاں ہم پہنچانے کے سوا اور کوئی سہارا نہ رہا۔ کوئی معمول شخص یہ کہے کہ میرے گھر وافر مال ہے۔ خرچ کرتا ہوں تو کیا برا کرتا ہوں۔ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اگر خدا نے دولت دی ہے تو خوشی سے خرچ کیجئے فقیروں کو دیجئے اعزہ کو دیجئے۔ لڑکی کے لئے زیور بنوایئے۔ کپڑے تقسیم کیجئے۔ کھانے پکوانے لیکن بیہودہ رسموں کے ساتھ اتر کر خرچ نہ کیجئے کہ خدا کو برا لگے اور آپکی دیکھا دیکھی کتنے غریب بھائی برباد ہوں۔

دقت تو یہ ہوتی ہے کہ ایک گھر بیاہ ہوتا ہے تو کتنے ناتے کے تمام گھروں میں تردد پیدا ہوتا ہے۔ عزباء جن کے پاس کھانے کو بھی نہیں ہے اپنا اسباب بیچتے ہیں اور یہ نہیں گوارا کر سکتے کہ برادری



میں ناموسی ہو اور جہاں دس بھائی موقع موقع سے تمام رسومات میں خرچ کرنے میں تیار ہوں وہاں وہ کچھ بھی نہ کریں۔ ایک گھر میں شادی اور دس گھروں کی بربادی۔ جہاں ایک کے گھر کسی قسم کی تقریب پیش ہوتی ہے تمام نادار بھائیوں کو فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ جب مسلمانوں میں تمول تھا تو خیر کسی طرح بھی جاتی تھی اب اس تنگ زمانے میں فضول رسموں کی پابندیوں سے جن مالی زحمتوں میں مسلمان گرفتار ہیں وہ ناگفتہ بہ ہیں۔

یہ سب باتیں کچھ نئی نہیں ہیں سمجھی جانتے ہیں اور ہر ایک اس سے بھی زیادہ سوچتا۔ سمجھتا اور بیان کر سکتا ہے۔ لیکن سچی جرأت دمار کر تیج کے نہ ہونے سے سوچتے سب کچھ ہیں لیکن کر کے کچھ دکھا نہیں سکتے۔ ہندوستانی تعلیم تو بری تھی ہی پرانی لکیر کے فقیر کس مد میں تھے۔ نئی تعلیم والے روشن خیال رکھنے والے مارل کرناج سے معری نظر آتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے۔ نئی تعلیم والوں نے رسم و رواج کے مٹانے کی طرف توجہ نہیں کی تو سو اس کے ادا کیا سمجھا جائے کہ ان میں کافی جرأت نہیں ہے۔ نہیں! نہیں! ہم نے غلطی کی انگریزوں کی مسرفانہ طرز زندگی جنکی نظروں میں خوش آئند ہے وہ پرانی رسموں کو جو زیادہ تر اسراف پر مبنی ہیں دل سے ناپسند نہیں کرتے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جہلا کے منہ سے یہ سننا مقصود ہو کہ فلاں صاحب نے تمام عمر انگریزوں سے برابر سنجیت رکھی۔ لیکن پختہ خیال اور وضع دار ہیں کہ ملک کی قدیم رسموں کی وقعت اب تک تسلیم کرتے ہیں۔

قوم کے اخلاق یا انکی طرز زندگی میں جتنی بڑائیاں ہیں جہالت کی وجہ سے ہیں۔ قوم کے علماء روشن خیال حضرات) پر بہت بڑا الزام ہے کہ وہ قوم کی حالت درست کرنے میں کوشش نہیں کرتے اور نہ اپنی روشن خیالی سے دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔

### ازدواج میں بے احتیاطی

ازدواج ایسے اہم کام کے متعلق جو بے احتیاطیاں ہندوستان میں روار کھی جاتی ہیں وہ شمار سے باہر ہیں اصول رضامندی کے متعلق جو بے احتیاطیاں ہوتی ہیں وہی ہم اس وقت دکھانا چاہتے ہیں۔ دنیا کے کسی معاملے میں غالباً اتنی بے پرواہی نہ کی جاتی ہوگی جتنا کہ انتخاب زوج یا زوجہ میں روار کھی جاتی ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ تمام عمر کے لئے ایک بھگڑا خرید جائے لیکن انجام پر مطلق نگاہ نہ ہو۔ والدین کے حوصلے زوج کی نا تجربہ کاری۔ فرط شوق۔ ملکی مراسم یہ سب امور اکٹھا ہو کر اس طرح نوجوانوں کو بے بس کر دیتے ہیں کہ ان سے کچھ بن نہیں پڑتی اور آئندہ زندگی پر غور



غور کرنے کی انھیں ذرا بھی مہلت نہیں ملتی۔ وہ ہرگز یہ نہیں سوچتے کہ اس وقت کا چوکنا عمر بھر لائے گا والدین کو کیا انھیں تو بہو کے دیکھنے کا شوق یا خانہ آبادی سے مطلب ہوتا ہے۔ آفت تو اس پر آتی ہے جس کو تمام عمر نکاح کرنا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے سعادت مند بننے کی خوشی میں ہمیشہ کے لئے بلائے جان خریدنا ہے۔ والدین کو بیاہنے سے جس قدر سروکار رہتا ہے اس کا اندازہ ان لوگوں کے مذاق سے بخوبی ہو سکتا ہے جو لا ولدی کی وجہ سے گڈی گڈے یا باغ اور کنوئیں کے بیاہ سے اپنے دل کے حوصلے نکالتے ہیں۔

بیاہ کے بعد انسان کو نئی دنیا میں قدم رکھنا ہوتا ہے اور اپنے طرز زندگی میں ایک بڑا عظیم الشان انقلاب ہمیشہ کے لئے پیدا کرنا ہوتا ہے۔ نہایت افسوس ہے کہ اس انقلاب کے پیدا ہونے کے قبل نشیب و فراز پر پورے طور سے نظر نہ ڈال لی جائے۔

زن و شو میں اگر انس نہیں اخلاق نہیں تو انکی زندگی خود دو بھر ہو جاتی ہے۔ بیاہ کے بعد خود ہی انس پیدا ہو رہے یہ خیال صریح نا عاقبت اندیشی ہے۔ انسانی طبیعت کا یہ بھی ایک خاصہ ہے کہ اپنی پسند کی عیب پوشی اور دوسرے کی پسند کی عیب جوئی کی طرف اس کا فطرتی میلان رہتا ہے۔ اب آپ یہ خیال کر سکتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں مسئلہ ادواح کے متعلق کیسے کچھ نہ ہر پلے اثر یا نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

جس کسی کو اپنی اہلیہ سے انس نہیں ہوتا ہم سمجھتے ہیں کہ سچی خوشی اسے کبھی نصیب نہیں ہوتی اور اس لطف سے ہمیشہ محروم رہتا ہے جو زن و شو کی یکدلی میں نیچر نے پیدا کر رکھا ہے۔ مردوں پر جو دنیاوی ترددات کے بار پڑتے ہیں اگر کوئی شے انکی بنیاد مٹانے والی ہے یا جو مردوں کے غم غلط کرتے ہیں یہ طوائف رکھنے کا دعویٰ کر سکتی ہے وہ صرف ان فرماں بردار بیویوں کی ذات ہے جن کے ساتھ ان کے شوہروں کو انس ہے۔ فطرت اس امر کو چاہتی ہے کہ مردوں کو سب سے زیادہ پیاری انکی عورتیں ہوں لیکن ہندوستان میں قضیہ منعکس ہے۔ یہاں کے طرز معاشرت پر نظر ڈال کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں تو میں دس بھی ایسے نہ نکلیں گے جن کو اپنی بیویوں سے عشق ہو۔ ہمارے ملک میں بیویوں کے ہوتے ہوئے دوسری غیر عورتوں سے تعلق اتنا معیوب نہیں سمجھا جاتا جتنا اور ملکوں میں ہے اس کی وجہ ایک یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جس امر کی طرف کل سوسائٹی کا رجحان ہو وہ معیوب کس طرح سمجھا جائے۔ حالت تو یہ ہو رہی ہے کہ جو بیاہ ماں باپ کے ذریعہ سے ہوتا ہے وہ سمجھا جاتا ہے کہ گھر کی حفاظت کے لئے والدین نے ایک لونڈی خرید کر دی ہے۔ باقی رہا بیوی بننے کا حق یہ اس کو حاصل ہو گا جو اپنی پسند سے مستقل یا غیر مستقل طور پر آگے چل کر منتخب کی جائے گی۔ یہ کیسی نثر مناک بات ہے۔ لیکن لڑکے کے بھی ایک اعتبار



سے مجبور ہیں۔ ماں باپ کے انتخاب پر کھانے پینے کا مدار تو نہیں ہو سکتا۔ ازدواج کا سانا ذک معاملہ بھلا ماں باپ کی پسند سے کیوں مان لیا جائے ایجاب و قبول کا کہنا تو لفظی اطاعت تھی لیکن دل کس طرح ایک نامقول حکم کی تعمیل کے لئے ہمیشہ حاضر رہے۔ والدین جو اپنے لڑکوں کے بیاہ کے بارے میں دخل دیتے ہیں یا لڑکوں کے استمزاج کو مقدم نہیں سمجھتے وہ سخت غلطی کرتے ہیں۔

ہم اس امر کے قائل نہیں ہیں کہ باپ کو خون کے تعلق سے محبت ہوتی ہے۔ ماؤں کی محبت البتہ فطری ہے اور باپ کے دل میں اسی کے واسطے سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ لطف انگیز ملاقاتوں کے بے دریغ واقع ہونے سے محبت کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور محبوب کا محبوب بھی پیارا معلوم ہوتا ہے۔ باپ کی محبت لڑکوں سے اسی مسئلہ پر متفرع ہے۔ باپ کا اگر محض یہ خیال ہے کہ اس کے لڑکے بڑے ہو کر ضعیفی میں اس کے کام آئیں گے تو یہ محبت نہیں خود عرضی ہے ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ لڑکوں سے غیر مانوس رہنا بیوی سے انس نہ ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے کو درہے ہیں میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں۔ ماؤں کا دل پھولا نہیں سماتا۔ پیاری پیاری آواز پیاری پیاری ادا اگر باپ بھی اس میں شریک ہو جائے تو کیسی سچی خوشی حاصل ہو اور فطرت گویا تکمیل کو پہنچے۔ لیکن کیسا کجخت وہ باپ ہے جس کو لڑکوں کا کو دنانا گوارا کرتا ہے اور اس کے دل کرٹھنے کا سبب ہوتا ہے۔ یہ کیوں؟ سبب ظاہر ہے بیوی سے انس نہ تھا تو لڑکوں سے کیا انس ہوتا والدین کے دلوں میں بے لطفیوں کے تخم تھے ان لڑکوں کے پیدا ہونے سے وہ جم گئے اور لڑکوں کے ساتھ وہ بھی بڑھتے گئے اور اس طرح نئی زحماتیں بڑھتی گئیں اور مرتے دم تک یہ رنج ساتھ رہا۔

جب نئی بیویاہ کر گھر میں آتی ہے اور اول اول ساس کی نظر اس پر پڑتی ہے۔ وہ حالت ایسی نہیں ہوتی کہ تحریر میں آسکے پیٹ میں لڑکوں کا رہنا ان کے پیدا ہونے کی وقتیں انکی پرورش کے جھگڑے ان کی مختلف حالتوں کے انقلابات یہ سب باتیں ان ماؤں کو یاد آ جاتی ہیں اور وہ سمجھتی ہیں کہ آج ان ساری زحماتوں کا نتیجہ نکلا لیکن تلخیاں جو آئندہ ان کے پیارے لڑکوں کے نصیب میں ہیں ان کا ایک پتلہ بنا کر اسی وقت اس بہو کے برابر رکھ دیا جائے تو شاید ان ماؤں کی روح بدن سے نکل جائے لیکن افسوس اس وقت امتیاز نہیں ہوتا۔ دوچار مہینہ کے بعد آہستہ آہستہ رنجشیں شروع ہوتی ہیں۔ ساس الگ خفاندیں الگ رنجیدہ۔ میاں ہیں کہ کبھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ بیٹے کو پھرا ہوا دیکھ کر ماں بھی پھر گئی بھائی کی نظر کو نندوں نے بھی تاڑ لیا اب دلہن ہے کہ لونڈیوں سے بھی بدتر اس کی زندگی ہے۔ لڑکے ہوئے تو چندے اس کا دل بہل گیا لیکن وہ بھی اس وقت تک کہ لڑکے ہوشیار نہیں ہوئے۔ سمجھ آنے پر وہ بھی ایسی



ماں کو بے وقعت سمجھنے پر مجبور ہوں گے جس کو سارے کنبے کی نظروں میں وہ ذلیل پاتے ہیں اب غور کیجئے تو ان تمام خرابیوں کا باعث یہ ہے کہ بیاہ کرنا انکی پسند پر نہیں چھوڑا گیا تھا جن کو فی الواقع اس کی احتیاج تھی یا دوسرے لفظوں میں جن کو پسند کرنے کا حق تھا۔

## محرمات نکاح

جن عورتوں سے نکاح درست نہیں ہے انکی تصریح قرآن میں کر دی گئی ہے۔ سورہ نساء رکوع ۴ میں مذکور ہے۔

”اپنے باپ کی منکوحات سے نکاح نہ کرنا۔ خیر جو ہو چکا وہ ہو چکا بڑی بے حیائی غضب کی بات اور بہت ہی برادستور تھا۔ مسلمانوں! تمہاری مائیں۔ بیٹیاں۔ بہنیں۔ پھوپھیاں۔ خالائیں۔ بھتیجیاں۔ بھانجیاں دودھ پلائی دائیاں۔ دودھ شریک بہنیں بیٹیوں کی مائیں اور جن بیویوں کے ساتھ تم ہم بستر ہو چکے ہو انکی مادر جلوڑکیاں جو غالباً تمہاری گودوں میں پرورش پاتی ہیں۔ یہ سب تم پر حرام ہیں۔ لیکن اگر بیویوں کے ساتھ تم نے ہم بستر نہیں کی تو مادر جلوڑکیوں کے ساتھ نکاح کرنا گناہ نہیں ہے اور تمہاری بہویں بھی تم پر حرام ہیں اور دو بہنوں کا بھی ایک ساتھ نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔ مگر جو پہلے ہو چکا اس کا معاف کرنے والا اللہ ہے وہ بڑا مہربان ہے“ سورہ نساء رکوع ۴۔

حدیثوں سے ثابت ہے کہ خالہ۔ بھانجی اور پھوپھی بھتیجی کا نکاح میں جمع کرنا بھی حرام ہے۔ ابتداءً خلقت میں نکاح کے متعلق کسی قسم کی قید ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ لیکن دنیا کی آبادی بڑھنے اور عقل و شعور حاصل ہونے پر یہ سمجھا گیا کہ قریب کی رشتہ داروں میں شادی بیاہ کا ہونا نسل کی کمزوری کا سبب ہوتا ہے۔ نباتات میں بھی یہی کیفیت ہے۔ قلم لگانے سے پھل بڑے اور میٹھے ہوتے ہیں پودے ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لگائے جاتے ہیں تو پھل زیادہ آتے ہیں اور اچھے ہوتے ہیں۔ انھیں خیالات سے ہندوؤں کے نزدیک جہاں تک دو خاندانوں کا ایک مورث کی نسل سے ہونا سمجھا جائے گا ان میں شادی بیاہ قطعاً ممنوع ہو گا اسی کے قریب قریب لیکن کسی قدر سہولت کے ساتھ یورپ کا بھی دستور ہے۔ ایران کے قدیم باشندوں میں قربت کا پرہیز نہ تھا۔ یہاں تک کہ بیٹیوں اور بہنوں کے ساتھ بھی وہ بیاہ کر سکتے تھے۔ شرع محمدی نے اعتدال ملحوظ رکھ کر صرف قریبی رشتہ داروں میں باہمی ازدواج ناپسند ٹھہرایا۔

کفار عرب میں یہ دستور تھا کہ کم سن عورتیں اگر باپ کے نکاح میں ہوتی تھیں تو کبھی کبھی بیٹے



باپ کے مرنے پر انھیں اپنے نکاح میں داخل کر لیتے تھے۔ اس رسم قبیح کو شرع محمدی نے بالکل مٹا دیا اسی کی نسبت قرآن میں اشارہ ہے کہ خیر جو ہو چکا سو ہو چکا آئندہ ایسی بے حیائی نہ ہونے پائے۔ شرع محمدی نے قریبی رشتہ داریوں میں نکاح کو اس درجہ مذموم ٹھہرایا کہ رضاعت (دودھ پلانے) سے جو رشتہ داریاں پیدا ہوتی ہیں ان میں باہمی نکاح جائز نہیں رکھا۔ اس مسئلہ سے شرع محمدی کی وسعت نظر کا ثبوت ملتا ہے۔ ولادت اور رضاعت دو تعلقات بہت قریبی ہیں ان دونوں میں حرمت نکاح کا لحاظ اور خیال رکھنا اسی لئے ہے کہ مسلمانوں کی نسل میں کمزوری آنے نہ پائے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سب سے بڑا احسان انسان پر بعد ماں کے رضاعی کا ہے۔ رشتہ داران رضاعی میں باہمی نکاح کو حرام کیے رضاعت کا احترام مسلمانوں میں اصول فیاضی اور اصول اظہار احسان مندی پر جو قومی ترقیوں کی جانا ہے قائم کیا گیا ہے اور یہ وہ بات ہے کہ دنیا کی کسی قوم میں بھی اس کی نظیر نہیں ملتی۔

قریبی رشتہ داریوں میں نکاح کا جائز ہونا یہ مطلب نہیں رکھتا کہ خاندان کی لڑکیاں خواہ مخواہ خاندان ہی میں رہیں یہ جواز محض اس لئے ہے کہ اگر کسی وجہ سے ایسا ناگزیر ہو تو شرعی تحریم مانع نہ ہو یہ ضروری نہیں ہے کہ جو چیز جائز ہو اس پر خواہ مخواہ عمل کیا جائے۔ پیغمبر خدا کے وقت میں نیز اس کے بعد بھی غیر خاندان میں شادی کرنا پسند کیا جاتا تھا۔ شادی بیاہ میں ایک کفو ہونا بے شک مناسب تصور کیا گیا ہے کفو کا مطلب ہے شرافت اور حیثیت میں مساوی ہونا۔ کفو کا لحاظ رکھنے سے یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک دادا کی اولاد آپس میں خواہ مخواہ شادی بیاہ کرے اس طرح ضرور نسل خراب ہو جاتی ہے۔ کفو کا یہ مطلب ہے کہ دباغ کی لڑکی حتی الوسع دباغ کے گھر بیاہ کر جائے گی تو زن و شو کے لئے راحت کا سامان ہوگا۔ عطار کی لڑکی جو ہمیشہ عطر میں بسی رہی اور پھولوں سے کھیلتی رہی اگر بیاہ کر دباغ کے گھر جائے گی تو چمڑے کی بو اس کے دماغ کو ایسا پریشان رکھے گی کہ اسے چین نہ آئے گا پیغمبر خدا نے اپنے بہت سے عقد کئے لیکن خاندان میں صرف ایک عقد کیا اور وہ بھی نہایت مجبوری سے۔ حضرت زینبؓ پھوپھی زاد بہن کو آپ نے زید سے بیاہا۔ زید نے حضرت زینبؓ کو طلاق دی تو حضرت زینبؓ ملول ہوئیں۔ حضرت زینبؓ کو پہلے بھی اس نکاح میں تامل تھا کہ حضرت زید جاہلیت کے خیالات کے باعث ذات میں کم تر سمجھے جاتے تھے۔ آنحضرتؐ نے اخوت اسلامی کی مساوات اپنے ہی گھر سے قائم کرنا چاہی اور اس لئے حضرت زینبؓ نے آنحضرتؐ کی خاطر سے زید کے ساتھ بیاہا جانا پسند کیا۔ حضرت زیدؓ کے طلاق دینے پر آنحضرتؐ کو حضرت زینبؓ کی دلجوئی کے لئے انکو اپنے نکاح میں لینا نسب معلوم ہوا۔



دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنا صریح قرآن میں منع ہے۔ آنحضرتؐ نے اسی اصول پر بیوی کی حیات میں اسکی بھتیجی یا بھانجی سے بھی عقد کرنا منع کر دیا ہے آنحضرتؐ کا اس اصول پر بیوی کی حیات میں عقد کے لئے منع کرنا اس مصلحت پر مبنی ہے کہ اتنی قریب کی رشتہ داروں میں اس قسم کا بڑاؤ مستحسن نہیں معلوم ہوتا۔ بیوی کا احترام اس امر کا مقتضی ہے کہ اس کے جیتے جی اس کے قریب کے رشتہ داروں سے نکاح نہ کیا جائے لیکن بیویوں کے مرنے کے بعد یہ حرمت شرعی قائم نہیں رہتی اس بارہ میں بھی مسئلہ شرعی نہایت معتدل حالت رکھتا ہے ورنہ یورپ میں بیوی کے مرنے کے بعد بھی سالیوں کے ساتھ نکاح درست نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن بیوی کے مرنے کے بعد سالی سے بیاہ کرنا تمدنی حالت کے اعتبار سے کبھی کبھی نہایت مناسب تصور کیا جاتا ہے چنانچہ پارلیمنٹ میں اسے جائز کر دینے کی بابت کئی مرتبہ بل پیش ہوئے اور بڑے بڑے مباحثہ ہوئے۔ ابھی قانون پاس نہیں ہوا لیکن عام خلقت کا رجحان ہے کہ ایسا ضرور ہونا چاہیے۔



## فصل نمبر ۳۹

### مہر

مسلمانوں میں طلاق کا دے دینا بہت آسان امر ہے۔ کثرت ازدواج کا بھی ان میں دستور ہے۔ یہ دونوں بجائے خود دو سخت بلائیں ہیں۔ لیکن یہ دونوں بلائیں اسلام نے اپنے گھر میں اسی طرح پال رکھی ہیں جس طرح لوگ چوہوں کے مارنے کے لئے بلیاں پالتے ہیں۔ ان دونوں بلاؤں سے سخت تر بلا زنا کاری ہے۔ زنا کاری کی روک تھام کسی طرح نہیں ہو سکتی اگر ہو سکتی تھی تو صرف اکھیں دو چیزوں کے قائم رکھنے سے ان دو چیزوں کا قائم رہنا عورتوں کے حقوق اور انکی آزادیوں کو بالکل ہی نیست و نابود کر دیتا تھا۔ اس لئے عورتوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے مہر قائم کیا گیا دنیا میں جتنی تکالیف ہیں ان میں سے اکثر کا معاوضہ روپے ہو سکتا ہے۔ زنا کو سخت ترین جرائم قرار دے کر مردوں کو شریعت نے نکاح کی طرف مائل کیا۔ عورتیں نکاح کے ساتھ کثرت ازدواج اور سہولت کے مسائل سن کر گھبرائیں تو شریعت نے عورتوں کے کان میں چپکے سے ہمدیا کہ لو مردوں کو تمہارا اختیار میں ہم کئے دیتے ہیں جتنا چاہو مہر بندھو الو۔ گھبرانا کس بات کا ہے۔ یہ مہر عورتوں کے اولیاء کا حق نہیں ہوتا۔ خود عورتیں اس کو پاتی ہیں۔ چاہے شروع ہی سے لے لیں یا ادائیگی شوہروں کی گردن پر قائم رکھیں۔ یا کچھ لے لیں اور کچھ باقی بگا رکھیں۔ کتنا صاف مسئلہ ہے۔ لیکن اس کے سمجھنے میں عملدرآمد میں اس کے اغراض اور اسکی پالیسی کے جانچنے میں جو غلط فہمیاں قوم سے اور قوم بھی ایسی ویسی نہیں اچھے اچھے سمجھ داروں سے۔ عدالتوں سے اور قانون کے پیشواؤں سے ظہور میں آتی ہیں وہ بہت زیادہ کثیر الوقوع ہیں۔ اور بہت کچھ فرائض انسانی کے خلاف ہوتی ہیں۔ جب خود مسلمان بہت



کم ایسے ہیں جو اس مسئلہ کو بخوبی سمجھ سکیں تو دوسری قوم کے لوگ جو مسلمانوں سے معاملہ کرتے ہیں اور اس طرح مسئلہ دین مہر کے متعلق معاملات پیش آنے پر ان کے نفع اور نقصان کو بھی اسی مسئلہ سے عارضی طور پر وابستگی پیدا ہو جاتی ہے جھلا کیا سمجھیں گے۔ سبب یہ ہے کہ لوگوں کو اس بحث کے متعلق ایسی مکمل واقفیت حاصل نہیں ہے جو ہونا چاہیے اور اس لئے شاید کوئی دوسرا شرعی مسئلہ اس بارہ میں دین مہر کا سا کم نصیب اور بد بخت نہ ہو گا۔

سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ فطرت نے مرد کو کمانے کے لئے پیدا کیا ہے اور عورتوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ مردوں کی کمائی میں حصہ لیں اور ان کے بخت کی شریک بنیں مردوں کے آرام و آسائش کے لئے عورتوں سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز نہ پیدا ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ مشہور ہے کہ ”مہر کہ زن ندارد۔ آسائش تن ندارد“ باعتبار قومی حالت کے ان عورتوں کا مردوں کے قبضہ میں آنا مختلف پیرائے میں ہوتا ہے۔ ہم یہاں سمجھنے کے لئے ہندو۔ عیسائی اور مسلمان تین قوموں سے بحث کرتے ہیں۔

ہندوؤں کے نزدیک نکاح ایک مذہبی رسم ہے۔ نجات آخرت کے لئے نکاح ضروری ہے کیونکہ لڑکانہ ہوا تو پنڈا دینے کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا، اور نکاح کا ہونا ایسا مضبوط عقد ہے جو کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا۔ طلاق کا کہیں دھرم شاستر میں ذکر نہیں۔ بیاہ کے بعد عورت اور مرد اس طرح ایک دوسرے کے بخت کی شریک ہو جاتے ہیں کہ کسی طرح علیحدگی ممکن نہیں ہوتی۔ یوں عورت خود مرد کو چھوڑ بیٹھے اور مرد چپکا ہو رہے تو وہ بات ہی جدا ہے۔ لیکن پھر دونوں ملنا چاہیں تو کوئی امر مانع نہیں ہے۔ ہندوؤں اور انگریزوں کے دستور اس بارہ میں قریب قریب یکساں ہیں فرق صرف اس قدر ہے کہ زنا کاری کی حالت میں طلاق دینے کا قاعدہ انگریزوں کے یہاں صریحاً مندرج قانون ہے۔ اور ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری بیوی کے لانے کے قاعدے کو انگریزوں نے اپنے نزدیک بہ اقتضائے تہذیب ناجائز بلکہ حرام قرار دے رکھا ہے ان دونوں قوموں میں عورتوں کا مہر کچھ نہیں ہوتا لیکن اس مہر نہ ہونے کی کمی یوں پوری کی جاتی ہے کہ مرد عورت کو طلاق نہیں دے سکتا اور اولاد ذکور نہ ہونے کی صورت میں بیوائیں اپنے شوہروں کا کل تر کہ پاتی ہیں۔ جیتے جی اگر نان نفقہ میں مرد کمی کرے تو عدالت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ عدالت بھی ایسی ویسی نہیں۔ فوجداری۔ فوراً آٹھ آنے کی درخواست پر پچاس روپے ماہوار تک (حب حیثیت) نان و نفقہ مقرر ہو جاتا ہے اور اجرائے ڈگری میں یہ آسانی ہے کہ ہر مہینہ پولیس نے پکڑ کر میاں سے بیوی کا وظیفہ دلوا یا میاں نے ذرا پہلو تہی کی



کہ جیل کی صورت دیکھنا نصیب ہوئی۔ ہا جنوں کا روپیہ ہو تو دیوالیہ ہونے کی درخواست بھی ہو سکتی ہے اس میں وہ بھی نہیں جب تک زندگی ہے اسکی ادائیگی سے چھٹکارا نہیں ہے۔ بیوی کی جوتیوں پر ناک لگا کر اس کو راضی کیا جائے۔ یا قتل انسان کے جرم میں سزا ہوتی ہے یعنی جلا وطنی، خود خوشی سے قبول کر لی جائے۔ غیر ملک میں پناہ لی جائے ورنہ ہندوستان میں تو پولیس کے وارنٹ سے کہیں چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔ بتائیے ہندوؤں اور عیسائیوں کی عورتوں کو جو حقوق وصولِ نفقہ کے حاصل ہیں کیسے مستحکم ہیں جس آسانی سے ڈگری ہوتی ہے اور جس طریقہ سے اجرائے ڈگری عمل میں آتی ہے وہ ان لوگوں کو بھی نصیب نہیں جو مدیوں کو فاقہ کش دیکھ کر روپیہ دیتے ہیں اور اسٹامپ اور جسٹری سے پوری چوکی کر لیتے ہیں۔

اب ذرا مسلمانوں کے قانون ملاحظہ فرمائیے کہ مرد ہر وقت بلا قصور عورت کو طلاق دے سکتا ہے اور ضابطہ فوجداری کے احکام سے گویا مسلمانوں کی قوم مستثنیٰ ہے۔ بیوی نے نان نفقہ کا سمن جاری کرایا اور میاں نے ایام عدت کا خرچہ عدالت کی میز پر رکھ کر اور باعلان تین مرتبہ عورت کو طلاق دے کر سیدھا گھر کا راستہ لیا اور اس طرح تین لفظوں میں سارا مرحلہ طے ہو گیا مسلمانوں میں عموماً تین دنوں نفقہ کا دعویٰ وہی عورتیں کرتی ہیں جو اس طرح طلاق پانے کو اپنا چارہ کار سمجھتی ہیں۔

مسلمانوں میں عورتوں کو کل ترکہ شوہری کسی حالت میں نہیں ملتا زیادہ سے زیادہ ربع ورنہ معمولی طور پر ایک ٹمن (آٹھواں) ملتا ہے دیکھئے طلاق کے مسئلہ میں اور کل ترکہ کے نہ پانے میں مسلمان عورتوں کی حالت کس درجہ ہندو اور عیسائی عورتوں سے گھٹی ہوئی ہے۔

یہاں یہ بات اور یاد رکھنے کے لائق ہے کہ مطلقہ عورتوں کو پھر دوسرے سے نکاح کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں تو شامت اعمال سے یہ قریب قریب حرام سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جہاں اس کا رواج ہے وہاں بھی زن بیوہ یا مطلقہ سے لوگ بجمہوری عقد کرتے ہیں ورنہ عام طور پر ہر ایک ایسی ہی عورت کا متلاشی رہتا ہے جو کسی شوہر کا منہ نہ دیکھ چکی ہو۔ عورتوں میں سب سے زیادہ قابل قدر اور قیمتی چیز بادی النظر میں مادہ الشباب ہے جسکو دوسرے لفظوں میں نیچر فطرت کے پھندے یا قدرت کے جال سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ مادہ الشباب چلے جانے کے بعد نہ عورتوں میں اپنی طرفوں کو کھینچنے کی طاقت باقی رہتی ہے اور نہ مردوں کی زبان پر یہ مصرعہ رہتا ہے۔

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

ایک بات اور سچی قابل لحاظ ہے کہ ہندوستان کی مسلمان عورتیں نکاح کے بعد ہر وقت طلاق



کے ڈر سے لرزاں رہتی ہیں اپنے حقوق کے طلب کرنے میں کبھی دلیری سے کام نہیں لے سکتیں اور ساری عمر گویا لوندیوں کی طرح سے لبر کرتی ہیں۔

مفصلہ بالا تقریر سننے کے بعد ناظرین سمجھے ہوں گے کہ مسلمان عورتوں کا سابدنخت دنیا میں کوئی دوسری مخلوق نہیں ہے حالانکہ یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ عورتوں کے جتنے حقوق شرع میں ہیں ان میں دست اندازی نہ کی جائے تو وہ بھی مردوں کی طرح آزاد اور خوش رہ سکتی ہیں کیونکہ آئندہ تمام مصیبتوں سے مقابلہ کرنے کے لئے مسلمان عورتوں اور ان کے ولیوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ نکاح سے قبل جو زیادہ سے زیادہ مہر مردوں سے چاہیں ٹھہرائیں کہ یہ نقدی یا ہمیشہ مردوں کے مقابلہ میں ان کے حقوق کا محافظ رہے اور وصول ہو جانے کی حالت میں نہایت عمدہ طور پر دیگر نقائص کی تلافی کر سکے۔ لیکن افسوس ہے کہ قوم کے طرز عمل نے ان بے چاری پر وہ نشین اور بے زبان عورتوں کو اس زبردست آلاء حفاظت خود اختیار سے محروم کرنے کی دھمکی دے رکھی ہے۔

ان عورتوں کی حق تلفی کے تین ذریعے ہیں۔ ایک خود قوم کی غفلت۔ دوسرے قانون پستیوں کی وجہ سے عدالت بھی شامل ہے، غلط فہمیاں۔ تیسرے ان لوگوں کی ناواقفیت جن کو مسلمانوں کے خاندان سے معاملے کرنے پڑتے ہیں۔ ہم ہر ایک شق کو علیحدہ طور پر الگ الگ بیان کرتے ہیں۔

عورتوں کی غرض مشترکہ پر لحاظ نہ کیا جائے تو ماہر الشباب سے زیادہ قیمتی چیز دنیا میں کوئی دوسری نہیں ہو سکتی اور اس لئے اس کے عوض میں جس قدر روپیہ دیا جائے کم ہے۔ مہر کی تعداد شرع میں معین نہیں ہے۔ جب قدر فریقین میں طے پا جائے وہی مہر ہے ہاں دس درم شرعی سے کسی طرح کم نہ ہو۔ ابتدائے اسلام میں جو کیفیت مسلمانوں کے افلاس کی تھی وہ ظاہر ہے اور حالت کے اعتبار سے تعداد مہر بھی بہت کم ہوتی تھی۔ پیغمبر خدا اور ان کے خاندان کے مہر بہت کم تھے اور اس لئے اب بھی مسلمانوں کے بعض خاندانوں میں انھیں تعدادوں کی پیروی مناسب سمجھی جاتی ہے لیکن ہمارے نزدیک شرع ایسی پیروی کو مستحسن نہیں سمجھتی۔ بلکہ بعض اوقات لڑکیوں کے والدین پر ایک اخلاقی الزام یہ عائد ہو جاتا ہے کہ انھوں نے زمانہ موجودہ کی حالت سے غافل رہ کر نامناسب طور پر شرعی غلط فہمی پر عمل کرنے سے اپنی بے زبان لڑکیوں کو تعداد مہر کم منظور کر کے نقصان پہنچایا۔

بعض خاندان ایسے بھی ہیں کہ وہ مہر کے اعراض تک نہیں سمجھتے۔ جیسے مسلمانوں کا جھوٹا پانی پینا علامت اسلام سمجھتے ہیں ویسے ہی نکاح کے وقت دس درم کا لفظ درمیان میں آجانا شمار اسلام جانتے ہیں۔ زیادہ تر شرفاء کے خاندان ایسے ہیں جو اپنی لڑکیوں کے مہر زیادہ مقرر کراتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں



کہ مہر کا زیادہ ہونا لڑکیوں کے آرام و آسائش کا سبب ہوتا ہے لیکن بعض اوقات گزشتہ زمانے کی ثروت کے لحاظ سے مہر کی تعداد میں اظہار عظمت خاندان کی اتنی زیادہ ہو جاتی ہے جو کسی طرح مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ گویہ حالت پسندیدہ نہیں ہوتی۔ لیکن مجبوری ہے۔ عدالتوں کو اس بڑی سے بڑی تعداد کے بھی صحیح مان لینے میں اس لئے کچھ تامل نہ ہونا چاہیے کہ تعداد مہر خود فریقین کے سمجھنے کی بات تھی نہ کہ عدالت کے سمجھنے کی۔

ہند کی اعلیٰ عدالتوں میں جو فیصلے مہر کے مقدمات میں ہوئے ہیں وہ بہت زیادہ تشفی بخش ہیں متوفی کا دین مہر جب تک ادا نہ ہو تقسیم ترکہ عمل میں نہ آئے۔ متوفی کے مرنے پر اگر اس کی بیوہ کا قبضہ اسکی کل جائیداد پر ہو جائے تو اس کا قبضہ بعوض دین مہر کے مرتبہ سمجھا جاتا ہے اور جب تک مہر ادا نہ کیا جائے گا دیگر ورثاء کو ترکہ کی نالاش کا حق نہیں ہوتا۔ لیکن نوعیت قبضہ اور طریقہ وصول دین مہر کی بحث تو دین مہر کے طے ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہے اور تعداد مہر معین کرنے کا کام ایسے لوگوں سے تعلق رکھتا ہے جو مفصلہ بالا اصول سے ناواقف رہنے کی وجہ سے عورتوں کے خلاف رائے قائم کرنا محفوظ طریقہ خیال کرتے ہیں اور بعض وقت تو وہ ایسی بے پروائی سے قائم کی جاتی ہے گویا دین مہر حق العباد ہے ہی نہیں۔ محض ایک رکن مذہب ہے اور اس میں تو کلام ہی نہیں کہ دعویٰ مہر رجوع ہونے یا مسئلہ مہر زیر بحث ہونے کے ساتھ ہی یہ رائے قائم ہو جاتی ہے کہ شوہر یا در ثنائے شوہر کی سازش سے کسی غریب کی حق تلفی کے لئے ایسا کیا جاتا ہے۔ مجوز کے دل میں ایسا شک پیدا ہونا ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ کس درجہ خطرناک ہے اور یہ بھی جان سکتے ہیں کہ نظریہ حالات سابق شک کہاں تک الفصاف سے دور ہے۔ بعض حالتیں تو ایسی ہوتی ہیں کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ دعویٰ سازشی ہے پھر بھی سازش سے الفصاف میں کوئی فرق نہیں آتا مثلاً کسی مالدار کی لڑکی کسی مالدار کے ساتھ بیس ہزار مہر پر بیاہی گئی۔ جائیداد شوہر ہی ایک لاکھ روپے کی ہے۔ عورت دین مہر کے باعث سے اپنے کو جائیداد کے ایک ٹمن کی مالک سمجھی بیٹھی ہے۔ اتفاقاً زمانہ کوئی نہیں جانتا۔ کسی طرح ایک لاکھ روپہ ہرجہ کی ڈگری شوہر پر کسی غیر نے حاصل کر لی اور جائیداد عنقریب نیلام ہوا چاہتی ہے اب عورت اسی اشار میں دعویٰ اپنے مہر کا کر دے اور غرض یہ ہو کہ اگر ڈگری ہو گئی تو زر نیلام میں عورت بھی حصہ رسدی پا جائے گی اور اس طرح بیس ہزار کے قریب ضرور مل جائیں گے۔ یوں خاموش رہنے سے کل جلتے رہتے ہیں ظاہر ہے کہ ایسے دعوتوں کے رجوع کرنے میں شوہر ضرور خوش ہو گا وہ سمجھے گا کہ غیر کی ڈگری میں کل جائیداد نیلام ہو جانے سے بہتر ہے کہ ایک جزو میری بیوی کے پاس



آجائے لیکن کیا محض اس لئے کہ زوجہ کی ڈگری سے شوہر کا بھی فائدہ ہوگا۔ زوجہ کے دعوے کا ڈگری کرنا کسی طرح اعلیٰ درجہ کے عدل اور انصاف سے ذرا بھی گرا ہوا ہوگا؟ ہرگز نہیں۔

ہماری اس تحریر سے ان لوگوں کو بھی نفع ہوگا جو مسلمانوں کے قاعدہ دین ہر سے بالکل ناواقف ہیں۔ اور مسلمانوں کے خاندان کو ہندوؤں اور عیسائیوں کے خاندان پر قیاس کر کے معاملہ کر بیٹھتے ہیں اور پھر پیچھے سے . . . . . واقعات کے چھپانے سچی بات کے بدلنے اور غلط مقدمات کی ترتیب دینے سے اپنی غلطیوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جو شخص معاملہ کرنے سے پہلے احتیاط سے کام نہیں کرتا وہ گویا خود اپنی مدد نہیں کرتا اور ظاہر ہے جس نے خود اپنی مدد نہ کی عدالت سے مدد چاہنے کا اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

ممالک مغربی و شمالی کے لفٹنٹ گورنر نے عدالتوں کو دین مہر کی تعداد گھٹانے کا اختیار دینا چاہا تھا وائسرائے نے یہ تحریک پسند نہ کی اس اثنا میں بہت سے لوگوں سے رائیں طلب ہوئی تھیں۔ مولف نے بھی ایک رائے دی تھی جس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

”آجکل ممالک مغربی و شمالی کے واضعاً قانون یہ عذر کر رہے ہیں کہ تعداد مہر کا عدالت کو گھٹانا مناسب ہے کہ نہیں۔ اودھ میں عدالتوں کو اختیار ہے کہ اگر نامناسب طور پر مہر میں زیادتی کی گئی ہو تو اسکی تعداد گھٹا دی جائے۔ ممالک مغربی و شمالی میں ایک مقدمہ ہائیکورٹ تک پہنچا جس میں یہ بحث تھی کہ اگر تعداد مہر گھٹائی نہیں جاتی تو تمام جائداد مہر ہی کی نذر ہو جاتی ہے دوسرے وارثوں کے لئے کچھ نہیں بچتا۔ جموں نے تجویز کی کہ اودھ کی طرح اس ملک کی عدالتیں دست اندازی کی مجاز نہیں ہیں اس لئے مجبوری ہے۔ گورنمنٹ تک اسکی خبر پہنچی اور اب یہ عذر کیا جا رہا ہے کہ ممالک مغربی و شمالی میں بھی اودھ کا سا قانون نافذ کیا جائے تو کیسا؟“

”میرے نزدیک موجودہ حالت میں تغیر مناسب نہیں ہے اور وجوہ اسکے یہ ہیں۔

”انگریزوں اور ہندوؤں کی طرح مسلمانوں کے قانون میں طلاق مشروط بشرط یا غیر محکوم نہیں ہے۔ ہر شخص بغیر کسی وجہ کے اپنی زن منکوحہ کو چھوڑ سکتا ہے اور قانون انگریزی نے کوئی مداخلت اس بارہ میں بلا لحاظ اس کے کہ یہ مداخلت مناسب ہوگی یا نامناسب اب تک نہیں کی ہے۔ مسلمانوں کی عورتیں اعادہ حق زناشوی کا دعوے دیوانی میں اور نان نفقہ کا دعویٰ عدالت فوجداری میں عملی طور پر نہیں کر سکتیں کیونکہ جواب میں ایام عدت کا نفقہ رکھ کر عدالت کے سامنے مدعا علیہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے اپنی عورت کو



طلاق دیدی۔ ہندوستان میں باسٹھناے خاص خاص شریف خاندانوں کے طلاق کی رسم برابر جاری ہے اور جن گھروں میں طلاق کی رسم نہیں ہے وہاں طلاق سے بھی بدتر طریقہ جاری ہے یعنی عورتوں کو لوگ مہلقات کے طور پر چھوڑ دیتے ہیں۔ کبھی وہ حق زنا شوٹی ادا نہیں کرتے اور نہ طلاق ہی دیتے ہیں کہ وہ انکی قید سے آزاد ہو جائیں۔ بہر حال ہندوستان کی بے زبان عورتیں بے لکھی پڑھی اپنے شوہروں کے قبضہ میں بے بسی کی حالت میں رہتی ہیں اور جن گھروں میں رسم پردہ جاری ہے وہاں عورتیں اور بھی مجبوری کی حالت میں رہتی ہیں۔ پردہ کی سختی شرعی حدود سے متجاوز ہے اور اس لئے بہت سخت ہے ان سب زحمتوں کی تلافی اگر کچھ ہے تو وہ مہر سے ہے اس مہر کے ذریعے سے ایک گونہ شوہروں پر عورتوں کا دباؤ رہتا ہے۔ گوانے حقوق سے ناواقف رہنے کی وجہ سے ان عورتوں کو اس دباؤ کے نافرمانی کا اتنا موقع نہیں ملتا جتنا کہ ہونا چاہیے۔ لیکن پھر بھی تعداد مہر میں عدالت کی دست اندازی کا ردار کھنا عورتوں کی حالت زار سے صریح بے پروائی کرنا ہے اور مردوں کی زیادتیوں کو اور ترغیب دینا ہے۔

”جس وقت اسلام عرب میں پھیلا تھا عورتوں کو بہائم کے طور پر لوگ استعمال کرتے تھے۔ طلاق میں آزادی عورتوں کی ہمدردی سے قائم کی گئی۔ یعنی جاہل عرب جب اپنی بیویوں کو ناپسند کرتے تھے تو وہ طلاق نہیں دیتے تھے بلکہ ان کو چھوڑ دیتے تھے اور گھروں میں لونڈیوں کی طرح رکھتے تھے اور یہ اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ دوسروں کے ساتھ بیویوں کی طرح رہ سکیں شارع نے اس رسم کے مٹانے کے لئے طلاق کے قواعد منضبط کئے اور اس خیال سے کہ طلاق جو ایک بلا دفع کرنے کے لئے قائم کی گئی تھی خود اس سے بڑی بلا نہ ہو جائے عورتوں کو تعداد مہر بڑھانے کی عام اجازت دی گئی۔ شروع شروع اپنے شوق میں عربوں نے تعداد مہر کی زیادتی پر اپنی رضا مندی ظاہر کر دی اور عورتیں جو قومی ترقی کے اثر سے آزاد ہو چلی تھیں زیادہ مہر پر اصرار کرنے لگیں۔ کچھ دنوں کے بعد مردوں نے اسے ناپسند کیا اور خلیفہ دوم حضرت عمرؓ نے ایک روز یہ تقریر کی کہ لوگ زیادہ مہر نہ باندھیں۔ ایک بڑھیا جو مجمع میں موجود تھی۔ وہ بولی کہ قرآن شریف نے جس چیز کو جائز رکھا ہے خلیفہ وقت کو اسے مٹانا چاہیے۔ حضرت عمرؓ کو اس بڑھیا سے سبق حاصل ہوا اور انھوں نے اپنی غلطی مان لی اور اس



بڑھیا کا شکر یہ ادا کیا۔ اس کے بعد سے بلا واسلام میں کبھی تعداد مہر گھٹانے کی طرف بادشاہ وقت یا قاضیوں کو توجہ نہ ہوئی۔

”میری رائے میں جب عورت مدعی ہو کہ مہر کا دعویٰ شوہر پر پیش کرے اس حالت میں عدالت کو تعداد مہر میں دست اندازی کرنا کسی طرح قرین مصلحت نہیں ہے۔ اب رہا یہ امر کہ شوہر کے مرنے کے بعد ورثاء کے مقابلہ میں تعداد مہر کی بحث پیش ہو تو کیا کیا جائے؟ اس کا جواب بھی مشکل نہیں ہے۔ بعض اوقات ضروری صورتی پیدا ہو جاتی ہیں جن کو عوام پسند نہیں کرتے جیسا کہ مقدمہ کلکٹر مراد آباد بنام ہرنس سنگھ کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اس میں شرع محمدی کا کچھ نقص نہیں ہے بلکہ خود اپنی سمجھ کا پھر ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی کل جائیداد کسی کو دے ڈالے تو اس میں کسی کا اجارہ نہیں ہے اور اگر کوئی شخص کسی عورت کے حق میں اپنی کل جائیداد کا ہبہ کر دے اور پھر اس سے نکاح کرے تو عقلاً یا انصافاً، کوئی قباحت نہیں ہے اسی طرح اس نے اگر بقدر مالیت جائیداد کے مہر کا تعین کر دیا تو یہ بھی ایک طور پر اپنی کل جائیداد کا ہبہ کرنا ہے اور یہ ہبہ بے وجہ نہیں ہے عورت اپنی آزادی مرد کے حوالے کرتی ہے تب کہیں یہ جائیداد پاتی ہے اگر اس طرح دیگر ورثاء محروم ہو جاتے ہیں تو کوئی بے انصافی لازم نہیں آتی۔ دوسری قوموں کے قوانین دیکھئے یورپ میں ورثاء قریب کا حرام مختلف صورتوں میں نظر آتا ہے۔ مثلاً خلف اکبر کے مقابلہ میں چھوٹے لڑکے زمین نہیں پاتے۔ اگر وصیت نہ ہوئی تو اور تمام لڑکے محروم رہتے ہیں۔ اس لئے وہاں پہلے سے مورث کو اختیار ہوتا ہے کہ اپنے ورثاء میں جس طرح چاہے وصیت کرے اسلام نے نہ تو بڑے بیٹے کو کسی حالت میں کوئی ترجیح دی ہے اور نہ متوفی کی وصیت جہاں تک ورثاء کے محروم کرنے یا ایک وارث کو دوسرے وارث پر ترجیح دینے کے متعلق جائز رکھی ہے۔

”شارع اسلام نے گو ورثاء کے حقوق کی بہت زیادہ حفاظت کی ہے۔ لیکن پھر بھی تعداد مہر ادا ہونے تک تقسیم ترکہ اس نے روا نہیں رکھا اور نہ تعداد مہر کے گھٹانے کی طرف کبھی توجہ کی شرع میں تعداد مہر ایک نہایت مہتمم بالشان امر اب تک مسلمانوں میں سمجھا گیا ہے۔ ہر قوم کا قانون ایک حد تک اس قوم کے لئے آرام دہ ہے۔ اگر کوئی جزو اس کا ناقص سمجھ کر اس کی اصلاح میں کوشش کی جائے تو بجائے نفع کے نقصان پہنچنے کا اندیشہ



ہے۔ اگر تبدیلی روارکھی جائے تو کل قانون میں ایک ساتھ تبدیلی ہونی چاہیے مثلاً اگر تعداد مہر کے گھٹانے کا اختیار عدالت کو دیا جائے تو یہ بھی اختیار عدالت کو دیا جائے کہ بغیر اجازت عدالت کے شوہر طلاق نہ دے اور بغیر اجازت عدالت کے کوئی ایک سے زیادہ نکاح نہ کر سکے۔ طلاق اور کثرت ازواج میں مرد آزاد رہے اور تعداد مہر بڑھانے اور گھٹانے میں عورتیں آزاد رہیں تو مصلحت عام کے خلاف ہوگا اور بعض صورتوں میں جو اتفاقی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں ان سے کہیں زیادہ برائیاں موجودہ قاعدہ کے بدلنے میں پیدا ہو جائیں گی۔



## فصل نمبر ۱۲

### طلاق

شوہر اپنی بیوی کو چھوڑ دے تو اسے طلاق کہتے ہیں اور جب طلاق کے لئے بیوی کی طرف سے ترغیب دی گئی ہو تو اسے خلع کہتے ہیں۔

طلاق دینا بے شک ایک قسم کی بے وفائی ہے۔ شرع نے اس کو عمدہ سمجھ کر جائز نہیں رکھا بلکہ شرع نے صرف یہ بتایا ہے کہ اگر زن و شو میں مناسبت طبعی نہ ہو اور اس بے وفائی کے سوا دوسری کوئی صورت نظر نہ آئے تو یوں بے وفائی کرو۔ طلاق فی الواقع علاج ہے بہت سے امراض مہلکہ کا اور جہاں امراض پیدا ہونے پر اس کے علاج کی طرف رجوع نہیں کیا جاتا وہاں ایسے ایسے مہلک نتائج پیدا ہوتے ہیں کہ العظمتہ للہ۔

خلع میں تو بے شک فریقین کی مرضی سے طلاق ہوتی ہے لیکن جب کبھی عودت کی مرضی کے خلاف مرد طلاق دیتا ہے تو بظاہر ایک بدناما صورت پیدا ہوتی ہے اور اسی بدنامائی کے روکنے کے لئے پہلے سے عورتوں کو دین مہر کا حق دیا گیا ہے کہ وہ جتنا چاہیں مردوں پر بار عائد کر لیں کہ مردوں کو طلاق کی جرأت نہ ہو اور اگر خود عورتیں طلاق چاہیں تو مہر کا معاف کرنا نفاذ حق خلع میں بھی ان کو آسانی بہم پہنچائے۔

طلاق صرف مسلمانوں میں نہیں ہے۔ تمام دنیا میں طلاق جاری ہے جب سے دنیا میں شادی بیاہ قائم ہے طلاق بھی قائم ہے اور جب تک دنیا میں انسان رہیں گے اور ان میں بیاہ کا دستور قائم رہے گا تب تک طلاق کا وجود بھی قائم رہے گا۔ ہندوستان میں تو سب سے زائد طلاق کا رواج ہے۔ بیچارے عزباء کا تو ذکر نہیں لیکن امراء میں یہ بلا گھر گھر ہے۔ صغر سنی میں شادی ہوئی ہو تو سنبھالنے



پر بیوی سے نفرت پیدا ہوئی اور پھر تمام عمر شاہد ان بازاری سے یا اس سے بھی بری حالت میں دوسری قسم کی عورتوں سے تعلقات بے جا رہے اور بیوی سے کبھی دید و شنید بھی نہیں ہوئی گھر کی حفاظت کرنے اور کھانا پکانے کے لئے لونڈی نہ رہی ایک بیوی پڑی رہی اب ان بیویوں میں اور مطلقہ عورتوں میں کیا فرق ہے دوسرے ملکوں میں بھی کم و بیش یہ قاعدہ جاری ہے زن و شوہر میں سے ہر ایک نے دل بہلاؤ کی چھپی ہوئی صورت پیدا کرنی ایک کو دوسرے سے بالکل تعلق زنا شوقی نہیں ہوتا لیکن برائے نام دوسروں کے دکھانے کو یہ تعلق تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ تو مہذب ملکوں کا دستور ہے غیر مہذب ملکوں میں جہاں عورتیں مردوں کے اختیار میں رہتی ہیں اور طلاق کا دستور نہیں ہوتا وہاں بجنسہ ہندوستان کی سی تہذیب کی پیروی کی جاتی ہے۔ زمانہ جاہلیت میں عربوں کا بھی یہی دستور تھا جب وہ ایک بیوی کو ناپسند کرتے تھے تو اسے چھوڑ کر دوسری لاتے تھے لیکن جسکو چھوڑتے اس کو گھر سے باہر نہیں جانے دیتے تھے۔ بلکہ ماماؤں کی طرح کام لینے کے لئے اس کو گھر میں رکھتے تھے۔ جو بیوی کل پلنگ سے نیچے نہیں اترتی تھی وہ آج نئی دلہن کے سامنے محض جھاڑو دینے اور کھانے کے برتن صاف کرنے سے تعلق رکھتی ہے کتنا برا نظارہ ہے۔ طلاق کے احکام مہذب کر کے اسلام نے بہت بڑا احسان عورتوں پر کیا کہ ان کو شوہروں کی قید ہی سے آزاد کرادیا۔ احکام شرع جاری ہونے پر ہر عورت جس کو مرد چھوڑ دے قاضی کے سامنے درخواست دے سکتی ہے کہ اس کو شوہر کے گھر سے علیحدہ کر دیا جائے کہ کسی دوسرے سے وہ عقد کرے۔ مسئلہ طلاق ان احسانات میں شمار کیا جاتا ہے جو اسلام نے عورتوں کے ساتھ کئے ہیں۔

طلاق کا یہ قاعدہ ہے کہ جب تین طلاقیں ہو جائیں تو پھر عورتوں سے کسی قسم کا تعلق مرد نہیں رکھ سکتا تھا۔ یہ قومی تہذیب اور قومی زور کا اثر تھا۔ یہ نہیں کہ آج طلاق دی اور کل عورت نے دوسرا خاوند ٹھہرایا تو کہنے لگے کہ نہیں نہیں میں طلاق واپس لیتا ہوں مسلمانوں میں مطلقہ عورتوں سے پھر شوہروں کو کوئی تعلق نہیں رہتا۔ ہاں زن مطلقہ دوسرے کے نکاح میں رہے اور وہ بھی طلاق دے تو سابق شوہر دوبارہ نکاح اس سے کر سکتا ہے۔

طلاق واقع ہونے کے لئے تین مرتبہ طلاق دینا لازم ہے ایک ساتھ یا باری باری سے لیکن عمدہ صورت یہ ہے کہ ایک مرتبہ تین طلاقیں نہ دی جائیں۔ بلکہ ایک ایک مہینہ کے بعد ایک ایک طلاق دی جائے اور جب تین پوری ہو جائیں تو عورت مطلقہ سمجھی جائے تین طلاقیں ایک ساتھ اس لئے ناپسندیدہ ہیں کہ اس میں غم کرنے کا موقع کم ملتا ہے۔ غصہ کی حالت میں ممکن ہے



کہ طلاق ہو جائے اور پھر پچھتا نا پڑے اس لئے غمخیز نے حکم دیا ہے کہ حتی الوسع سوچ سمجھ کر یہ کام کرو تو اچھا ہے کہ پھر افسوس نہ ہو۔

فریقین میں نا اتفاقی ہو اور کسی طرح ایک دوسرے کو پسند نہ کرے تو علیحدگی سے اچھی کوئی صورت نہیں ہے۔ یہی ایک حکمت ہے اور یہی عین تہذیب ہے کہ آہستہ سے علیحدگی ہو جائے اور ہر ایک اپنا دوسرا بندہ لبت دنیا داری کا جھگڑا ایسا نہیں ہے کہ فریقین کی رضامندی کے بغیر بھی وہ امن و امان سے چلا چلے۔

ہندوستان میں طلاق دینے کا دستور نہیں ہے اگر ہے تو بس اس قدر ہے کہ عورت کو مرد نے چھوڑ دیا اور عورت لونڈی کی طرح گھر میں کام کر رہی ہے اور اس سے اچھی صورت ہو بھی نہیں سکتی جب تک عورتوں کا دوسرا بیاہ نا جائز ہے۔ لیکن یورپ میں طلاق ہے اور بعد طلاق کے فریقین کی دوسری شادیاں ہوتی ہیں اور پھر قسمت نے یاد داری کی تو چین سے بسر بھی ہوتی ہے لیکن وہاں طلاق کا قانون ایسا خراب ہے کہ بڑی مشکل سے طلاق واقع ہوتی ہے۔

۱۔ انگلستان میں زنا کوئی تعزیری جرم نہیں ہے۔

۲۔ بیاہ کے بعد فریقین کی مرضی سے طلاق نہیں ہو سکتی بلکہ عدالت کی مرضی پر فریقین کا تفرقہ منحصر ہوتا ہے۔

۳۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ فریقین نے طلاق حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن عدالت سے منظوری حاصل نہیں ہوئی۔

۴۔ اکثر طلاق کی ڈگری عدالت سے اس حالت میں حاصل ہوتی ہے جبکہ فریقین کا یا ان میں سے ایک زنا کاری کی حالت میں رہنا عدالت کے نزدیک ثابت ہو۔

۵۔ طلاق حاصل کرنے کے لئے عدالت ہائے انگلستان میں ایک فریق دوسرے فریق کی زنا کاری ثابت کرنے پر مائل ہوتا ہے اور کوشش ہوتی ہے کہ فریق ثانی کی بے عصمتی یا خود سائلگی کی بے عصمتی عدالت کے نزدیک عدم ثابت نہ رہے۔

بنگال کے ایک سابق لفٹنٹ گورنر کی صاحبزادی ایک پادری کے ساتھ انگلستان میں بیاہی گئیں نکاح کے واقعات معلوم نہیں ہوئے صرف اتنا معلوم ہوا کہ نکاح کے بعد ایک نے دوسرے کو ناپسند کیا۔ اگر دونوں مسلمان ہوتے تو کچھ بھی دقت نہ ہوتی۔ ناپسندیدگی پادری صاحب کی طرف سے ہوتی تو وہ طلاق دے سکتے تھے اور اگر بیوی صاحبہ کی طرف سے ناپسندیدگی تھی تو وہ امیر کبیر کی لڑکی تھیں دولت کے زور سے شوہر کو طلاق دینے پر راضی کر لیتیں اور اسی کا نام خلع ہے۔ لیکن



قانون انگلستان اسلامی قانون سے مختلف ہے یعنی اس اصول پر مبنی ہے جسکا ذکر اوپر کیا گیا ہے اس میم صاحبہ کو طلاق حاصل کرنے کے لئے اپنی بد چلنی کا ثبوت عدالت کے اطمینان کے مطابق دینا لازم ہوا اور پادری صاحب کو بھی یہی راستہ اختیار کرنا ناگزیر ہوا۔ کس قدر مصیبت میں دونوں مبتلا ہوئے۔ سیدھی بات کو قانون نے خواہ مخواہ ٹیڑھا کر دیا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یورپ کے قانون میں بڑی آزادی ہے لیکن اگر اسی کا نام آزادی ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ یورپ میں کچھ بھی آزادی نہیں ہے۔ مناکحت کا معاملہ اور اس میں اس درجہ اخلاف عقل باتوں کو دخل ہوا اور وہ بھی یورپ ایسے مہذب ملک میں تو ہم کو سخت حیرت۔ میم صاحبہ بد چلن ہوں یا نہ ہوں لیکن ملک کے قانون نے ان کو مجبور کیا کہ وہ ایسے شخص کی صحبت سے جس سے برا ان کے نزدیک کوئی دنیا میں نہ تھا چھٹکا راپانے کے لئے اپنی عصمت کو پبلک اور عدالت کے سامنے گئی گزری ثابت کریں۔ چند سال کا ذکر ہے کہ اخباروں میں طلاق کی کیفیت یوں شائع ہوئی کہ میم صاحبہ نے ایک چٹھی اپنے شوہر کے پاس لکھی کہ سچی اور سیدھی بات یہ ہے کہ میں ایک ایسے شخص پر فریفتہ ہوں جو میرے لئے سب کچھ ہے۔ اگر آپ اس پر کچھ کرنا چاہتے ہیں تو فلاں شخص سے میرے مزید حالات دریافت کر لیجئے۔ اس چٹھی کے معنی یہ ہوئے کہ میں ناپاک حالت میں ہوں اور میری ناپاک حالت کو عدالت پر ظاہر کر کے آپ مجھ سے گلو خلاصی چاہتے ہوں تو میں آپکی مدد کے لئے یعنی اپنی برائیاں ظاہر کرنے کے لئے تیار ہوں۔

وہ چٹھی یا محض عورت کا اقبال کافی نہ تھا بلکہ جا بجا سے اور بھی رسوائی کا ثبوت درکار تھا۔ غرض کہ چند تائیدی ثبوت اور بھی بہم پہنچائے گئے۔ جن ہوٹلوں میں میم صاحبہ رہ چکی تھیں وہاں کے رجسٹر دیکھے گئے۔ منیجر کے اظہار ہوئے اور یہ دکھایا گیا کہ اپنے نئے چاہنے والے کے ساتھ میم صاحبہ برابر زن و شو کی طرح رہتی ہیں۔ عدالت کو جب ثابت ہو گیا کہ فی الواقع میم صاحبہ زنا کاری کی حالت میں رہ چکی ہیں۔ تب پادری صاحب کی گلو خلاصی کا حکم دیا گیا میم صاحبہ کا کٹھکا مٹا اور نئے چاہنے والے سے کل کارروائی کا خرچہ دلا یا گیا۔

اب آزادی کا زمانہ ہے۔ ہر جگہ عقل سے کام لیا جاتا ہے۔ مفصلہ بالا حالات ظاہر کرنے کے بعد اس میں ذرا شبہ نہیں رہتا کہ اس بارے میں مسلمانوں کا قانون یورپ کی دیگر سلطنتوں کے قانون سے اچھا ہے۔

کیا ہم اس وقت اس کہنے سے باز نہیں نہیں رہ سکتے کہ، اداونٹ پر چڑھنے والے اور ریگستان میں گھومنے والے امی محض تجھ پر یقین کرنے والے تو تجھ کو خاص فیضان الہی کا ایک



ذریعہ سمجھتے ہیں گے۔ لیکن جو سمجھ کو نہیں مانتے وہ بھی جب عقل سے کام لیتے ہیں تو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ تیری ذات با برکات خلاصہ موجودات کے ذریعہ سے جو شریعت قائم ہوئی اس کے احکام اس وقت تمام قوانین سے افضل ہیں۔

---



## فصل نمبر ۱۱

### کثرت ازدواج

آج کل یورپ میں کثرت ازدواج انتہائی بد اخلاقی ہے اور بلاد اسلام میں بغیر اس کے اخلاقی خوبیاں قائم نہیں رہ سکتیں۔ یورپ میں ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری عورت سے ناجائز تعلق رکھنا کوئی جرم نہیں ہے محض بد اخلاقی ہے۔ لیکن دوسرا بیاہ کر لینا جس کو وہاں کی اصطلاح میں پولی گیمی (POLYGAMY) کہتے ہیں ایک سنگین جرم ہے۔ یہ مسئلہ بہت زائد یورپ اور افریقہ کے ان سواحل میں زیر بحث رہتا ہے جہاں جانب مقابل میں یورپین آبادیاں واقع ہیں۔ یہ بحث وہاں خاص خاص لوگوں میں محدود نہیں ہوتی۔ بلکہ طبقہ عوام میں بھی اس قسم کے مباحثے ہوتے ہوتے ہیں۔ ایک فرانسیسی سیاح شام اور مصر کے شہروں میں سڑکوں پر رات کو روشنی کا انتظام نہ دیکھ کر حیرت سے پوچھتا ہے یہ کیسے شہر ہیں کہ ان میں رات کو روشنی نہیں ہوتی؟ ہوٹل کامری خانساماں جواب دیتا ہے: یہاں کے لوگ اپنے گھر میں ایسے خوش رہتے ہیں کہ ان کو رات کے وقت اپنے گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں رہتی اس لئے سڑکوں پر روشنی کا انتظام بھی کم کیا جاتا ہے یورپ میں لوگوں کے گھروں پر عیش و نشاط کے سامان مہیا نہیں رہتے اس لئے وہاں کے باشندے تھیٹر، سرکس، ناچ، مینمانہ، قمار خانے کی سیر کے لئے رات بھر مارے مارے پھرتے ہیں اور ان کے لئے راستوں پر روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں کے لوگ اپنی بیویوں میں ایسی خوشی سے بسر کرتے ہیں کہ ان کو ناحق کے چکر لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس جواب میں وہ خانساماں اپنے طور پر جو کثرت ازدواج کی خوبیاں کہہ گیا خاص اسی کا حصہ تھا



بیان سادہ ہے لیکن مطلب سب ادا ہو گیا۔

اس مسئلہ پر اگر عالمانہ بحث کی جائے تو سب سے پہلے ان امور پر غور کر لینا چاہیے۔

۱۔ گرم ملکوں میں فطرتاً کثرت ازدواج کی طرف توجہ زیادہ ہوتی ہے اور سرد ملکوں میں عموماً اس سے نفرت کی جاتی ہے۔ قمریاں ہمیشہ اپنا جوڑا ساتھ رکھتی ہیں اور عروس کا طرز عمل اس بارہ میں بالکل جدا ہوتا ہے۔ اسی طرح ملکی آب و ہوا کے اثر سے انسانی طبیعت کے جذبات میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہو جاتا ہے جن اقوام میں بغیر خورد و نوش کے افطار صوم ہوتا ہے انکی تمدنی حالت ان برفستان کے باشندوں پر قیاس نہیں کی جاسکتی جہاں ایام سرما میں نباتات کی قوت نمو بھی انسان کی قوت حاسہ کے ساتھ منسوب ہو جاتی ہے۔

۲۔ دنیا کے تمام حصوں میں عورتوں کی معمولی بیماریاں اور ان کے ایام حمل و رضاعت عورتوں کو مردوں سے اکثر جدا رکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔

۳۔ عورتوں کی قوت تناسل عموماً مردوں سے بہت پہلے ختم ہو جاتی ہے۔

۴۔ تمام ملکوں کی مردم شماری سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کی تعداد مردوں سے زائد ہے۔ ان تمام باتوں پر نظر کرنے کے بعد ذرا شبہ بھی نہیں رہتا کہ مثل قمریوں کے اپنی زندگی انسان بسر نہیں کر سکتا۔ بہت سی صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ایک مرد کو چند عورتوں سے تعلق رکھے بغیر چارہ نہیں اس کے لئے دلیل و برہان کی ضرورت نہیں ہے ہر ایک کو خود اس کا وجدان سمجھا سکتا ہے دنیا میں ایسی عورتیں بہت کم ہیں جن کو متعدد مردوں سے تعلق رہا ہو لیکن ایسے مرد بہت نکلیں گے جنکو متعدد عورتوں سے تعلق رہا ہو۔ بلاد اسلام میں یہ تعلقات کثرت ازدواج کے جواز کی وجہ سے دوسری صورتیں رکھتی ہیں اور دیگر ممالک میں زنا کاری کا پیرایہ اختیار کر کے دوسری حالتوں میں نمودار ہوتے ہیں۔ لیکن نفس تعدد دونوں جگہ موجود ہے اور اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک مرد کو کئی عورتوں سے تعلق رکھنا انسانی فطرت میں داخل ہو گیا ہے۔ قانون کا کام یہ نہیں ہے کہ جذبات انسانی مٹا دے بلکہ قانون کا صرف یہ کام ہے کہ جذبات انسانی کو جہاں تک ممکن ہو مہذب کرے۔ اب اسلام نے ان جذبات کو یوں مہذب کیا کہ تعدد ازدواج کو روک رکھا لیکن چار منکوحہ بیویوں تک اسے محدود کر دیا اور اس قانون کے توڑنے والوں کے لئے ابتدائی سزاتازیانہ اور انتہائی سزاقتل تجویز کی یورپ کی جدید تہذیب نے اسے یوں مہذب کیا۔ کہ ابتدائی حالت میں یہ تعدد نامتناہی تعداد تک معاف رکھا اور آخری حالت میں صرف ایک



بیوی سے تعلق رکھنا محکوم ہے اور اس کی خلافت در زمی میں صرف زن و شو کا اختراق ممکن ٹھہرا دیا۔ لیکن ایک سے زائد بیویوں کو رکھنا کسی حالت میں جائز نہیں رکھا بلکہ اس کو جرم قابل سزا قرار دیا اب ناظرین فیصلہ کریں کہ جذبات انسانی کو مہذب کرنے میں کس قانون نے زیادہ ترفطرت انسانی کا خیال رکھا ہے۔ اسلام کوئی قانون محقق الامر یا مختص المقام نہیں ہے۔ کئی مرتبہ کہا گیا اور اب بھی کہا جاتا ہے کہ یہ تمام دنیا کے لئے بنایا گیا ہے اس میں زیادہ تر اصول سے بحث کی گئی ہے اور ہر موقع پر اور ہر مقام کے متعلق اس میں سہولتیں رکھی گئی ہیں۔ اس میں ازواج کے متعلق جو مسائل ہیں وہ کسی خاص قوم یا خاص ملک کے لئے نہیں ہیں۔ عرب اور افریقہ کے ریگستان اور قطب شمالی کے برفستان ان دونوں کے لئے ایک ہی قانون ہے۔ جو مسئلہ اس قوم کے لئے ہے جہاں پولی گیمی یعنی کثرت ازدواج کا رواج ہے وہی ان اقوام کے لئے بھی ہے جہاں اس کے برعکس پولی انٹرمی یعنی کئی مردوں میں ایک عورت کے رہنے کا دستور تھا اور شاید اب بھی کہیں کہیں پہاڑی ملکوں میں ایسا ہوتا ہے۔ نوجوانوں اور بوڑھوں۔ ضعیفوں اور تندرستوں۔ مفلسوں اور مالداروں، مزدوروں اور بادشاہوں سب کے لئے ایک ہی قانون ہے دنیا میں سب کی حیثیتیں یکساں نہیں ہیں بعض تو ایسے ہیں کہ ان کے لئے ایک بیوی سے بیاہ کرنا بھی داخل معصیت ہے اور کتنے ایسے ہیں کہ چار بیویاں ہوں تو وہ چاروں کے ساتھ عدل کر سکتے ہیں اور ان چاروں کو خوش رکھ سکتے ہیں ان تمام امور کے لحاظ سے قرآن کی سورہ نساء کو ع اول میں محکوم ہے۔ 'اپنی مرضی کے مطابق دو تین چار عورتوں سے نکاح کر لو لیکن اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ کئی بیویوں میں برابری کا برتاؤ نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی کرو یا جو لونڈی تمہارے قبضہ میں ہے اسی پر قناعت کرو۔ بے العافی سے بچنے کے لئے یہی تدبیر قرین مصلحت ہے۔'

اس آیت میں عورتوں کے حقوق کا زیادہ تر لحاظ رکھا گیا ہے اور انھیں کے فائدے کیلئے یہ منصوص ہوا ہے۔ مردوں کے حقوق کا بڑھانا اور عورتوں کے حقوق کا گھٹانا ہرگز اس سے مقصود نہیں ہے۔ اس آیت سے مراد ظاہر ہے کہ ایک بیوی سے زائد کی اجازت کن شرطوں اور قیدوں سے گھری ہوئی ہے بے شک مستحسن ہے ایک بیوی کا کرنا لیکن ان عدل کرنے والوں کے لئے یہ استحسان نہیں ہے جن کو بغیر چند بیویوں کے اطمینان قلب جس پر دونوں جہاں کی کامیابیوں کا مدار ہو سکتا ہے بیویوں میں عدل قائم رکھنے کا مفہوم آئندہ ازواج مطہرات بنی کے بیان میں درج کیا جائے گا۔

لے فانکھو ما طاب لکم من النساء شنی وثلت وربع فان خفتن الا تعدوا فواحدة او ما حکمت الی انکم ذلک ادنی الا تعدوا۔



ان تمام امور کے ساتھ ہم یہ بھی کہیں گے کہ بعض اقوام کا تمدن کثرت ازواج کے لئے مناسب نہیں ہے مثلاً ہندوؤں میں کثرت ازواج جائز ہے لیکن بہ لحاظ ان کے طریقہ تمدن کے جائز نہیں ہونا چاہئے۔ ان کے یہاں جو حالت زناشوئی ہے یا انکی عورتیں جس طور سے رہتی ہیں اس پر کثرت ازواج کا مستزاد کرنا بیچارہ عورتوں کی حالت زار سے بالکل فراموشی کرنا ہے۔ انکو کچھ مہر نہیں ملتا۔ میکہ کے تعلقات بالکل قطع ہو جاتے ہیں۔ مردوں پر ان کا کچھ دباؤ نہیں ہوتا۔ طلاق لے کر وہ عقد ثانی نہیں کر سکتیں یہاں تک کہ شوہر کے مرنے پر بھی وہ دوسرا بیاہ نہیں کر سکتیں۔ ان تمام مجبور یوں کے ساتھ اتنا اور مستزاد ہوا کہ شوہر دوسری بیویاں لائے اور اب سابق بیویوں کو بجز لونڈیوں کی طرح جھاڑ دینے کے اور برتن مانجھنے کے اور کوئی تعلق نہ رہا یا شوہر نے کچھ انسانیت کو راہ دی تو ان کی کوٹھڑیوں کی کنجیاں ان کے پاس رہنے دیں تو اس طرح لونڈیوں سے بڑھ کر ماواؤں کی سی حیثیت قائم رہی۔ بہر حال ہندوؤں کا تمدن کثرت ازواج کے لئے بالکل نامناسب ہے اور اسی طرح جن مسلمان گھروں میں تمام امور متعلقہ ، ازواج میں رسم ہنود کی پیروی ہے وہاں بھی کثرت ازواج ضرور ایک اخلاقی جرم ہے۔ جن لوگوں نے مسلمان ہو کر کثرت ازواج کے خلاف رسالے لکھے ہیں اگر وہ اپنے رسالے میں اتنا اور بڑھا دیتے کہ مسلمانان ہند کی تمدنی حالت کے اعتبار سے کثرت ازواج درست نہیں ہے تو ٹھیک ہوتا۔ کوئی قانون اچھے سے اچھا ہو جب تک اس کے تمام اجزا پر عمل نہ کیا جائے وہ مفید ثابت نہیں ہو سکتا لیکن جن لوگوں نے اس نازک فرق کو سمجھے بغیر نفس کثرت ازواج کو برا بتایا ہے اور حدیث اور قرآن کے معنوں میں تاویلیں کر کے اسلام کا رکھ رکھاؤ کیا ہے سخت غلطی کی ہے۔ میں نہایت ادب سے ان کی تحریروں کی نسبت یہ لکھوں گا کہ تمدن اسلام کی صورت ان کے ذہن میں نہ تھی اور جو چیز کہ انہوں نے بری بتائی ہے فی الواقع وہ نہایت اچھی ہے۔ اسفین تحریروں کا نتیجہ ہے وہ کتاب جولاہور میں کثرت ازواج کے متعلق عیسائیوں کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور جس میں خود ہماری قوم کے پیشواؤں کی تحریریں ہمارے لئے مضر ثابت ہوئی ہیں۔ ہم ایک طرف کثرت ازواج کو برا سمجھ کر اس کی برائیاں دکھاتے ہیں اور اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کثرت ازواج مسلمانوں میں جائز ہے مگر بدترین عمل سمجھا گیا ہے اور دوسری طرف وہ کتاب والا دکھاتا ہے کہ پیغمبر خدا نے وفات کے وقت گیارہ ازواج مطہرات چھوڑیں اور تمام صحابہ کبار کے پاس بھی قریب قریب بلا استثناء کے متعدد بیویاں تھیں تو گویا خود ہمارے قول سے پیغمبر خدا اور صحابہ پیغمبر بدترین اعمال کے مرتکب ہوئے یہ سب خرابیاں صرف اس لئے پیدا



ہوئیں کہ تمدن عرب یا زنا، نکاح، طلاق، خلع کے اصول سے ہم ناواقف ہیں جس زمانہ میں اہمات المؤمنین شائع ہو چکیاں بے طلب میرے پاس آئیں اور میں نے انھیں الماری میں بند کر دیا کسی مسلمان کو دیکھنے نہیں دیا۔ لوگوں کے مانگنے پر میں صرف یہ کہتا تھا کہ جب تک تمدن عرب کا نقشہ ذہن میں نہ ہو گا اس کتاب کا پڑھنا گمراہی کا سبب ہوگا۔ اسی وقت ایک جگہ تذکرہ ہوا کہ فلاں شخص اس کا جواب لکھنے والا ہے اس شخص کی نسبت مجھے بڑی عقیدت تھی۔ میں انھیں بڑا ادیب بڑا ذہین اور محب اسلام سمجھتا تھا لیکن باوجود اس کے میں نے اپنا خیال یہ ظاہر کیا کہ وہ اس کا جواب نہیں لکھ سکتے۔ لوگوں کے پوچھنے پر میں نے کہا کہ چالیس برس کے سن میں انکی بیوی نے انتقال کیا اور انھوں نے باوجود فارغ البالی کے دوسرا بیاہ نہ کیا جو شخص ایک بیوی کا رکھنا بھی پسند نہ کرے وہ ایک سے زیادہ بیویوں کی مصلحتیں نہیں سمجھ سکتا علاوہ بریں انھوں نے اپنے بیاہ کی فکر کبھی نہ کی لیکن اپنے بیٹے کے بیاہ میں اس نے بے انتہا زحمت اٹھائی جو شخص بجائے اپنے بیاہ کے بیٹوں کے بیاہ کیلئے تمام دنیا کی زحماتیں مول لے وہ کثرت ازدواج کے متعلق جو ان خیالات سے بالکل ہی جدا تمدن پر مبنی ہے کوئی دلچسپ مضمون نہیں لکھ سکتا۔

خیر یہ تو ایک جملہ متعرضہ تھا۔ اب میں اصل مضمون کی طرف غور کرتا ہوں اور دو مہذب قوموں کے درمیان میں محاکمہ کرتا ہوں۔ مسلمان اپنی تہذیب کے زمانہ میں کسی طرح یورپین قوموں سے کم نہ تھے اور کثرت ازدواج جائز رکھتے تھے اور عیسائی اپنے زمانہ تہذیب میں اسے جرم قرار دیتے ہیں۔ میں ان دونوں قوموں کو اپنی اپنی جگہ پر حق بجانب پاتا ہوں اور یہ قول فیصل سناتا ہوں کہ جو تمدن عربوں کا تھا اس کے لحاظ سے کثرت ازدواج کا جائز ہونا عین تہذیب ہے لیکن اگر یہ پوچھا جائے کہ کس کا تمدن اچھا ہے تو میں بے تکلف کہوں گا کہ مسلمانوں کا۔ اور وجہ پوچھی جائے تو میں کہوں گا کہ یہ کل کتاب شروع سے اخیر تک پڑھی جائے تو وجہ سمجھ میں آجائے گی۔ کیونکہ یہی اس کتاب کا موضوع ہے۔ تمدن نام ہے عادت، رسم اور قانون ملکی کے مجموعہ کا۔ اور اس کتاب میں میرا مقصد مسلمانوں کے تمدن کو تمام دنیا کے تمدن پر فائق ثابت کرنا ہے اس لئے اگر یہ سوال ہو کہ اس زمانہ کی مہذب قوموں کا تمدن سابق مسلمانوں کے تمدن سے اچھا ہے تو میرا جواب ہوگا۔ نہیں۔ اور اگر یہ سوال ہو کہ یورپ کے موجودہ تمدن کے لحاظ سے کثرت ازدواج کا جرم قرار پانا کیسا ہے تو میں کہوں گا بہت مناسب اور اگر یہ پوچھا جائے کہ جن ممالک میں اسلام کے تمام قوانین پر عمل ہو وہاں کثرت ازدواج مناسب ہے؟ تو میں کہوں گا یقیناً مناسب ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ کثرت ازدواج اور دستور طلاق سے تمدنی حالت انسان کی خراب ہو جاتی



ہے۔ مفصلہ بالا تقریر پڑھنے کے بعد شاید کوئی سمجھ دار یہ نہ کہے گا کہ مسائل شرع ان امور کے متعلق تمدن انسانی کے بگاڑنے والے ہیں۔ دلیل و برہان سے جن کی پوری تشریح نہیں ہوتی ان کے لئے ہنری ہسٹم شاہ انگلستان کے حالات سمجھنے کو کافی ہوں گے ہنری ہسٹم نے تخت پر بیٹھنے کے بعد اپنے برادر متوفی کی بیوی ملکہ کیتھرائن سے بیاہ کیا۔ یہ بیاہ زیادہ تر اس شان و شوکت کا نتیجہ تھا جو کیتھرن کو اس کے شوہر کے زمانہ میں حاصل تھی عرصہ تک کیتھرن کے ساتھ رہ کر بادشاہ اس سے سیر ہو گیا تو ایک نوجوان لڑکی 'اینی بولین' پر فریفتہ ہوا۔ اس زمانے میں آجکل کی طرح زنا کاری کا رواج نہ تھا ورنہ معاملہ یہیں تک رہ جاتا۔ اور نہ کثرت ازدواج یا طلاق کا دستور تھا کہ کیتھرن کے ہوتے ہوئے یا کیتھرن کو طلاق دے کر انہی کے ساتھ بادشاہ دوسرا بیاہ کر لیتا۔ کثرت ازدواج کا تو رواج ہی نہ تھا اور طلاق کے لئے شرطیں اتنی تھیں کہ بادشاہ کے اختیار میں وہ بھی نہ تھا بادشاہ نے پوپ روم سے مدد چاہی اور یہ درخواست کی کہ پوپ بطور مذہبی پیشوا کے کیتھرن سے جدائی کرادے اور اب تک جو تعلق کیتھرن سے تھا اسے ناجائز قرار دے یا دوسرے لفظوں میں یہ قرار دے کہ اب تک کیتھرن بطور مدخولہ کے تھی منکوحہ نہ تھی تاکہ انہی کے ساتھ بیاہ ہونے میں کوئی امر مانع نہ ہو۔ دیکھیے گھر کا جھگڑا کہاں پہنچا اور کس بری طرح پہنچا۔ کیتھرن نے اپنی توہین پسند نہ کی اور اس کے خلاف کوشش کی۔ کیتھرن کا بھتیجا چارلس اسپین اور جرمنی کا بادشاہ تھا اٹلی میں بھی اس کا بہت اثر تھا پوپ کو کیتھرن کے خلاف حکم دینے کی جرأت نہ ہوئی اور ادھر شاہ ہنری سے اسے یہ ڈر تھا کہ اگر میں اس کا کہنا نہ مانوں اور یہ میرے مذہبی اثر سے خود کو الگ کر کے پراسٹنٹ ہو جاوے جب بھی برا ہوگا۔ عرصہ تک پوپ لیت و لعل کرتا رہا اور بالآخر انگلستان میں ایک کمیشن تحقیقات کے لئے بٹھایا گیا اور وڈسے وزیر انگلستان کو بھی اس کمیشن کو ممبر بنایا گیا۔ کمیشن نے بادشاہ کے خلاف رپورٹ دی جسکی وجہ سے بادشاہ بہت رنجیدہ ہوا اور خود کو پوپ کی ماتحتی سے آزاد کر کے انگلستان کا الگ آرچ بشپ تھا مس کر امر کو مقرر کیا اور وزیر کو بے وفائی کے الزام میں موقوف کر کے اسکی تمام جائیداد ضبط کرنی اور اس کے بعد بلوہ کے الزام میں اسے ماخوذ کر کے اسکی طلبی کی اور وہ راستہ میں بیمار پڑ کر مر گیا۔ اب انگلستان کی عجیب کیفیت تھی کہ جو کیتھرن کو منکوحہ کہتا قتل کیا جاتا اور جو اسے بادشاہ کی مدخولہ کہتا تھا اس کا درجہ بڑھا دیا جاتا تھا۔ گویا تمام انگلستان میں خوشامدیوں کا راج اور صاف گویوں کی تباہی تھی اس تباہی میں اس وقت تھامس مور ایک بہت بڑا محب وطن اور خدا ترس بھی آگیا احتجاج گردن مارنے کے لئے یہ شخصہ دار پڑھا یا گیا تو اس نے کہا کہ اتر آتا میرے اختیار میں ہے مگر میں خود کو اوپر ہی محفوظ پاتا ہوں



اور جب گردن مقتل پر رکھی گئی تو اس نے داڑھی نیچے سے نکال لی اور بولا کہیں یہ نہ کٹ جائے قصور میں نے کیا ہے یہ بے قصور ہے۔ اب آگے اور سٹیٹے۔ بادشاہ کو اپنی کاپال چلن پسند نہ آیا اور کیتھرن کے معاملہ سے بادشاہ گھبرا چکا تھا اس لئے اپنی کومتہ سے طلاق دینے کی بجائے اس نے تلوار سے طلاق دی اور فوراً تیسری بیوی جین سے عقد کر لیا۔ جین اپنی موت سے مری اس کے بعد بادشاہ نے ایک جرمنی عورت اپنی آف کلیوس سے بیاہ کیا یہ عورت بھدی تھی اور بادشاہ کو پسند نہ آئی اب قانون بنانا بادشاہ کے اختیار میں تھا۔ بادشاہ نے بے کھٹکے اسے طلاق دیدی اپنی آف کلیوس سے بادشاہ کی پوری دانتان گھر سے سن کر چلی تھی وہ چپکے سے اپنا طلاق نامہ پا کر غنیمت سمجھی۔ اور اس سمجھ کی وجہ سے بہت بڑی پنشن بادشاہ سے پائی اور جب تک زندہ رہی امن سے رہی۔ لیکن کرائول وزیر جس نے ایسی بھدی عورت سے بادشاہ کو پھنسانا چاہا تھا اپنا سر دیکر بادشاہ کے عتاب سے چھوٹا بادشاہ نے پھر پانچویں شادی کیتھرن ہارڈس سے کی اور اس کو بھی قتل کیا پھر چھٹا عقد کیتھرن پار سے ہوا جس نے اخیر تک ساتھ دیا۔ بادشاہ کے جوش اور ولولے کم ہو چلے تھے درنہ اس کو بھی جینا نصیب نہ ہوتا۔ جہاں طلاق کی جگہ پر قتل رائج ہو وہاں بے چاری عورتوں کا کیا بس چلے۔ مفصلہ بالا واقعات سے بخوبی سمجھ میں آ گیا کہ طبیعت کا جوش انسان کے دباٹے سے نہیں دبتا کثرت ازدواج اور طلاق اسی جوش کے دبانے کے لئے شرع میں موضوع ہوئی۔ اگر ان سے لاپرواہی کی جائیگی تو ہنری ہشتم کے محلوں کا نقشہ ہر با اختیار گھر میں نظر آئے گا یا وہ صورت دکھائی دے گی جو ریٹالڈ کے ناولوں میں ہے۔ جن گھروں میں زن ہے دولت ہے اختیار ہے جسمانی قوت ہے اور پھر یہ باتیں نہیں ہیں۔ اور یورپ میں ایسے بھی ضرور ہیں تو وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔

بعض آدمی یہ کہتے ہیں کہ پولی گیہی کے ساتھ پولی انٹری بھی روار کھی جائے تو پورا انصاف ہو جہاں ایک مرد کئی عورتیں رکھتا ہے۔ وہاں ایک عورت بھی ایک ساتھ کئی خاوند رکھ سکے تو کیا برا ہے اگر محض عیش و نشاط کے لئے مردوں کو کئی بیویوں کا رکھنا روا ہوتا تو بے شک عورتوں کو بھی یہ اجازت ہوتی کہ وہ کئی خاوند رکھیں لیکن کثرت ازدواج ہرگز عیش و نشاط کے اصول پر روا نہیں رکھا گیا ہے۔ گو اس کے ذریعہ سے حصول نشاط بھی ممکن ہے بلکہ اس کا جواز محض اس لئے ہے کہ وہ فطرت انسانی کے مناسب ہے اور جس طرح پولی گیہی فطرت انسانی کے موافق ہے اسی طرح پولی انٹری فطرت انسانی کے خلاف ہے۔ جو دلیلیں پولی گیہی کے جواز کی ہیں وہی دلیلین



پولی انٹری کی ناجوازی کی ہیں اس لئے صریح ظاہر ہے کہ ایک ساتھ دو ازدواج کا جمع ہونا بودی سے بودی شریعت میں بھی جائز نہیں ہو سکتا پولی انٹری بے شک کسی زمانے میں جا بجا رائج تھی لیکن بہت کم اور اب تو نہایت ہی کم ہو گئی ہے لیکن کبھی کسی مہذب قوم میں اس کا رواج نہ تھا اور اگر تھا تو قومی شعار نہ تھا شخصی حالت تھی اگر مہذب قوم کے چار پانچ انہخاص کسی من فروش عورت سے۔ یا کسی عزت دار عورت سے کسی خاص حالت میں مشترک تعلق رکھیں تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس قوم میں یہ دستور مروج ہے ابتدائے خلقت میں بہت سی ایسی باتیں تھیں جو کسی اصول پر مبنی نہ تھیں محض تن آسانی کی وجہ سے جائز تھیں۔ لوگ مچھلیاں پکڑ کر کچی کھا جاتے تھے۔ بجائے انانج کے دختوں کی پتیاں اور پھل کھاتے تھے۔ پتوں سے جسم چھپاتے تھے۔ غاروں میں گھس کر سردی اور گرمی سے اپنے جسم بچاتے تھے۔ اسی طرح اگر شروع زمانے میں کہیں یہ رواج ہو کہ بمقتضائے کہولت ایک ہی عورت پر کئی مرد قناعت کریں تو یہ بمقتضائے فطرت انسانی نہ تھا بلکہ ایک قسم کی خلاف فطرت تن آسانی تھی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مردوں کے لئے کثرت ازدواج زحمت ہے۔ بیشک اس شخص کے لئے جو ایک بیوی کا بھی بار نہیں اٹھا سکتا اسے کئی بیویاں کرنا ضرور زحمت ہے۔ لیکن معلوم رہے کہ ایسوں کے لئے کثرت ازدواج محکوم نہیں ہے۔ صفر اومی مزاج کو میٹھا کھانا مضر ہو تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ شرع نے میٹھا کو حلال قرار دینے میں غلطی کی ہے دودھ سے اگر نزلہ پیدا ہو تو دودھ کی لطافت میں کوئی کمی نہ آئے گی بلکہ کھانے والے کی غلط فاسد پر الزام عائد ہوگا۔ کھانا کھانا باعث حیات ہے مگر اس کے لئے نہیں جو پیٹے میں مبتلا ہے اسی طرح کثرت ازدواج اسی کے لئے زیبا ہے جو ہر ایک بیوی کے لئے جدا جدا گھر رہنے کے لئے اور واخر خرچ بسر اوقات کے لئے دے سکے اور خود میں یہ قابلیت پائے کہ اپنے منصفانہ برتاؤ سے ہر ایک کو راضی رکھ سکے اور جن کے پلہ ٹکا نہیں ہے اور نہ دل میں خیال حمیت ہے اس کے لئے دو بیویوں کا کرنا غیر مستحسن ہے۔ مثلاً جب ایک بیوی گھر میں تھی تو دوما مائیں کام کرتی تھیں جب ایک اور آئی تو ایک ماما تخفیف کر دی گئی اور تیسری بیوی آئی تو دوسری ماما بھی موقوف ہو گئی اب پہلی بیویاں کو طتی پیستی کھانا پکاتی ہیں گھر میں جھاڑو دیتی ہیں اور نئی بیاہی دلہن پلنگ پر چڑھی بیٹھی ہے۔ ایسے بے حمیت خاوند کے لئے کثرت ازدواج ضرور باعث زحمت ہو گا اور ایسوں کے لئے تو کثرت ازدواج موضوع بھی نہیں ہے۔ انہیں کی شان میں سورہ نسا رکوع اول میں ہے۔



اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ کئی بیویوں میں برابری کا برتاؤ نہ کر سکو گے۔ تو ایک ہی بیوی کر لو۔  
 غرض کہ جو شخص کثرت ازواج کی استطاعت رکھتا ہے۔ ضرورت رکھتا ہے اور الفصاف بھی  
 کر سکتا ہے۔ اس کے لئے کثرت ازواج ہرگز زحمت نہیں ہے بلکہ عین راحت ہے۔ جیسا کہ شروع  
 شروع مصری مسلمان کا جواب زیب عنوان کیا گیا ہے اور اگر فرض کر لیں کہ کثرت ازواج میں زحمت  
 ہے اور نفس زحمت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا تو یہ زحمت موجب تکلیف نہیں ہے۔ جتنا ہی تعلقاً  
 دنیوی بڑھیں گے ان کے ساتھ زحمتیں بھی ضرور بڑھیں گی۔ جس کے پاس صرف ایک گھوڑا سواری  
 کا ہے اسے بہ نسبت اس شخص کے جس کے پاس دو گھوڑے ہیں ضرور کم زحمت ہے اسی طرح بیویوں  
 کے بڑھنے سے ضرور زحمت بڑھتی ہے لیکن یہ زحمت ان خبیث نتائج سے بدرجہا بہتر ہے جو زنا  
 کاری سے پیدا ہوتے ہیں اور یہ پہلے کہا گیا ہے کہ کثرت ازواج محض زنا کاری سے بچنے کے لئے  
 موضوع ہے۔ ورنہ جو حضرات اپنی حالت کے اعتبار سے ایک بیوی پر قناعت کر سکتے ہیں ان کو دو  
 بیویاں کرنا بیکار ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جہاں کثرت ازواج ہے وہاں عورتیں خوش نہیں رہتیں۔ لیکن یہ غلطی ہے۔  
 عورتیں خوش رہتی ہیں مردوں کے اچھے سلوک سے۔ ایک شخص نے صرف ایک بیوی سے عقد نکاح  
 کیا لیکن اسے زنا کاری اور شراب خواری سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ اپنی بیوی سے کبھی مل سکے اور  
 اس کے پڑوس میں ایک دوسرا شخص ہے جس کے پاس چار بیویاں ہیں لیکن وہ سوائے چار کے کسی  
 پانچویں عورت کی طرف نظر بد سے دیکھنا حرام مطلق جانتا ہے اور باری باری سے ہر بیوی کے گھر چوتھے  
 روز آتا ہے اور نہایت حسن سلوک سے پیش آتا ہے۔ اس کے یہاں نہ تو شراب خواری کا چہرہ چاہے  
 نہ کسی اور منہیات سے اس کو تعلق ہے۔ عوارض جسمانی سے وہ بالکل مبرا ہے اور صحت اس کی نہایت  
 اچھی حالت میں ہے اب یہ عورت جو اپنے خاوند کی تنہا بیوی ہے صرف دیکھنے کو ہے لیکن فی الواقع بیوہ  
 کے حکم میں ہے۔ کہیں زیادہ خراب زندگی بہ نسبت اس عورت کے بسر کرتی ہے جس کے خاوند کی  
 چار بیویاں ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس بد بخت عورت کے پاس شوہر آنا چاہتا ہے اور یہ  
 چاہتی ہے کہ شوہر اپنے امراض متعدی اور خباث نفس کے ساتھ الگ ہی رہے تو اچھا۔ میرے کہنے  
 کا یہ مطلب یہ نہیں ہے کہ عورتیں اپنی سوتلوں کو ناپسند نہیں کرتیں وہ ضرور ناپسند کرتی ہیں لیکن اگر  
 کوئی عورت ایسے شخص کے ساتھ اتفاق سے بیاہی گئی جو اپنی فطرت میں ایک عورت پر قناعت



کرنے والا نہیں ہے تو اس عورت کے خوش نہ ہنے کی صرف یہ صورت ہے کہ وہ اپنے مرد کے ناجائز تعلقات چھڑوانے کے لئے جائز طور پر اس کا کسی عورت سے عقد کر دے اور اس طرح غیر متناہی معائب کا سدباب کرے۔

بعض اکابر اسلام کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس بہت سی بیویاں تھیں اور بہت سی بیویوں کو انہوں نے طلاق دی۔ شاید کسی مسلمان کا یہ فرض نہ ہو گا کہ وہ تمام اکابر دین کی عصمت ثابت کرے۔ ہم کو بحیثیت مسلمان کے صرف یہ لازم ہے کہ جب تک ہم اسلام پر قائم رہیں اس کی خوبیاں سمجھتے رہیں اور جو کوئی سمجھنا چاہے تو سمجھا دیں اور اعتراض کرے تو اس کی تشریح کر دیں لیکن اصول اسلام کی مزید توضیح کے لئے اس موقع پر یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہو گا کہ اکابر اسلام فرشتہ نہ تھے انسان تھے انسان کتنی ہی خوبیاں رکھتا ہو پھر بھی وہ انسان ہے اور انسان کی تمام خصلتیں رکھتا ہے اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ مختلف آدمیوں میں قوتوں کی کمی بیشی مختلف درجہ میں ہوتی ہے کسی میں عفتہ زیادہ ہے اور کسی کا علم بڑھا ہوا ہے کوئی زیادہ کھاتا ہے اور کوئی کم کھاتا ہے۔ ایک شخص ایک کو س بھی پاپا دہ نہیں چل سکتا اور ایک ہے کہ منزلوں چلا جاتا ہے اور نہیں تھکتا ایک شخص سردی اور گرمی ذرا بھی نہیں برداشت کر سکتا اور اسی کے بھائی جیٹھ بیساکھ میں پہاڑ سے پتھر ڈھولاتے ہیں اور ماگھ پوس میں پہاڑوں کی چوٹیوں سے لکڑیاں کاٹ لاتے ہیں کوئی ایک سیر بو جھو نہیں اٹھا سکتا اور کوئی منوں بو جھو پیٹھ پر لا کر ٹھوکی طرح پہاڑوں پر چڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایک کو آواز خوش سب سے زیادہ مرغوب ہے دوسرا آب خنک کا شیدا ہے۔ کسی کو گھوڑے کا شوق ہے کسی کو کشتی لڑنے کی لت ہے۔ عورتوں کی باتوں سے کسی کا جی الجھتا ہے اور کوئی چاہتا ہے کہ سوا عورتوں کے کوئی اس کے پاس نہ آئے۔ غرض کہ مختلف طبیعتیں ہیں اور مختلف مذاق ہیں یہ فیصلہ کرنا کہ کون سا مذاق اچھا ہے نہایت مشکل ہے۔ ہر شخص اپنے ہم مذاق اور ہم خیال کا طرفدار ہو گا۔ اسلام کا یہ کام ہرگز نہیں ہے کہ وہ کسی کا مذاق بدل دے یا جذبات انسانی کو مٹا دے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ ان جذبات میں جہاں تک ممکن ہو تہذیب اور اعتدال پیدا کرے اگر کوئی بیمار عورتوں سے دور رہے تو کوئی صفت نہیں ہے صفت اس تندرست کی ہے جس کو عورتوں کی طرف فطرتاً خاص کشش ہے لیکن وہ اس کشش کو خلافت تہذیب یا غیر معتدل حالت میں نہیں رکھتا۔ جن اکابر اسلام پر کثرت ازدواج کا الزام لگایا جاتا ہے۔ وہ برفستان کے رہنے والے نہ تھے بلکہ عرب کے رہنے والے تھے ان کے لئے کثرت ازدواج کوئی الزام نہیں ہو سکتا اگر ان بزرگوں کی نسبت کوئی یہ دکھا دے کہ لڑکپن سے مرنے تک



انہوں نے کبھی کسی غیر عورت کو نظر بد سے دیکھا۔ کبھی اپنی عورتوں میں انہوں نے خلافت عدل کیا یا کسی طرح ان کو ناخوش رکھا تو ضرور انکی بزرگی میں فرق آتا ہے۔ لیکن کوئی ایسا نہیں کہتا ہے اور نہ ایسا کہہ سکتا ہے۔ رہا کثرت ازواج یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ حضرت داؤد پیغمبر اور حضرت سلیمان پیغمبر ان سے قبل حضرت ابراہیم پیغمبر کے متعدد بیویاں تھیں۔ ہندوستان میں سری کرشن چند کی گویاں مشہور ہیں۔ راجہ دسر تھ ایسے برگزیدہ راجہ کی کئی بیویاں تھیں۔ میرے نزدیک تو جو شخص صحیح و سالم ہو اور دولت و ثروت رکھتا ہو اس کے لئے کئی بیویوں کا ہونا اس کا ثبوت ہے کہ وہ چھپ کر ناجائز تعلقات رکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ حضرت امام حسنؓ کی نسبت بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے بہت سے بیاہ کئے ہم کو حضرت امام حسنؓ کی ذاتیات سے تو ہرگز بحث نہیں ہے۔ ہم کو صرف اسلام کے مسائل کی خوبیاں بیان کرنا ہے اور اس لئے حضرت امام حسنؓ کی ذات کو ہم نہایت اچھا نمونہ اسلام کی خوبیاں دکھانے کے لئے قائم کر سکتے ہیں۔ حضرت امام حسنؓ شاہ عرب کے نواسے تھے۔ خلفائے ثلاثہ کے وقت میں وہ بے انتہا اور بار خلفاء میں پیارے تھے اور محترم سمجھے جاتے تھے۔ حضرت علیؓ کے زمانے میں شہنشاہ عالم کے دلی عہد نہیں تو خلف اکبر تو تھے اور افریقہ میں چھ مہینے کے لئے تمام ممالک شرقی کے دکن سے سرہند اور ماوراالنہر تک شہنشاہ تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان میں عورتوں سے موالت رکھنے کی خواہش بہت زیادہ تھی۔ جہالت عرب کا زمانہ عین ان کے ماقبل گزرا تھا اب ناظرین یوں عذر کریں کہ اگر اسلام نہ پھیلتا تو معلوم نہیں حضرت امام حسنؓ اپنی اس خاص قوت کی وجہ سے جو فطرت نے ان میں ودیعت کی تھی اس بارہ میں کہاں تک آزاد ہوتے۔ لیکن یہ خاص اسلام کی برکت ہے کہ حضرت امام حسنؓ ایسے شخص نے مسائل اسلام کے لحاظ سے اپنی قوت شہوانی کو اس درجہ مہذب اور معتدل رکھا کہ تمام عمر کوئی فعل ان سے ایسا سرزد نہیں ہوا جو بد تہذیبی کا کیا ذکر اعلیٰ درجہ سے بھی گرا ہوا ہو۔ طلاق انہوں نے بہت سی عورتوں کو دی لیکن کسی سے بے وفائی نہیں کی طلاق کے وقت بڑی بڑی رقمیں ملا وہ مہر کے وہ محض مطلقات کو انکی دلجوئی کے لئے دیتے تھے جو لڑکے ان کے تھے انکی پرورش و پرداخت میں بے حد اخلاق اور محبت صرف کرتے تھے۔ جو عورتیں ان کے نکاح میں آتی تھیں وہ سمجھ کے آتی تھیں کہ نکاح کو زیادہ پائیداری نہ ہوگی سب لوگ جانتے تھے۔ خود حضرت علیؓ کہا کرتے تھے کہ بڑے صاحبزادے طلاق دینے میں بے ہاک ہیں لوگ سمجھ لو جو کراہی لڑکیاں دیں۔ لیکن وہاں کا طرز تمدن ایسا تھا کہ لوگ اس کو معیوب نہیں سمجھتے تھے اور امام حسنؓ میں دوسری خوبیاں اتنی زیادہ تھیں کہ چند روزہ تعلق بھی لڑکیاں اور لڑکیوں کے اولیاء



مغنتم سمجھتے تھے۔

آنحضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی کئی ازواج مطہرات تھیں۔ آنحضرتؐ میں تمام قوتیں مکمل اور معتدل حالت میں مخلوق تھیں انکی کثرت ازواج کے اسباب بالکل وہی نہیں ہیں جو اوپر بیان کئے گئے دوسرے مصالح اور دوسری ضرورتیں بھی باعث تھیں۔ یہ ایک جدا بحث ہے۔  
فصل نمبر ۴۳ کتاب ہذا میں اس کا مفصل طور سے ذکر کیا گیا ہے۔



## فصل نمبر ۲۲

### عقد بیوگان

عرب میں عقد بیوگان زمانہ جاہلیت میں بھی جائز تھا۔ اسلام نے اسے پسند کیا اور قائم رکھا۔ اس زمانے میں ہند کے مسلمان اسے معیوب سمجھتے ہیں عقد بیوگان کا مسئلہ اتنا صاف ہے کہ اس کی خوبیاں بیان کرنا بے سود ہے اور اس لئے اس فصل میں صرف وہ باتیں درج کی جاتی ہیں جو اس بری رسم کے اٹھا دینے میں مدد دیں۔

”بیوہ لڑکی کے عقد ثانی نہ کرنے کی باز پرس خدا کے یہاں ہوگی“ شاید یہ مسئلہ ایسا عام نہیں ہے کہ تمام مسلمان اس سے واقف ہوں اس لئے اس موقع پر کچھ بیان کرنا ضروری ہے قرآن پاک کی سورۃ نور کے چوتھے رکوع میں حکم ہے تم اپنی بیواؤں کو بیاہ دو۔ اب اس سے اور زیادہ صاف حکم کیا چاہیے۔ نص قطعی موجود ہے اور اسلام نام ہے نص قطعی پر یقین کرنے اور اسکو پر از حکمت اور مناسب حال سمجھنے کا۔ تم سے یہاں بیواؤں کے اولیاء مراد ہیں پہلے باپ بھائی، چچا، مان، دادی وغیرہ اولیاء تھے۔ اب ہندوستان کے رواج کے مطابق سسر ساس دیور بھی ولی بن جاتے ہیں۔ بہر حال بیوہ جس کے اختیار میں ہو اس پر واجب ہے کہ وہ بیوہ کے عقد ثانی کی فکر کرے۔

جامع ترمذی باب صلوة میں حضرت علیؑ سے روایت ہے کہ

لے وانکھوالایامی منکم۔



فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے : علیٰ ہین باتوں میں دیر نہ کرو۔ نماز پڑھنے میں جب وقت آجائے۔ میت کے وطن کرنے میں جب جنازہ تیار ہو۔ بیوہ کے بیاہنے میں جب کوئی مناسب شخص مل جائے۔ دیکھیے نماز پڑھنے مردہ دفن کرنے کے برابر بیوہ کا عقد کرنا محکوم ہوا ہے۔ لیکن لوگ سمجھتے ہی نہیں کہ عقد بیوگان کوئی شرعی کام ہے۔

ایم کی جح ہے ایام اور ایام سے ہوا ایامی۔ اس کا ترجمہ لوگوں نے راند اور بیوہ کیا ہے لیکن لغت میں ہر مردوزن کو جو بیاہنے کے قابل ہو ایم کہتے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ بیاہی نہ گئی ہوں یا بیاہنے کے بعد موت یا طلاق نے زوج سے افتراق کر دیا ہو۔ لیکن یہاں ایامی سے مراد مرد نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ بیاہ کرنے پر مردوں کو نان و نفقہ دینا لازم ہوتا ہے اور اس سے محض ان کا جو ان ہو جانا ان پر نکاح کرنا واجب نہیں کرتا۔ کوئی یہ کہے کہ بغیر لغوی معنی کے اعتبار سے بیوہ کی شادی کی تاکید قرآن میں نہیں ہے بلکہ تمام جو ان عورتوں کی طرف اشارہ ہے۔ تو ہم یہ کہیں گے کہ اولیاء کو خدا عام طور پر حکم دیتا ہے : تمہارے قبضہ میں جو لو جو ان عورت بے خاوند کی ہو اس کو بیاہ دو : اب یہ کہنا کہ بکر کو تو ہم بیاہیں گے اور بیوہ کو نہ بیاہیں گے گویا خدا کے نصف حکم کی توہین کرنا ہے۔

اب ہم صاف طور پر دکھاتے ہیں کہ بیوہ کی خصوصیت کے ساتھ خدا کیا حکم دیتا ہے۔ سورہ بقرہ کو ع ۳۰ میں ہے : تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور چھوڑ جائیں اپنی بیویوں کو تو وہ (بیویاں) اپنے کو چار مہینے دس دن تک روکے رکھیں : خدا تو کہتا ہے کہ چار مہینے دس دن تک رکھیں اور اولیاء احکام قرآنی میں یہ ترمیم پیش کرتے ہیں کہ چار مہینے دس دن نہیں عمر بھر رکھیں۔ خدا سورہ بقرہ کے کو ع ۳۲ میں فرماتا ہے : جب تم عورتوں کو طلاق دیدو اور وہ اپنی عدت پوری کر چکیں تو پھر ان کو اس بات سے نہ روکو کہ جس کو وہ خاوند بنا چاہیں بنا لیں : کبھی عرب کے جہلا عورتوں کو طلاق دے کر ان کو دق کرتے تھے یعنی خود چھوڑ دیتے تھے اور دوسرے مردوں سے نکاح بھی نہیں کرنے دیتے تھے عورتوں کی حق تلفی کی اس ناپاک

لہ یا علی ثلاث لا توخرہا الصلوة اذانت والجنابة اذا حضرت والایم اذا وجدت لها کفو۔

لہ والذین یدنون منکم ویزرون انہ واجاتیر بص بالفسین اربعۃ اشہر وعشرا۔

یہ اذا طلقتن النساء فعلن اجلن فلا تعضوین ان نکحن ازواجن اذا ترا منوا بینہم بالمعروف۔



طریقہ کو خدا ناپسند فرمائے عورتوں کی آزادی کا یہ حکم دیا۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کتاب النکاح میں حضرت انسؓ سے روایت ہے۔ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے: میں عورتوں سے عقد کرتا ہوں جو میرے طریقہ سے منہ پھیرے وہ مجھ سے نہیں ہے۔ یعنی جو نکاح کو برا جانے وہ امت محمدی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ رہا یہ امر کہ پیغمبرؐ خدائے کیسی عورتوں سے عقد کئے تھے میں ابھی عرض کرتا ہوں کہ آپ کی ازواج مطہرات میں سوائے ایک حضرت عائشہؓ کے سب بیوائیں تھیں اور ہم لوگ ہیں کہ عقد بیوگان کو برا سمجھتے ہیں پیغمبرؐ خدا کی پیردی چھوڑ کر ہندوؤں کے پیرو بنتے ہیں۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ کنواری لڑکیاں راہ و رسم سے ناواقف ہوتی ہیں ان کے پیچھے رہنے میں اتنے خطرے نہیں ہوتے جتنے کہ بیوہ کو دوسرا بیاہ نہ کرنے میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ زیادہ تصریح کی ضرورت نہیں ہے اتنا اشارہ سمجھنے کو کافی ہے۔

ایک طرف تو پیغمبرؐ خدا فرماتے ہیں کہ نماز کا وقت آٹے تو پھر دیر نہ کر و اور اسی طرح بیوہ کا کفو کوئی پھر جائے تو پھر تامل نہ کر و اور دوسری طرف ہندوستان کے مسلمان ہیں کہ آئین بالہر اور رفع یدین پر لڑنے مرنے کو تیار ہیں نماز کی صف میں کسی کا پاؤں ذرا آگے آگیا تو پھر آنکھیں نکال کر اس پر دوڑ پڑے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اس طرح اہتمام اور بڑی بڑی باتوں میں اتنی پہلو تہی کہ اگر کوئی کہے کہ تمہارے گھر میں ایک راند بیٹھی ہے اس کا نکاح کر دو پیغمبرؐ خدا کی سنت ہے قرآن میں واجب قرار پایا ہے تو لڑنے کو تیار ہو جائیں گے۔

بھائیو! اسلام یہی من مانی بات ہے تو اسلام کا ہے کو ہے کھیل ہے جو باتیں شرع کی پسند آئیں ان کو اختیار کیا اور جو ناپسند ہوئیں ان کو چھوڑ دیا۔

عقد بیوگان کی نسبت آیہ اور حدیث کا بیان تو آچکا۔ الفاظ صاف ہیں اور مفہوم بھی واضح ہے۔ اب یہ جاننا چاہیے کہ فقہانے اس کو واجب، فرض، سنت کیا سمجھا ہے۔ سینے فتاویٰ عالمگیری کتاب النکاح میں اس کی بابت لکھا ہے: "حالت اعتدال میں نکاح سنت ہے اور حالت جوش میں واجب ہے۔ سنت موکدہ کا درجہ بھی واجب کے قریب ہی ہوتا ہے۔ لیکن یہ معلوم رہے کہ حالت اعتدال بہت کم ہوتی ہے۔ عمر کی زیادتی، یا لحوق

لہ اتزوج النساء ممن رغب عن سنی فلیس منی۔

سے انہ فی حالات الاعتدال سنتہ موکدہ و فی حالات التوقان واجب۔



امراض نہ ہو تو صبح الجسم اور کم سن عورتیں ہمیشہ حالت توقان میں سمجھی جائیں گی۔ ہر ایک اپنے اوپر قیاس کر کے اس کا مطلب سمجھ لے۔ درختار میں ہے۔ جوش طبیعت میں نکاح واجب ہے اگر نغیر نکاح کے زنا کا تیقن ہو تو فرض عین ہے۔

فرض کا ترک کرنے والا۔ ترک فرض کی ترغیب دینے والا۔ یا اس پر صریحاً یا ضمناً مجبور کرنے والا فاسق اور گنہگار ہے۔ لیکن فرض کو فرض نہ جاننے والا۔ احکام الہی کو خلاف مصلحت یا باعث توہین سمجھنے والا۔ خدا کے حکیم ہونے میں شک رکھنا ہے۔ نبی کے فعل کو برا جاننے والا کس منہ سے نبی کو رسول اللہ یعنی خدا کا پیغام پہنچانے والا کہہ سکتا ہے۔ پیغمبر خدا کے وقت میں جو منافق تھے ان کے پاس بجائے ایک سر کے دوسرے تھے۔ دو آنکھوں کی جگہ وہ چار آنکھیں نہیں رکھتے تھے وہ بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہم شکل ہوتے تھے زبان سے وہ بھی توحید و رسالت کے قائل تھے۔ لیکن آیات قرآنی کی عظمت ان کے دلوں میں نہ تھی اور نہ فعل رسول کو وہ اچھا سمجھتے تھے اسی لئے منافق کہے جاتے تھے۔ احکام شرع کو ذلیل اور خلاف مصلحت سمجھنے والا خود اپنے دل میں فیصلہ کرنے کہ وہ پیغمبر خدا کے وقت میں ہوتا تو منافق سمجھا جاتا یا مومن۔

قرآن شریف عملیات کا کوئی مجموعہ نہیں ہے اور نہ وہ سحر اور جادو کی کوئی کتاب ہے اس میں تمثیلات۔ حکایات یا صریحی احکام کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ انسان کو دنیا میں کیونکر بسر کرنا چاہیے۔ قرآن کا ماننا یہ نہیں ہے۔ کہ دس پانچ رومالوں میں وہ لپیٹ کر رکھا جائے یا بیماری میں اس کے اوراق تعویذ کی جگہ مستعمل ہوں۔ قرآن کی سچی تعظیم یہ ہے کہ اس کے احکام پر عمل کیا جائے اس کے بعد یہ ادب کی باتیں ہیں کہ وہ احتیاط سے رکھا جائے۔ بے دانتوں سے کوئی نہ چھوئے۔ پشت اسکی طرف نہ ہو۔ اونچی جگہ پر وہ عظمت کے ساتھ رکھا جائے۔ افسوس کہ یہ باتیں رہ گئیں اور اصل امر یعنی قرآن کا سمجھنا اور اس کو دستور العمل بنانا جاتا رہا۔

سبائیوں نہایت نازک وقت اسلام پر ہے۔ اسلام کی باتیں خود مسلمانوں کو پسند نہیں ہیں مسلمان نام کو رہ گئی ہے۔ جن باتوں پر مسلمانان سابق کو ناز تھا وہی باتیں اس زمانے میں باعث ہتک سمجھی جاتی ہیں۔ ایک عقد بیوگان ہی نہیں ہے دنیا میں رسم و رواج نے بہت کچھ احکام قرآنی میں ترمیم کر رکھی ہے۔ لیکن جو کچھ امید ہے وہ صرف یہ ہے کہ قرآن اپنی حالت پر ہے لوگ اس کے مفہوم کی نہیں تو الفاظ کی عظمت فرود کرتے ہیں۔ پہلے مجھے قرآن کو طوطے کی طرح پڑھنے پر ہمیشہ اعتراض رہا اب کچھ دنوں سے میری رائے بدل گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح قرآن اپنی اصلی حالت پر



تو رہے گا۔ لوگوں کے دلوں میں اس کی عظمت تو باقی رہے گی۔ رہا مفہوم سمجھنا اور اس پر عمل کرنا وہ کب تک نظر انداز رہے گا۔ قوم کی حالت ضرور بدلے گی اور آیات قرآنی پر عمل کرنے سے جس کے بغیر اسلام میں روز بروز تنزل ہے سچتر ترقی ہوگی۔ میں اسلام کی قوت یا ضعف یا ترقی یا تنزل کی نسبت ایک بالکل جدا رائے رکھتا ہوں۔ علوم جدیدہ۔ نئی روشنی اور صنعت و معرفت سے مسلمانوں کی ترقی نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کی ترقی کا ایک ہی ذریعہ ہے یعنی احکام قرآنی پر عمل کرنا۔ جب سے یہ عمل چھوٹا تنزل شروع ہوا۔ اقبال جاتا رہا۔ ادباً نے گھیر لیا۔ اور جب ترقی ہوگی تو اسی حالت میں ہوگی جب قرآن مسلمانوں کا دستور العمل ہوگا اس وقت جتنی ترقی یا فتنہ قومیں دنیا میں ہیں گو وہ مسلمان نہیں ہیں لیکن اکثر معاملات دنیا میں مسلمانان ہند سے زیادہ تر ان کا عمل قرآن کے موافق ہے اور یہی وجہ ان کے عروج کی ہے۔

اس موقع پر رسول اللہ اور صحابہ کرام کے زمانہ میں جو عقد بیوگان ہوئے ان کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ پیغمبر خدا نے ملکی حالت، قومی حالت اور ترویج دین محمدی وغیرہ وغیرہ بہت سے دینی اور دنیاوی مصالح کے اعتبار سے جن کے بیان سے تمام سیر کی کتابیں بھری ہوئی ہیں، بہت سے نکاح کئے جن میں بجز ایک حضرت عائشہ کے اور تمام عورتیں بیوائیں یا مطلقہ تھیں۔ ازواج مطہرات کے تفصیلی حالات کے لئے فصل ۲۳ کتاب ہذا پڑھنا چاہیے۔

آنحضرت کی لڑکیوں میں سے صرف حضرت رقیہؓ پہلے عتبہ ابن ابی لہب سے بیاہی گئیں پھر حضرت عثمانؓ ابن عفان کو اور حضرت ام کلثومؓ پہلے عتبہ ابن ابی لہب کو اسکے بعد حضرت رقیہؓ کی وفات کے بعد حضرت عثمانؓ غنی کو۔

پیغمبر خدا کی تو اسی حضرت اُمّہ بنت حضرت زینبؓ حضرت فاطمہؓ کے انتقال پر خود ان کی وصیت کے مطابق پہلے حضرت علیؓ کو بیاہی گئیں اور جب حضرت علیؓ شہید ہوئے تو حضرت علیؓ کی ہدایت کے مطابق حضرت مغیرہؓ ابن نوفل سے بیاہی گئیں۔

حضرت فاطمہؓ کی بیٹی حضرت ام کلثومؓ کے چار عقد ہوئے۔ پہلا امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دوسرا عون ابن جعفر طیار۔ براہ حضرت علیؓ سے تیسرا عون کے مرنے پر ان کے بھائی محمد سے پھر چوتھا بیاہ ان کے مرنے پر ان کے تیسرے بھائی عبداللہ ابن جعفر سے۔

یہیں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت عون آٹھ حقیقی بھائی حضرت جعفر طیار کے بیٹے اسماء کے لطن سے تھے اسماء نے جعفر طیارؓ کی شہادت کے بعد آٹھ بیٹیوں کی موجودگی میں اپنا دوسرا عقد حضرت



ابو بکرؓ سے کیا جس سے محمد بن ابی بکر پیدا ہوئے۔ اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ کی وفات پر تیسرا عقد حضرت علیؓ سے کیا جس سے یحییٰ پیدا ہوئے۔ دیکھئے عربوں کا طریقہ کیسا سچا اور صاف تھا۔ یہیں سے یہ بھی سمجھ میں آسکتا ہے کہ وہ لوگ زنا کو کتنا معیوب جانتے تھے اور اپنی آزادی کی کتنی قدر کرتے تھے۔

حضرت امام حسینؓ کی ماجرا دی سکینہؓ کے چار نکاح ہوئے پہلا مصعب بن زبیر سے دوسرا عبداللہ ابن عثمان بن حکیم سے تیسرا اصبخ بن عبدالعزیز بن مروان سے چوتھا زید بن عمر بن عثمان غنی سے۔

آنحضرتؐ کی پھوپھی زاد بہنوں اور پھوپھیوں کے بھی متعدد نکاح ہوئے تھے۔ آپ کی پردادی یعنی عبدالمطلب کی ماں سلمہ کے بھی دو نکاح ہوئے پہلا اجمہ بن جلاح سے اور دوسرا ہاشم سے۔ جنکی اولاد ہاشمی کہلاتی ہے۔ اگر یہ عقد بیوگان روانہ ہوتا تو فخر روزگار ہاشمیوں کا وجود دنیا میں نہ ہوتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو بات رسولؐ اور صحابہؓ رسولؐ کے زمانے میں باعث فخر تھی اور ہندوستان کے باہر تمام بلاد اسلام میں جائز ہے وہ ہندوستان میں کیوں مکروہ، باعث

ذلت اور عملاً گویا داخل معصیت سمجھی جاتی ہے؟ سوائے جہالت کے اور کوئی وجہ نہیں ہے مشہور ہے کہ ہندوؤں کی صحبت سے مسلمانوں میں بھی عقد بیوگان ناجوازی رائج ہوئی ایک حد تک یہ

کہنا صحیح ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ عقد بیوگان کی ناجوازی ہی مسلمانوں نے ہندوؤں سے نہیں لی بلکہ اپنی بہت سی عمدہ باتیں وہ کھو بیٹھے ہندوؤں کی بہت سی باتیں اختیار

کر لیں بہت سی رسمیں مسلمانوں میں ایسی رائج ہو گئیں جو شرک فی اللہ اور شرک فی النبوة کی حد تک پہنچیں۔ ہمت مستعدی۔ حمیت۔ مروانگی۔ راست ہانڈی۔ ایفائے وعدہ ہم کن کن باتوں کے

لئے روئیں۔ زمین ہند میں ہمارے تمام اوصاف باپ دادا کے ساتھ دفن ہو گئے تکبت اور ذلت کے دن دیکھنے کے لئے ہم لوگ رہ گئے ہیں اقبال نے منہ پھر لپا ادا بار نے آگھیرا اور دنیا و ما فیہا

سے غافل کسی طرح زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔ نورا ایمان کی کمی اپنے عیوب ظاہر ہوتے نہیں دیتی۔

مردوں نے صرف عقد ثانی سے روک کر عورتوں کے حقوق تلف نہیں کئے بلکہ دنیا کے تمام امور میں وہ عورتوں کو عام اس سے کہ وہ مائیں ہوں، بہنیں ہوں۔ بیویاں ہوں یا لڑکیاں

ہوں بہانہ اور لونڈیوں کی طرح سمجھتے ہیں انکے حقوق اور انکی آزادیوں کے غصب یا تلف کرنے میں کچھ بھی پس و پیش نہیں کرتے اور یہ نہیں سمجھتے کہ اسلام کو دنیاوی معاملات میں

بڑا ناز اس امر پر ہے کہ اس نے عورتوں کے حقوق کی پوری نگہداشت کی ہے۔ کوئی قوم ترقی



نہیں کر سکتی جب تک عورتوں کے حقوق کی پوری نگہداشت نہ ہو اور انکی غلامی رفع نہ کی جائے۔ مری ہوئی طبیعتیں رکھ کر اور ذلیل حالت میں رہ کر عورتیں جو اولاد جنیں گی وہ غلامی کا سبق اپنی ماں سے لے کر نشوونما پائے گی ایسی اولاد کیا خاک ترقی کرے گی۔ عورتوں کی جائز اور شرعی آزادیوں میں خلل ڈالنا گویا آئندہ نسل کی مٹی خراب کرنا ہے۔

ہندوؤں میں بدھوا بیوہ کی ممانعت زمانہ حال کی رسم ہے۔ جب ہندوؤں کی ترقی کا زمانہ تھا تو اس قسم کا خیال بھی نہیں تھا۔ کلکتہ اور بنارس کے پنڈتوں نے ادھر توجہ کی ہے۔ دہلی لاہور اور ممبئی وغیرہ شہروں میں ادھر خیالات رجوع ہوئے ہیں۔ یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ ہنود کی مقدس کتابوں میں کہیں بھی عقد بیوگان کی ممانعت نہیں ہے۔ بلکہ بعض رشیوں کے قول سے اس کی ہدایت پائی جاتی ہے۔ صاف طور پر محکوم ہے کہ شوہر کے طلاق دینے منفقودا لجنر ہو جانے یا مرجانے یا مردکی ناقابلیت کی وجہ سے عورت بے خاوند کی ہو جائے تو اس کو دوسرا بیاہ کتنے دنوں کے بعد کرنا چاہیے۔

جب ہندوؤں کی جہالت اور خود غرضی کا زمانہ آیا علم اور آزادی کا شوق جاتا رہا تو عقد بیوگان بھی مسدود ہو گیا۔ لوگ کہنے لگے کہ پہلے زمانے میں جائز تھا اور اب جائز نہیں ہے۔ گویا پہلے فطرت انسانی کچھ اور تھی اور اب کچھ اور ہو گئی ہے۔ اسی طرح جب مسلمانوں کے برے دن آئے۔ تو بہت سی بری عادتوں اور دستوروں کے ساتھ عقد بیوگان بھی ان میں محبوب ٹھہرا مشہور تو یوں ہے کہ جب ہند کی عورتوں سے خلا ملا ہوا اور وہ مسلمان ہو کر مسلمانوں کے گھر آئیں تو عقد بیوگان کی ممانعت کی نص قطعی بھی اپنے ساتھ لائیں۔ ممکن ہے کہ اور بد رسمیں اسی طرح پھیلی ہوں۔ مگر عقد بیوگان کو ناروا سمجھنے میں تو میں زیادہ تر مردوں ہی کو الزام دوں گا۔ دیکھتا ہوں کہ لڑکیوں کے پیدا ہونے سے لوگ بے وجہ ملول ہو جاتے ہیں۔ ان کا بڑھنا۔ سہاگن رہنا۔ صاحب اولاد ہونا اس خیال کے بالکل منافی ہے جو شروع ہی میں لڑکیوں کے وجود کو وبال جان سمجھتا تھا۔ ملکی رسم کے خیال سے لڑکیاں پہلی و نعم بیاہ دی گئیں۔ یہی بڑی بات ہوئی۔ بار بار ان کے بیاہ کا بار اٹھانا بھلا کب گوارا ہو سکتا ہے۔ ہندوستان میں عورتوں کی حق تلفی کو عار نہیں سمجھتے۔ بھائی بہن کے حصے غصب کرنے کو تیار ہیں۔ بعض باپ ایسے نیک بخت ہیں جو چاہتے ہیں کہ ان کے مرنے پر ان کی جائداد قرآن کے حکم کے خلاف لڑکیوں کی حق تلفی کے ساتھ تقسیم کی جائے۔ یہ بڑی شرم کی بات ہے۔ جہاں نیتیں ایسی ڈالو اور اول ہوں وہاں عورتوں کا صاحب خاوند ذی اولاد ہونا گویا ان کے دعوؤں کا اور مضبوط ہونا بھلا کب پسند کیا جائے گا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ بڑے



بڑے متمول خاندانوں میں عورتوں کے بیوہ ہونے پر اولیا خوش ہوتے ہوں گے کہ اچھا ہوا لڑکی بیوہ ہو گئی خاندان کی جائداد باہر نہیں گئی اعوذ باللہ من شرور الفسنا۔ بھائیو! خدا سے ڈرو اور احکام خدا کی محبت دل میں پیدا کرو۔ منہ سے مسلمان اور دل میں احکام شرعی سے نفرت۔ اس مناقبہ طریقہ کو چھوڑو۔

اور ملکوں میں مردوں کو زیادہ تر نکاح کی تلاش ہوتی ہے اور یہاں عورتوں کے اولیا سے جو نکاح کی بات چیت کرتا ہے تو گویا ان پر بہت بڑا احسان کرتا ہے۔ کنواری لڑکیوں کے بیاہنے میں تو یہ وقت ہے۔ بیوہ عورتوں کا بیاہ کوئی کرنا بھی چاہے تو مناسب حال شوہر کا ملنا مشکل ہے تمام واعظین لڑکیوں کے اولیا پر الزام رکھتے ہیں گو وہ کسی طرح الزام سے بچ نہیں سکتے لیکن میں ان پر بھی الزام رکھتا ہوں جنکو خواہش عقد ہوتی ہے اور اپنی طلب کا دائرہ کنواری لڑکیوں پر محدود رکھتے ہیں۔ عمر کتنی ہی زیادہ ہو۔ چوتھے پانچویں عقد کی نوبت آئی ہو جب بھی کنواری لڑکیوں کی تلاش ہوگی۔ حالانکہ یہ بالکل غلط خیال ہے۔ ایران میں لوگ بیوہ عورتوں کو ترجیح دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ راہ و رسم دنیا اور طریقہ خانہ داری سے واقف ہوں گی۔ سردست تو تمام خیالات کا بدلنا آسان نہیں ہے لیکن جب کوئی رنڈا عقد ثانی کی فکر میں ہو تو کنبہ، محلہ، شہر کے بااثر لوگ ہم عمر رانڈ عورتیں اس کے لئے تجویز کریں تو آسانی سے سنت محمدی زندہ ہو سکتی ہے حضرت عمرؓ کا قول اچھا العلوم میں نقل کیا گیا ہے۔ کہ دوہی باتیں نکاح سے منع کرتی ہیں۔ مجبوری یا بد چلنی۔ یعنی کوئی آدمی دولت اور صحت جسمانی سے ہر طرح موزوں ہوتے ہوئے نکاح سے گریز کرے تو اس کو بد چلن سمجھنا چاہیے۔ جو ان عورتیں صحت جسمانی کی حالت میں نکاح نہ کریں تو ضرور بد چلن ہو جائیں گی شریف خاندان والی عورتیں جو گھر کی چہار دیواری میں قید رہتی ہیں غیر مرد کی صورت نہیں دیکھ سکتیں وہ اپنی خاص حالت کی وجہ سے عفت مآب رہ سکتی ہیں۔ لیکن قانون فطرت میں جو زور ہے اور انسانی طبیعت میں بمقابلہ ہواؤ ہوس جو مخلوبی و دیعت کی گئی ہے وہ بھی کسی طرح نظر انداز نہیں ہو سکتی۔

مشوایمن از زن کہ زن پارساست

کہ خربستہ بہ گر چہ دزد و آتاست



اور جو عورتیں بے طرح جبر گوارا کر کے معصوم صفت زندگی بسر کرتی ہیں وہ طرح طرح کے امراض میں مبتلا ہو کر اپنی زلیلت کے دن بہت جلد ختم کرتی ہیں۔

جب کنواری لڑکی کا بیاہنا شرم نہ تھا تو راند کے بیاہنے میں کیا عیب ہے لڑکے راند سے ہو جائیں تو بیاہنے میں حرج نہیں ہے اور لڑکیاں راند ہو جائیں تو ان کا عقد ثانی معیوب سمجھا جاتا ہے کچھ عجیب منطوق ہے کہ سمجھ میں نہیں آتی۔ کیسی شرم کی بات ہے کہ ۴۰ برس کی ماں اپنے شوہر کے پاس رہے اور اس کی پندرہ برس کی بیوہ لڑکی گھر میں موجود ہو۔ ایسے بے حمیت بھی بہت سے پائے جاتے ہیں کہ پندرہ بیس برس کی بیوہ لڑکیاں ان کے گھر میں موجود ہیں اور خود چپاس ساٹھ برس کے ہو کر عقد ثانی کرتے ہیں۔

صحیح بخاری کتاب الادب میں حضرت ابو حریرہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ایک مسافر راستہ چلا جاتا تھا اسے پیاس معلوم ہوئی۔ قریب ایک کنواں نظر آیا اس کنویں میں وہ اتر گیا اور پانی پی کر باہر نکلا۔ دیکھا کہ ایک کتا زبان نکالے غم مٹی چاٹ رہا ہے۔ وہ پھر کنوئیں میں اتر گیا اور اپنے جوتے میں پانی بھر کر اس جوتے کو منہ سے تھام کر اوپر نکلا اور کتے کو پانی پلایا۔ اب ان بے حمیتوں کو دیکھئے کہ گھر کی راندوں کے ساتھ اتنا سلوک بھی نہیں کرتے جتنا کہ اس مسافر نے کتے کے ساتھ کیا تھا۔ بے چاری بے زبان راندوں پر ظلم کرتے ہوئے ان کو شرم نہیں آتی۔

مردی نہ بقوت ست و شمشیر زنی آنت کہ ظلمی کہ تولنے نہ کنی

کیا لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ عورت اور مرد کی یکجائی انتظام عالم کے لئے ضروریات سے ہے انسان اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا خدا نے انسانی فطرت میں ایسی قوت رکھی ہے کہ قانون فطرت کی غرض کبھی فوت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس یکجائی میں اولاد کا ہونا لازم ہے۔ اولاد کی پرورش اور حسن معاشرت کے لئے باپ کا جائز طور پر مقرر ہو جانا ہی نکاح کی غایت ہے۔ نوع انسانی کا گھٹانا قانون فطرت کا بڑا جرم ہے۔ ہر مذہب نے اسے تسلیم کیا ہے تمام حکومتیں اس کی حمایت کرتی ہیں ۱۸۸۱ء میں جو مردم شماری ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ پانچ کروڑ ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان ہندوستان میں تھے جن میں تقریباً ڈھائی کروڑ مرد تھے اور اسی قدر عورتیں تھیں ان عورتوں میں ۴۰ لاکھ سے کچھ زیادہ بیوائیں تھیں یعنی کل عورتوں میں ایک سدس کے قریب بیوائیں تھیں۔ اگر دو ثلث جوان فرض کی جائیں



لو امت محمدی کی ترقی میں لوہے کی نکی عقد بیوگان کو ناروا سمجھنے سے ہوتی ہے۔  
 مزا تو یہ ہے کہ جب لڑکی بیوہ ہو جاتی ہے تو لوگ اسے کم بخت سمجھتے ہیں اور نہایت  
 محبت سے کہتے ہیں کہ ہائے یہ بد نصیب جلنے کے لئے بیٹھی رہ گئی اور جو کہیں اتفاق سے  
 وہ لڑکی بھی مرگئی تو بہت خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ بیوی خوش نصیب تھی کہ دنیا سے  
 اٹھ گئی۔ پتھر پڑیں اس سمجھ پر۔ جہاں ہندوؤں میں مرد کی چٹا پر عورتیں زندہ جل جاتی تھیں تو  
 لوگ خوش ہوتے تھے۔ وہاں عورتیں اپنی موت سے مر جائیں تو بھلا کب افسوس ہو سکتا ہے  
 عورتیں ایسی ہی فال تو ہیں تو پیدا ہوتے ہی مار ڈالی جائیں تو اور اچھا۔ شرم! شرم! شرم!!!  
 جب قوم کی یہ کیفیت ہے کہ وہ رانڈ کا مرزا مبارک فال سمجھتے ہیں تو یہ تذکرہ کرنا فضول  
 ہے کہ با عصمت رانڈوں کو کیا کیا بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن ترتیب گفتگو کی تکمیل کے لئے ان  
 کا بیان بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بیاہ نہ کرنا گویا قانون فطرت کے خلاف کرنا ہے۔ بیوائیں قانون قدرت پر تو غالب  
 نہیں آسکتیں خود مغلوب ہو کر اخلاق الرحمہ۔ تپ دق۔ مایخویا۔ جنون۔ عشق۔ مرگی۔ غشی  
 و سواس وغیرہ وغیرہ بہت سے امراض میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اولیا جب کبھی علاج کے لئے  
 مستعد ہوئے تو حکیم صاحب فصد۔ جلاب۔ ٹھنڈا تجویز کرتے ہیں اور اصل علاج بتلاتے ہوئے  
 شرماتے ہیں اور بیوائیں ان نادان طبیوں کی تشخیص پر زبان حال سے کہتی ہیں۔

اَف اَف ستم اے طبیب ناداں

رجم مفرائے با مداداں!

آگاہ نہی تپ درون را

نشرچہ زنی رگ جنون را

چشمے بدل مشوش انداز

قارورہ بر در آتش انداز

ایں شیشہ دل کہ پر ز خون است

داری نظریے بسیں کہ چون است

اور اپنے اولیاء سے کہتی ہیں۔

خونخواری عشاق جگر خوار چہ دانی

آسودہ و لا حال دل ز ارچہ دانی



شب تاب سحر خفتہ بخلو تگہ نازی      بیداری این دیدہ بیار چہ دانی  
 لے فاختہ پرواز کناں بر سر سرے      درد دل مرغان گرفتار چہ دانی  
 احتناق الرحم کی وجہ سے کبھی کبھی وہ حالتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ لوگوں کو آسیب، بھوت چڑیل  
 کا شبہ ہوتا ہے اور پھر اسی دھوکے میں ہزاروں شرک اور کفر کی باتیں ہو جاتی ہیں۔ مایخویا میں  
 بھی کبھی کبھی آسیب کا گمان ہوتا ہے اور ہر طرح کے افعال ناکردنی اس کی بدولت کئے جاتے ہیں۔  
 غرض کہ با عصمت بیوائیں مختلف امراض میں مبتلا ہو کر مر جاتی ہیں اور انکی تربت پر جلی قلم سے یہ  
 شعر کندہ ہوتا ہے۔

بلوح تربت من یافتند از غیب تحریرے      کہ این مقول را غیر از گناہے نیت تقصیرے  
 امام الہند مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہ رسالہ عقد بیوگان میں لکھتے ہیں۔  
 ” از جملہ رسوم فاسدہ مخالف شرع کہ در کفر ہندوستان اشتهار دارد و بعضی  
 از سفہائے مسلمین کہ بایشان اختلاط میدارند آموختہ التزام نمودہ اند مما لغت  
 زنان بیوہ ست از نکاح ثانی۔ وہمچنین معیب دانستن طلاق و اہانت بیوہ زن کہ  
 نکاح ثانی کردہ باشد وہمچنین اہانت زنان مطلقہ و این امور و این ممانعت چنان کہ  
 مخالفت شرع است ہم چنان مخالف رسوم جمیع مسلمین است چہ مجمع اہل اسلام ملک  
 عرب و روم و توران و سیستان است و در ان دیار ہرگز این امر عار نیست۔ نہ دریں  
 خبر و زمان نہ پیشتر از ان و طرفہ تر این است کہ چند از سفہائے مسلمین ہندوستان کہ  
 خود را بشر فاعر ملقب ساختہ اند۔ نسبت نسب خود را بصحابہ کبار و ائمہ اطہار کہ روسائے  
 عرب بودہ اند افتخار خود می انکارند و پر ظاہر است کہ رسوم مذکورہ یعنی نکاح ثانی زنان  
 بیوہ و طلاق منکوحات عند الحاجت درایشان جاری بود پس گویا این صحابہ بزرگان خود را کہ  
 شرافت ازایشان یافتہ اند لعن می کنند و رسمایشان را عاری انکارند پس ایق بحالایشان  
 آنت کہ خود را از زمرہ سادات و شیوخ نہ شمارند۔“

” نہ سے سفاہت این تھا کہ خود را بشر فاعر ملقب ساختہ اند بنا بر پاسداری چندے  
 کفرہ از ہندوستان آباؤ اجداد خود را کہ افضل خلائق بودہ اند مطعون و ملام می سازند  
 زیرا کہ نکاح ثانی زنان بیوہ متوفی عنہا یا مطلقہ را عار و ننگ می شمارند پس فی الحقیقت  
 آل پیشوایان دین کہ بیخ و بنیاد شرافت و نجابت بسببایشان مستحکم گردیدہ بسوئے



دے ناموسی نسبت می کنند۔ اعاذنا اللہ من شر وادلک المنافقین الفالین ۱۱

ترجمہ :- بہت سی ایسی رسوم فاسدہ مخالف شرع ہندوستان کے کافروں میں شہرت پذیر ہیں جن کو بے وقوف مسلمانوں نے بھی میل جول رکھ کر سکھ لیا ہے اور خود پر لازم کر لیا ہے۔ بیوہ عورتوں کو نکاح سے روکنا بھی اسی قبیل سے ہے۔ طلاق کو برا جانتا۔ اس بیوہ عورت کی اہانت کرنا جس نے دوسرا نکاح کر لیا ہو اور ایسا ہی جن عورتوں کو طلاق ملی ہو ان کی توہین کرنا۔ یہ سب امور اور یہ نکاح سے روکنا جس طرح مخالف شرع ہے اسی طرح تمام مسلمانوں کی رسوم کے بھی مخالف ہے۔ کیونکہ مجمع اہل اسلام ملک عرب و روم، توران۔ سیستان ہے اور ان ملکوں میں اس امر سے ہرگز عار نہیں ہے نہ اس زمانے میں اور نہ اس سے پہلے۔ زیادہ طرفہ یہ ہے کہ ہندوستان کے چند بے وقوف مسلمان جو اپنے آپ کو شرفدار کا لقب دیتے ہیں اپنے نسب کو صحابہ کبار آئمہ طہار سے (جو روسائے عرب تھے) منسوب کرنے میں اپنا فخر سمجھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ رسوم مذکور یعنی بیوہ عورتوں کا نکاح کرنا اور ضرورت کے وقت نکاحی عورتوں کو طلاق دینا ان میں جاری تھا پس گویا کہ یہ احمق اپنے بزرگوں کو جن سے شرافت پائی ہے طعنہ دیتے ہیں اور ان کی رسم کو عار سمجھتے ہیں۔ ان کو مناسب ہے کہ اپنے کوسادات اور شیوخ کے گروہ میں نہ شمار کریں۔ وہ احمق گروہ جس نے اپنے آپ کو شرفدار کا لقب دیا کیسا بے وقوف ہے کہ ہندوستان کے چند کفار کی خاطر داری سے اپنے آباؤ اجداد کو جو بزرگ ترین خلائق تھے مطعون اور قابل ملامت بنا رکھا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی کو (خاندان کے قضا کرنے یا طلاق پانے پر) ننگ و عار سمجھتے ہیں۔ اور اس طرح فی الحقیقت دین کے ان پیشواؤں کو جن کے باعث شرافت اور نجابت کی جو مستحکم ہوئی ہے بے حمیت اور بے ناموس بتاتے ہیں ان گراہنا نقول کے شر سے خدا ہم سب کو پناہ دے۔

عوام میں چند جیلے عقد بیوگان کے خلاف مشہور ہیں۔ قرآن اور حدیث اور سنت نبوی سے خلاف کرنے یا کہنے کی جرأت تو مسلمانوں کو نہیں ہو سکتی بہانوں سے کام لیتے ہیں۔ جو شیطان و سوسوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ مثلاً

لوگ کہتے ہیں عقد بیوگان شرافت کے خلاف ہے۔ اس کا جواب سوا اس کے کیا دیا جائے گا کہ خود کو پیغمبر سے زیادہ شریف سمجھنا احکام قرآنی کو خلاف شرافت جاننا ضلالت نہیں ہے تو کیا ہے۔



بعض کہتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا نے ایسا نہیں کیا ہے تو ہم کیوں کریں۔ کفار عرب بھی دعوت اسلام پیش کرنے پر ایسا ہی کہتے تھے۔ سورہ بقرہ کو ع ۲۱ میں ہے۔  
 اور جب ان کو کہا جاتا ہے چلو اس حکم پر جس کو اللہ نے اتارا ہے۔ تو کہتے ہیں۔ نہیں ہم تو اس پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ گو ان کے باپ دادا نادان و گمراہ رہے ہوں۔“

لیکن اس سے قطع نظر کر کے میں کہتا ہوں کہ باپ دادا سے ہندوستان ہی کے مسلمان کیوں مراد لئے جائیں مسلمانان سابق کیوں نہ دیکھے جائیں جن پر مسلمانوں کو فخر ہے۔ باپ دادا کو ناحق بدنام کرنے والے صریح جھوٹ بولتے ہیں۔ باپ دادا کا طرز زندگی ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ نکاح ثانی رائج ہونے سے عورتوں کو اپنے خاوندوں کی محبت نہ رہے گی واہ کیا معقول حجت ہے۔ سچی محبت تو اسی وقت ہوگی جب سچائی اور آزادی کے ساتھ خیالات کا اظہار ہوگا دوسرے یہ کہ زن دشوکی محبت فطرتی ہے۔ مرد تو دوسرے نکاح سے ممنوع نہیں ہیں پھر وہ عورتوں سے کم محبت کیوں نہیں رکھتے۔

جہلا کہتے ہیں کہ دوسرا بیاہ کرنے سے اولاد کی محبت کم ہو جائے گی۔ اول تو یہ تمام بیواؤں سے متعلق نہیں ہے دوسرے یہ کہ اولاد سے جو فطری محبت عورتوں کو ہے وہ کبھی کم نہیں ہو سکتی ماں کی محبت بچوں کے کس کام کی۔ باپ کی محبت جس کی بدولت بیٹے پلتے ہیں نکاح ثانی سے کم ہو جاتی ہے تو مردوں کا نکاح بھی ناروا سٹھرا دینا چاہیے۔ اپنے ذاتی منافع میں تو لوگ کسی کی پیروی یا تقلید ضروری نہیں سمجھتے بیچاری مظلوم بیواؤں کے فائدے کی صورت میں ناحق کا بہانہ پیش کیا جاتا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر بیواؤں کا نکاح کیا جائے تو اولاد کہاں بیاہی جائے گی۔ واہ کیا معقول حجت ہے۔ اچھا لوگ بازاری عورتوں سے نکاح کرتے وقت یہ کیوں نہیں سوچتے؟ اور پھر نکاح کے وقت یہ کیوں نہیں سوچتے کہ بچہ پیدا ہوگا تو کھائے گا کہاں سے۔ بھائیو! یہ سب خدا کے اختیار میں ہے۔ یہ سوچنا کہ کل کیا ہوگا انسان کے ضعف ایمان کی دلیل ہے۔ بعض کفار

لے اذا قیل لهم اتبعوا ما انزل اللہ قالو بل نتبع ما الفینا علیہ ابائنا اولوکان اباہم ولا یعقلون شیئا ولا یمتدون۔



عرب لڑکیوں کو مار ڈالتے تھے ان کی شان میں خدا کتنا ہے۔

اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے نہ مارو۔ ہم تم کو بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی۔  
جن لوگوں نے عقد بیوگان جاڑ رکھا ہے ان کے کنبے میں کہیں شادی بیاہ رکا رہا ہے۔ ہرگز نہیں۔

جہلا کہتے ہیں کہ بڑے لوگ عقد بیوگان روارکھیں۔ علمائے وقت نمونہ دکھائیں تو ہم بھی ایسا کریں یہ حجت گوست ہے لیکن قوم کے بااثر لوگوں پر ضرور الزام عائد کرنے والی ہے کہ وہ اپنے فعل سے سنت نبوی زندہ کرنے میں اور قومی حقوق ادا کرنے میں پہلو تہی کرتے ہیں۔

### ہندو بیواؤں کی فریاد

ضلع گورکھ پور میں ایک متمول خاندان کی ایک بیوہ برہمنی اس جرم میں عدالت سنشن سپرد کی گئی کہ اس نے اپنی لڑکی پیدا ہوتے ہی مار ڈالی تھی ناظرین خود بخود سمجھ جائیں گے کہ لڑکی حمل حرام کی تھی اور شرم سے اس عورت نے مار ڈالی۔ فی الواقع اس عورت پر یہی الزام تھا پولیس اور سپرد کرنے والا مجسٹریٹ دونوں ایسا ہی سمجھے تھے۔ محض اتفاق تھا کہ جج کے نزدیک ثبوت قابل اطمینان نہ تھا اور اس لئے محض اخفائے موت نے جرم میں حسب دفعہ ۳۱۸ تعزیرات ہند بیوہ کو ۹ ماہ کی سزا دی گئی۔

ملزمہ بار بار یوں کہتی تھی کہ کوئی اپنے بچے کو بھلا کیوں مار ڈالے گا اس کی یہ حجت دوسرے ملکوں کے طرز تمدن پر لحاظ کر کے کتنی ہی با وقعت ہو لیکن افسوس کہ ہندوستان میں اس گفتگو کو کچھ وقعت نہیں ہے۔ جج اور تمام تماشائی ضرور سمجھتے تھے کہ جو حجت ملزمہ پیش کرتی تھی وہ خود ملزمہ کے دل میں بھی بے وقعت تھی۔ جس وقت ملزمہ کو قید کا حکم سنایا گیا خوشی سے اس کا چہرہ بدل گیا وہ سمجھی کہ گویا پھانسی سے اتاری گئی اپنے ایک دوسرے نابالغ بچے کی پرورش اور اپنے اثاثہ خانہ کی بابت جیل جاتے وقت جو اس نے ہدایت کی وہ بہت دل ہلا مینے والی تھی۔ شروع سے اخیر تک یہ نہایت حیرت افزا اور دروانگیر نظارہ تھا۔ ہم اپنے مضمون کے اغراض کے لئے یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اس عورت کو پھانسی دیدی گئی

لے لا تفتلوا اولادکم من املاق سخن رزقکم دایا ہم



یہ نہ سہی اس کی اور ملکی بہنیں سیکڑوں ہزاروں اس جرم میں سچائی پانچکی ہوں گی۔ ہم کو یہاں منصفانہ طور پر یہ رائے قائم کرنا ہے کہ اس بچہ کے قتل کا اور اگر وہ بیوہ سچائی پانچائی تو اس کے یا اور جتنی بیوائیں اس جرم میں پہلے سچائی پانچکی ہیں ان سب کے خون کا الزام کس کی گردن پر ہے۔

اصل باعث اس سب فساد کا وہ شخص ہے جس نے عورت کے ساتھ ہمبستری کی۔ نہیں۔ نہیں! اس کا کچھ قصور نہیں۔ بیوہ عورت کے ساتھ تعلق پیدا کرنا اس وقت کسی مہذب گورنمنٹ کے قانون میں منع نہیں ہے۔ ہندوستان میں جو مجموعہ تعزیرات جاری ہے۔ گو وہ ان تعلقات میں اور ملکوں سے کسی قدر سخت ہے لیکن اس نے بھی اس کو ناجائز نہیں ٹھہرایا ہے۔ ہاں مذہب اسلام اس بارے میں بہت سخت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی، آسانیاں بھی قابل لحاظ ہیں۔ ہزاروں قسم کی آسانی اور سچی آزادی ہم پہنچانے کے بعد وہ حکم لگاتا ہے کہ تم ان آسانیوں پر لحاظ نہ کرو گے۔ خدا کی نعمت کو جائز اور آسان طریقہ کے ہوتے ہوئے ناجائز طریقہ سے اپنے کام میں لاؤ گے تو تم کو سخت سزا دی جائے گی غرض کہ مسلمانوں کے قانون کا شمار نہ کیا جائے جس میں سختی کے ساتھ نرمی بھی ہے تو کسی مہذب ملک میں یہ شخص مجرم نہ سمجھا جائے گا۔

اب رہی وہ عورت اس کی نسبت قتل طفل کے قبل تک کوئی تعزیری احکام متعلق نہیں ہوتے۔ یہاں تک وہ گویا نہایت جائز طور پر قانونی زمینہ پر چڑھتی ہوئی چلی گئی۔ انتہائی بلندی تک غار میں گرنے کی جو صورت پیدا ہوئی وہی صورت زیر بحث ہے۔ ہمارے نزدیک وہاں تک پہنچنے کے بعد وہ کسی طرح با مخالفت کے جھونکوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی وہ گڑھے میں گر پڑنے پر مجبور تھی اور یہی مجبوری ہمارے نزدیک قابل بحث ہے کہ آیا یہ فطرتی طور پر ہے یا ملکی رسم و ملکی قانون کی بددلت ہے۔

ایک باشرم عورت جب اپنے شوہر کے مر جانے پر تمام عالم کو تار یک دیکھتی تھی اور یہ سمجھتی تھی کہ رسم و رواج اور ملکی قانون کی بے جا پابندیوں نے تمام ذرائع آسائش ہمیشہ کے لئے اس سے الگ کر دیئے۔ انتظام عالم کے فطرتی کاروبار میں وہ وجود معطل رہ گئی۔ اپنے یگانے اس کی زندگی کو وبال سمجھنے لگے تو تمام دنیا کی نظروں میں ذلیل اور سب کے خیال میں بار ہو کر زندگی بسر کرنے سے جان دے ڈالنا اس کے نزدیک کہیں اچھا نظر آیا۔



اور پھر گھروالوں کی خواہش بھی محرک ہوئی تو دیوانہ راہوٹے بس است" کا مضمون ہوا۔ تمام گھروالے جب اس کا جل کر خاک ہو جانا چاہتے تھے تو وہ بے چاری کس کس کا مقابلہ کرتی۔ فرط غم۔ فرط جفا۔ آئندہ زندگی کی تلخ کامیوں کا خیال دریا میں کود پڑنے پر اسے ماٹل کرتا تھا اور گھر کے لوگ ہوائے تند کی طرح اسے بہا کر موج آب میں اس طرح ڈالتے تھے کہ وہ پھر نکل نہ سکتی تھی۔ بیوہ نے اپنی آئندہ زندگی کو خیال کر کے جب اپنی جان دے ڈالنے میں یعنی سستی ہو جانے میں آسانی دیکھی تو اس کو گورنمنٹ نے قانون کے ذریعہ سے روک دیا لیکن ان اندرونی حالات کی کچھ درستی نہ کی جس کے ذریعہ سے اس بے چاری کو جان دے ڈالنا آسان تھا گورنمنٹ نے مرنے والی کو چتا پر جل بھن کر خاک ہو جانے سے تو روک لیا لیکن ان زحمتوں کا کچھ بھی خیال نہ کیا جو اس کو سسرال یا میکے کے جیل خانے میں اٹھانی پڑتی ہیں۔ گورنمنٹ نے اسے ہی خواہاں قوم پر چھوڑا تھا۔ لیکن سیکڑوں ہزاروں گریجویٹ ہر سال کالجوں سے نکلتے ہیں روشن خیالی اور اعلیٰ تعلیم کا خواب دیکھتے ہیں۔ مگر اس طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

ملکی قانون یا رواج نے خلاف عقل یہ حکم دے رکھا ہے کہ انتظام عالم کے کتنا ہی خلاف ہو۔ قانون فطرت کتنا ہی اپنا زور دکھائے لیکن بیوہ گو وہ کتنی ہی کم عمر ہو کسی مرد سے ایسا تعلق پیدا نہیں کر سکتی جو برادری کے سامنے جائز ہو۔

صرف برادری ہی کے سامنے نہیں بلکہ ملکی قانون کے نزدیک بھی اس کا کسی سے جائز تعلق پیدا کرنا ممنوع ہے۔ جائداد شوہری پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد اگر بیوہ کسی سے چھپا ہوا ناجائز تعلق پیدا کرے تو بہت سے فیصلے اس کے شاہد ہیں کہ وہ جائداد شوہری سے بیفیل نہ ہوگی لیکن اگر وہ دوسرا بیاہ کرے اور اعلانیہ تعلق جائز پیدا کرے تو وہ جائداد سے بالکل بے تعلق ہو جائے گی۔

ایک بیوہ جس کے قبضہ میں ہزاروں لاکھوں روپے کی جائداد ہے اس سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی تمام جائداد پر لات مار کر کسی جوگی کے ساتھ جو گن بن کر گھر سے نکل جائے گی اور عیش و انبساط کے ساتھ سچی آزادی کا لطف اٹھائے گی انسانی کمزوریوں پر نظر کر کے ہر شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ بیواؤں سے ایسی توقع کرنا امر محال۔ کافر ص کرنا ہے۔

ملکی رسم اور ملکی قانون نے گویا بیواؤں کو مجبور کر رکھا ہے کہ وہ ناجائز تعلق مردوں سے رکھیں اور حتی الوسع اسے مخفی رکھیں یہیں پر ہم یہ کہنا بھی مناسب سمجھتے ہیں کہ صحت جسمانی او



آزادی حاصل ہونے کے بعد یہ غیر ممکن ہے کہ تو والد و ناسل کا سلسلہ جاری نہ ہو جائے قانون فطرت انسانی کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ جس نے عالم پیدا کیا اور جس نے یہ مقدر کر دیا کہ روز بروز عالم کی ترقی ہوتی رہے گی اسی نے انسان کو مجبور محض کر کے اس میں وہ قوت و دیعت کی ہے جسکو انسان جب تک انسانیت کی پوری حالت میں ہے کسی طرح دبا نہیں سکتا۔ بیوہ حالت صحت میں ہے یا بعض خاص خاص شریف خاندانوں کی عورتوں کی طرح گھر کی چہار دیواری میں جس سے دوام بغیر عبور دریا ئے شور کی سزا نہیں بھگت رہی ہے تو ایسی صورت میں اس عورت سے یہ توقع رکھتی کہ وہ اپنے کو خدا کی فطرت سے زیادہ قوی ثابت کرے گی۔ محال ہے۔ غیر ممکن ہے دیوانہ پن ہے اور جب فطرت نے اپنا اثر ظاہر کیا پھر اس وقت یہ خیال کرنا کہ عورت اس اثر کو مٹانے کی جس کو تمام برادری کے لوگ برا سمجھتے ہیں کوشش نہ کرے گی یہ ایک دوسرے امر محال کا ممکن فرض کرنا ہے۔ جس عورت کو تمام عمر بجز شرم کے اور کوئی چیز سکھائی نہیں گئی اس کی سمجھ ہی میں نہیں آ سکتا کہ اپنی خطا کاریوں کی زندہ شہادت گود میں لے کر وہ کسی طرح بھی دوسروں سے نظر چار کر سکے گی۔ اسقاط حل کی تدبیریں تو گویا لازمی ہیں اس کے بعد اپنی جان دینی یا بچے کی جان یعنی دو صورتیں رہ جاتی ہیں۔ چھوٹی قوم یا بے حیا خاندان کا تذکرہ نہیں ہے۔ خاندان جتنا ہی اونچا ہو گا اتنا ہی ان باتوں کا وہاں زیادہ رواج ہو گا گورنمنٹ تک اگر ایسی خبریں کم پہنچیں تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ قوم میں ایسے دل ہلا دینے والے واقعات نادرا لوجود ہیں۔

ہندوں بیواؤں زبان حال سے گورنمنٹ سے کہتی ہیں -

اندرون فقر دریا تختہ بندم کردہ

باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

جب ہم شوہر کی چتا پر جلنے جاتے تھے اس وقت تو آپ بہت ہی رحیم المزاج اور سراپا ہمدردی کی صورت بن کر سامنے آ کھڑے ہوئے اور ہمیں جلنے اور اس طرح مٹ جانے سے روک رکھا لیکن وہاں سے آ کر جب گھر والوں کی قید میں پڑے ملکی رسم و رواج کی بدولت اذیتیں اٹھانے لگے۔ مردوں کی خود غرضیوں کے شکار بنے طرح طرح مصیبت جھیلنے لگے تو کبھی بھولے سے خبر بھی نہ لی۔

اصل شکایت ہم کو پیشوایان قوم سے ہے کہ جو رسم قدیم موجودہ حالت کے نامناسب



ہے۔ عقل کے خلاف ہے۔ مہذب ملکوں کے چلن کے بالکل مخالف ہے مصلحان قوم اس کے مٹانے کی بالکل کوشش نہیں کرتے بعض مقاموں پر ہندوؤں کے چند معزز پیشواؤں نے عقد بیوگان کا رواج دینا چاہا۔ اس پر چند اخباروں نے اپنی مسرت ظاہر کی اکثروں نے سکوت کیا سکوت کرنے والے بھی غنیمت تھے لیکن ہم کو تو تعجب ان اخباروں پر ہوا جو اس ریفارم کے مخالف ہوئے اور کہنے لگے کہ ہندو مذہب میں کسی طرح بدھوا کا بیاہ نہیں ہو سکتا۔

گورنمنٹ پر ہم ضرور الزام دیتے ہیں کہ وہ اپنی رعایا کے جزو اعظم یعنی عورتوں سے جو کہ مردوں سے تعداد میں زیادہ ہیں بالکل غافل ہے۔ لیکن جب ہم قوم کی ہٹ دھرمی پر خیال کرتے ہیں تو پھر ہمت نہیں ہوتی کہ گورنمنٹ پر نکتہ چینی کریں۔ عمر رضامندی کی معیاد جب بارہ برس مقرر ہونے لگی تو کہیں سے بھی یہ خیال ہو سکتا تھا کہ اس پر کوئی ذی علم باشندہ ہند کا معترض ہوگا؟ اگر بل پیش ہونے سے پہلے یہ سوال مشتہر کیا جاتا تو شاید کہیں سے بھی جواب اثبات میں نہ ہوتا لیکن بل پیش کرنے کے بعد العظمت للہ اس قدر شور و غل ہوا کہ گویا گورنمنٹ ہندوستان کے مروجہ مذہب کی جڑ کاٹ رہی ہے۔

خیر جو قوم اپنے نقصانات سے اس درجہ بے خبر ہو وہاں کی گورنمنٹ سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قوم کے پیشواؤں کے خلاف کوئی بات رائج کرے گی ملک داری کی پالیسی کے خلاف ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم ہرگز ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ انگلش گورنمنٹ ہندوستان کی عورتوں کے حقوق کی پامالی۔ اخلاقی اور تمدنی حالت میں یوں دیکھتی رہے گی اور کچھ بھی توجہ نہ کرے گی۔ ہمارے نزدیک انھیں برائیوں کے رفع کرنے کے لئے قوم میں تعلیم رائج کی گئی ہے۔ گورنمنٹ نے جو تعلیم کا سلسلہ جاری کیا اس کے ذریعہ سے امید ہے کہ آہستہ آہستہ یہ تمام خرابیاں رفع ہوتی جائیں گی۔ لیکن حیرت ہم کو جب ہوتی ہے کہ یونیورسٹی کے بڑے سے بڑے ڈگری پانے والے اخلاقی اور تمدنی حالت میں ترقی معکوس کی خواہش ظاہر کرتے ہیں۔

جو لوگ بڑی بڑی کتابیں پڑھ کر لمبی چوڑی باتیں کرتے ہیں انھیں پر یہ الزام ہے کہ باوجود اس قدر دانش کے وہ اپنے گھر کی اصلاح میں کوشش نہیں کرتے تمام دنیا کا انتظام کرنا چاہتے ہیں بات بات میں انگلستان کی پارلیمنٹ کا ذکر کرتے ہیں تمام باتوں میں انگریز بنا چاہتے ہیں گورنمنٹ سے اپنے حقوق کے لئے اترش قوم سے بھی زیادہ آزادی کے خواہاں ہیں لیکن اس کا ذرا خیال نہیں کہ (جو حقوق عورتوں کے) ہم پر ہیں ان کو کہاں تک ادا کرتے ہیں یا ادا کرنے کی کوشش



کرتے ہیں۔ کوئی برامانے یا بھلا آج تک دنیا میں کسی قوم نے ترقی نہیں کی جب تک اس نے عورتوں کی ترقی اور ان کے حقوق کی حفاظت کی طرف توجہ نہیں کی۔ اکثر عورتیں مثل لونڈیوں کے سمجھی جائیں گی یا اولاد پیدا کرنے کے لئے محض ایک بے حس و حرکت مشین مانی جائیں گی نہ ان کے حقوق کا خیال ہوگا اور نہ ان کے آرام، آزادی اور آسائش کی فکر ہوگی تو جو بچے ان سے پیدا ہوں گے وہ بھی غلامی مجبوری اور محفل وجود کا سبق اپنی ماں سے لیں گے اور ایسی حالت میں قوم کیا خاک ترقی کرے گی۔

ہندوؤں میں تمام پرانی باتوں کے بیان کرنے میں ہزاروں لاکھوں برس کا ذکر کرنا تو گویا تیکہ کلام ہو گیا ہے۔ لیکن غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے ابتدائی زمانہ جس میں تہذیب کی ضرورت ہی نہ تھی اس کو ست جگ کہتے ہیں اور قومی ترقی کے آغاز کو تیرتا کہتے ہیں اور دوا پر وہ زمانہ ہے جب ترقی حد کو پہنچی۔ بہار کے بعد جس طرح خزاں آتی ہے اسی طرح انتہائی ترقی پر پہنچ کر انحطاط کی طرف مائل ہوئی ہندو جب اپنی ترقی کھو کر برے دن دیکھنے لگے تو اس کو کلجگ کہنے لگے اور جس طرح بگڑی ہوئی قوموں میں صرف پچھلے زمانے کے فسانے یاد رہ جاتے ہیں اسی طرح اب ہندوؤں میں بھی پچھلی باتیں صرف عام پسند حکایتوں کا پیرا یہ رکھتی ہیں اس پر بھی ایک خرابی یہ ہے کہ اگر وہ پچھلی باتوں کو بطور صحیح واقعات کے یاد رکھیں تو کچھ کام بھی چلے۔ تمام واقعات ان کے مثل فسانے کے ہو رہے ہیں اور ان غلط فہمیوں سے جو حالت موجود قائم ہے وہی ملکی رواج اور ملکی قانون سمجھی جاتی ہے اور گورنمنٹ بھی آئین جہاندار کی لحاظ سے اس کو قانون کے برابر سمجھنے پر مجبور ہے۔

اب ہم کو یہ دکھانا ہے کہ ہندوؤں میں عقد بیوگان کا دستور کس جگ میں تھا اور کس جگ میں نہیں ہے۔ مہا بھارت ہندوؤں میں سب سے بڑی تاریخ اور سب سے زیادہ معتبر کتاب ہے یہ دوا پر کے اخیر میں لکھی گئی ہے اور تذکرہ ست جگ اور تریا کی باتیں بھی اس میں بیان کی گئی ہیں۔

بیاس جی اپنی کتاب مہا بھارت میں ازدواج کے متعلق قدیم رسم کو یوں بیان کرتے ہیں کہ ست جگ کے آغاز میں عورتوں اور مردوں کا تعلق مثل بہا ایم کے تھا جب زمانہ نے ترقی کی اور خود غرضی اور خودداری ساتھ ساتھ چلی وسائل معاش میں دقتیں پیدا ہوئیں تو ضرورت اس امر کی ہوئی کہ اولاد کی پرورش کا بار باپ پر ڈالا جائے اور اسی وقت سے یہ خیال پیدا ہوا کہ



جب تعلق ہمبستری کے ساتھ اولاد کی پرورش کا پارلینا باپ کو مرکز خاطر نہ ہو تو وہ زنا ہے اور ناجائز ہے۔ ابتدائی زمانہ تھا اور ابتدائی قانون تھا اس لئے ایک مرد کے بعد دوسرے مرد کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کے درمیان صرف ایک مہینہ کا انتظار عورت کے حاملہ یا نہ حاملہ ہونے کی جانچ کے لئے ہوتا تھا۔ آخرت جگ تک اسی قدر زمانہ ترقی کر چکا تھا۔ ترتا و دو پر میں شادی بیاہ کے قانون میں کچھ کچھ اور ترقی ہوئی۔ لیکن اس بارے میں ہندوؤں کا قانون کبھی سخت نہیں ہوا وہ فطری جذبات کا بہت بڑا احترام کرتے تھے مثلاً دو پر میں مہا بھارت کے پانچ ہیرو جس کو پانڈو کہتے ہیں پانچ مختلف باپ سے تھے۔

آخر دو پر میں ایک رشی سویت گیتو گزرے۔ یہ اس زمانے میں تھے۔ جب ہندوؤں کی تہذیب اعلیٰ درجہ کو پہنچ گئی تھی کم سنی میں وہ اپنے باپ سے پڑھ رہے تھے کہ سامنے سے ایک غیر برہمن آیا اور وہ ان کی والدہ کو تخلیہ میں لے گیا رشی جی نے اپنے باپ سے اس مداخلت بجا پر اپنی ناخوشی ظاہر کی باپ نے اس وقت کے موجودہ قانون پر نظر ڈال کر بیٹے کو سمجھایا کہ یہ بات ابتدائے زمانہ سے چلی آتی ہے اور یہی مناسب بھی ہے اور گویا زبان حال سے یہ کہا کہ فطرتی جوش کار و کنا انسانی قوت سے باہر ہے۔ جیسا کہ منوجی نے فرمایا ہے۔ سویت گیتو نے باپ کی توجیہ پسند نہیں کی اور اسی وقت اسقوں نے قلم اٹھا کر قانون بنایا کہ اپنے مرد کے جیتے جی دوسرے مرد سے تعلق پیدا کرنا جرم قرار پاتا ہے اور اس کی سزا وہ قرار پاتی ہے جو اسقاط حمل کی ہے تمام قوم نے اس کو پسند کیا اور اس وقت سے زنا کاری بہت زیادہ معیوب سمجھی گئی۔ لیکن اس وقت تک ہندوؤں کو کہیں سے یہ خیال بھی نہیں گزرا تھا کہ عقد بیوگان نامناسب ہے۔

چنانچہ ارجن نے ناگ کنیا کے ساتھ اس وقت بیاہ کیا تھا جب پہلے شوہر سے دس برس کا لڑکا اس کے پاس تھا۔

دو پر کے آخر تک یعنی بیہوں کی اعلیٰ ترقی تک کہیں بھی عقد بیوگان کی ممانعت نہ تھی اور نہ قوم کچھ بھی اس سے آگاہ تھی۔

ہم یہاں پر یہ لکھنا مناسب سمجھتے ہیں کہ ہندو مقنن قابل سند صرف اٹھارہ ہیں۔

منو۔ اتریشے۔ بشنو۔ ہاریت۔ جاگیہ ولک۔ اوشنس۔ انگرا۔ جم۔ ایستب۔

کاتیاین۔ برہسپتی۔ پارامہر۔ بیاس۔ سنکھ و لیکھت۔ دکش۔ گوتم۔ ساتاپ۔ بشٹ۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ سوائے ان اٹھارہ کے دوسرا کوئی ہندو مقنن قابل وقعت نہیں ہے



اور یہ بھی مسلمہ ہے کہ ان لوگوں نے بجائے ممانعت کرنے کے صاف اور صریح لفظوں میں بدھوا بیوہ کی ہدایت کی ہے۔ چنانچہ پاراسرنے کلجگ کے لئے جو مجموعہ قانون بنا یا ہے اس کا نام پاراسرننگت ہے اس میں لکھا ہے کہ پانچ حالتوں میں عورتوں کو دوسرا شوہر کرنا جائز ہے۔

(۱) شوہر کی مفقودا لجزی (۲) شوہر کے طلاق دینے پر (۳) شوہر کی وفات پر (۴) شوہر کے لئے نامرد ہونے پر (۵) شوہر کے ترک مذہب کرنے پر پھر لکھا ہے کہ شوہر کی مفقودا لجزی کی حالت میں اولاد والی برہمنی ۸ سال تک سابق شوہر کا انتظار کرے اور بے اولاد والی ۴ سال تک انتظار کرے اسی طرح پھتری کی عورت کو چھ برس اور تین برس کا عرصہ دیا گیا ہے اور دیش کو چار برس اور دو برس۔ شوہر کے لئے کوئی ایام مقرر نہیں ہیں مفقودا لجزی کے بعد جب چاہے دوسرا بیاہ کرے ناظرین کے اطمینان کے لئے سخوڑی سی عبارت اصل کتاب سے نقل کی جاتی ہے۔

नष्टमृतेप्रहमितेहीवेषपतितेपतौ । ०। ०। ०।

पञ्च द्वापतसु नारिणांपतिरन्यो विधीयते ॥

अथोवर्धा राक्षपे द्वेत वा ह्यशी प्रोथितं पतिम् ॥

अप्रसूतानु च त्वारि परतोऽन्यं समाश्रयेत् ॥

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہندوؤں کے ترقی کے زمانے میں یہ حالت تھی تو اب عقد بیوگان کیوں معیوب سمجھا جاتا ہے اس کے سمجھانے کے لئے مسلمانوں سے زیادہ دوسری تمثیل ہمارے پاس نہیں ہے۔ ان کے قرآن میں حکم ہے ”وانکھوالایا ما منکم“ خود محمد رسول اللہ نے سوائے ایک بیوی کے اور تمام بیواؤں سے عقد کئے۔ اپنی لڑکیوں کے بھی عقد مکرر کئے تمام صحابہ کرام میں بھی ایسا ہی رواج تھا۔ باوجود اس کے اس زمانے کے مسلمانان ہند اور وہ بھی عام مسلمان نہیں خاص خاص لوگ جو اپنے کو پیغمبر اور صحابہ پیغمبر کی نسل میں بتاتے ہیں عقد بیوگان معیوب جانتے ہیں اسی طرح جب ہندوؤں کے منزل کا زمانہ آیا تو انہوں نے ترقی کی بہت سی باتیں چھوڑ دیں۔ منجملہ ان کے عورتوں کے حقوق سے بھی وہ بے پروا ہو گئے دختر کشی کی رسم ان میں جاری ہوئی زندہ عورت اپنے متوفی شوہر کی لاش کے ساتھ جلنے لگی عقد بیوگان بالکل مسدود ہو گیا۔

اسی مقام پر ہم ایک تاریخی واقعہ بھی لکھتے ہیں کہ عقد بیوگان کی ممانعت کیونکر شروع



ہوئی۔ کلجگ میں ایک رشی دلیکن کوٹی بڑے نامی رشی نہیں تھے۔ جن کی آنکھیں جاتی رہی تھیں مزاج کے کڑے تھے اور کاہل الوجود تھے۔ ان کی بیوی ان سے سخت متنفر تھی۔ ایک روز دریا کے کنارے وہ نہاتے ہوئے بہ گئے ان کو خیال گزرا کہ بیوی نے بہا دیا ہے وہ سمجھتے تھے کہ میرے بعد دوسرے سے وہ اپنا لطف قائم کرے گی۔ اتفاق سے وہ کہیں آگے چل کر دریا سے نکلے اور کسی بڑے راجہ کے دربار میں رسوخ پا گئے۔ وہاں انھوں نے یہ قانون جاری کیا کہ کسی حالت میں بیوگان کا عقد نہ ہو۔ تاکہ وہ ہر حالت میں اپنے شوہروں کو معتمد سمجھا کریں۔ قومی خیالات بھی بدل رہے تھے رشی جی کا بچن سہارا ہو گیا۔

مسلمانوں نے بہت کم دخل ہندوؤں کے رسم و رواج میں دیا اور نہ ہندوؤں نے کوئی اخلاقی بات مسلمانوں سے سیکھنا چاہی بلکہ خود اپنے برے رسم و رواج میں انھوں نے مسلمانوں کو پابند کر لیا۔ جلال الدین اکبر نے خود نیم ہندو ہو کر ہندوؤں کی رسم میں بہت کچھ دخل دینا چاہا عقد بیوگان کو اس نے جاری کرنا چاہا وہ کچھ کامیاب بھی ہو چلا تھا لیکن اس کے مرنے کے بعد پھر دوسرے بادشاہوں نے ادھر توجہ نہ کی۔

اب ہم یہاں یہ لکھنا چاہتے ہیں کہ انگلش گورنمنٹ نے ہندوؤں کی ناجائز رسم و رواج کی کہاں تک اصلاح کی۔

زندہ عورت کا متوفی کے ساتھ جل جانا اور زندہ لڑکیوں کا دریائے گنگا کی نذر کرنا ۱۸۲۹ء میں موقوف ہو گیا۔

غلامی کا دستور ہندوستان میں بہت براتھا۔ خریداری کے ذریعہ سے ایک شخص دوسرے شخص کو اپنے مولیٰوں میں شمار کرتا تھا اور کبھی سرقہ بالجبر اور سرقہ مخفی کے ذریعہ سے بھی غلام حاصل کئے جاتے تھے ۱۸۳۲ء میں گورنمنٹ نے اسکو موقوف کر دیا اور اس کے ساتھ ہی غلامی کے متعلق جتنے شاستری احکام تھے سب تقویم پارینہ ہو گئے۔

جو کوئی بیوہ عورت کے ساتھ یا کسی غیر برادری کی عورت کے ساتھ بیاہ کرے اور جائز تعلق کی حالت میں اولاد پیدا ہو تو گودہ ہندو لا کے مطابق اولاد صحیح النیب نہ ہو لیکن گورنمنٹ نے لارڈ میو کے وقت میں برہمن سماج کی تحریک پر یہ قانون پاس کیا کہ ایسی اولاد واسطے اعراض وراثت کے اولاد صحیح النیب سمجھی جائے گی۔

دختر کشی کے انداد کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے بہت کچھ عملی کارروائی کی گئی



ہے اور خاص ایکٹ پاس کیا گیا۔

۱۸۵۰ء میں یہ قرار پایا کہ کوئی شخص تبدیل مذہب کی وجہ سے اس وراثت سے محروم نہ ہوگا جو مذہب تبدیل کرنے کی حالت میں اس کو پہنچتی تھی۔

ان تمام باتوں سے ظاہر ہے کہ گورنمنٹ ہند کے اختیار میں جو رفاہی کام ہیں وہ اس سے غافل نہیں ہے۔ لیکن لوگ اپنی بیوہ لڑکیوں کو نہ بیاہیں اور ایسا کرنا معیوب سمجھیں تو ظاہر ہے کہ یہ بات گورنمنٹ کے کرنے کی نہیں ہے قوم کے پیشواؤں کے کرنے کی ہے۔

گورنمنٹ اور رعایا کا عجیب تعلق ہے۔ جیسی رعایا ویسی ہی گورنمنٹ۔ مہذب رعایا کی مہذب گورنمنٹ۔ غیر مہذب رعایا کی غیر مہذب گورنمنٹ۔ رعایا یا سخت مزاج اور جاہل ہے تو گورنمنٹ کے لئے بھی سخت مزاجی اور جہالت لازمی ہے۔ رعایا سنجیدہ ہے تو گورنمنٹ کی سنجیدگی بھی یقینی ہے۔ اس اعتبار سے اگر کہا جائے کہ ہندوستان میں بہت سی بے جا رسمیں ایسی ہیں جن کے مٹانے کی طرف گورنمنٹ متوجہ نہیں ہے اور اس لئے اس میں نقص ہے۔ تو یہ کہنا ایک حد تک مناسب ہو سکتا ہے لیکن انصاف سے دیکھا جائے تو گورنمنٹ بالکل بے قصور ہے اس زمانہ کا دستور جہاں داری پنچائتی قسم کا نہیں ہے۔ اگر گورنمنٹ ایک محکمہ قائم کرے۔ حلقہ بندی کے ذریعہ سے قومی رفاہی کام کی مجلسیں قائم ہوں تو یہ انوکھا دستور تمام مہذب گورنمنٹ کے خلاف ہی نہیں ہوگا بلکہ گورنمنٹ کی طرف سے عوام میں ناراضی پھیلنے کا سبب ہوگا ... گورنمنٹ جو کچھ کر سکتی تھی اس نے کر دیا اس سے زیادہ اصلاح اس کے اختیار سے باہر ہے۔

عام تعلیم کا سلسلہ قائم کر دیا گیا ہے۔ لوگ پڑھ کر نکلتے ہیں۔ تمام دنیا کے حالات سے واقف ہوتے ہیں۔ قانون قدرت اور انتظام عالم کی ماہیت اور اسرار کم و بیش دریافت کرتے ہیں آزادی ایسی نعمت کی قدر کرتے ہیں۔ جہالت کو برا جانتے ہیں۔ قوموں کے تزلزل اور ترقی کے اسباب سے واقف ہوتے ہیں۔ جب ایسے لوگوں کے پیدا کرنے کا بند و بست گورنمنٹ نے کر دیا تو وہ اپنی ذمہ داری سے بری ہو گئی اب ذہنی علم اور ذہنی عقل باشندے اپنی تمدنی حالت کی اصلاح کی طرف خود مائل ہوں اور سمجھیں کہ گورنمنٹ نے ان کو اس لئے تعلیم نہیں دی ہے کہ وہ دانشمند ہو کر بے دانشوں کو نہ سمجھائیں قومی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہوں قانون فطرت کے اعراض کو نہ سوچیں۔

گورنمنٹ تعلیم پر بے انتہا روپیہ اس لئے صرف کرتی ہے کہ قومی اصلاح ہو رعایا کی



اخلاقی حالت درست ہو ایک ذی علم ہزاروں لاکھوں جاہلوں کا ر فارم کر سکتا ہے جو کوئی  
 کھڑے اور اعلیٰ تعلیم سے بہرہ یاب ہو کر عوام کی خواہش کی پیروی کرتا ہے اور ر فارم میں سعی  
 کرنے سے گریز کرتا ہے تو وہ بالکل گورنمنٹ کے منشا را اور گورنمنٹ کی امیدوں کے خلاف کرتا  
 ہے اور قوم کے حقوق ادا کرنے میں سخت پہلو تہی کرتا ہے۔ غرض کہ الزام انہیں پر ہے جو کچھ  
 کر سکتے ہیں اور نہیں کرتے۔



## فصل نمبر ۲۳

### امہات مومنین۔ ازواج مطہرات رسولؐ

آنحضرتؐ نے سب سے پہلے حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے نکاح کیا حضرت خدیجہؓ کی پہلی شادی ابوہالہ بناش سے ہوئی تھی ان کے مرنے پر دوسرا بیاہ عتیق بن عابد سے ہوا۔ پہلی شادی سے دو بیٹے ہند اور ہالہ دونوں زندہ تھے اور دونوں آنحضرتؐ پر ایمان لائے تھے دوسرے خاندان سے ایک بیٹی تھیں وہ بھی ہند کے نام سے مشہور تھیں۔ تیسرا نکاح ان کا چالیس برس کی عمر میں آنحضرتؐ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا۔ انہیں کے بطن سے حضرت فاطمہؓ پیدا ہوئیں اور حضرت فاطمہؓ کی اولاد سیدہ کہی جاتی ہے اور غالباً اور لڑکیوں سے سلسلہ اولاد قائم نہ ہوا۔ ہند وستان میں جو جتنا ہی شریف ہے اتنا ہی عقد بیوگان کو معیوب جانتا ہے عقد بیوگان کو سادات اپنی ہتک سمجھتے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ انکی دادی حضرت خدیجہؓ اپنا تیسرا نکاح نہ کرتیں تو زمانہ انکی سادات سے خالی رہتا جو اپنے وقت میں فخر روزگار تھے اور اب بھی وہ سادات فخر زمانہ سمجھے جاتے ہیں جو احکام شرع کے عامل با عمل ہیں یہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت خدیجہؓ نسل قریش سے تھیں۔ تمول۔ عقل اور خوش اخلاقی کی وجہ سے ایام جاہلیت میں بھی مکہ کی تمام عورتوں میں ممتاز تھیں اور طاہرہ انکا لقب تھا۔ حضرت سودہؓ قریش کی نسل سے تھیں پہلا نکاح ان کا سکران ابن عمر سے ہوا تھا اور دوسرا نکاح آنحضرتؐ سے ہوا۔ پہلے نکاح سے عبدالرحمن صحابی تھے جو کسی لڑائی میں شہید ہوئے۔



حضرت حفصہؓ حضرت عمر فاروقؓ کی بیٹی پہلے حنیس سے بیاہی تھیں حضرت خنیس بدوی صحابی تھے ان کی وفات پر حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ سے حضرت حفصہ کو بیاہنا چاہا۔ حضرت عثمانؓ نے کہا اچھا میں عور کر کے جواب دوں گا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ شادی نہ کروں۔ پھر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے درخواست کی یہ چکے ہوئے ہاں نہیں کچھ بھی نہیں کہا۔ حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ مجھے ابوبکرؓ کا سکوت برا معلوم ہوا لیکن جب آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہ کا پیغام بھیجا اور میں نے ان کو آپ سے بیاہ دیا اس وقت معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ سرور کائنات حضرت حفصہؓ کا ذکر حضرت ابوبکرؓ سے کر چکے تھے اور یہی وجہ حضرت ابوبکرؓ کے سکوت کی تھی۔

حضرت ام سلمہؓ بھی قریش النسب تھیں پہلا نکاح ان کا عبداللہ ابن عبدالاسد ابن مغیرہ سے ہوا۔ عبداللہ کی کنیت ابوسلمہ تھی۔ یہ بدری صحابی تھے ابوسلمہ کے انتقال پر ام سلمہؓ آنحضرتؐ کی زوجیت میں داخل ہوئیں۔ پہلے شوہر سے دو بیٹے سلمہ اور عمر اور دو بیٹیاں درہ اور زینب پیدا ہوئیں۔ سلمہ کو امامہ بنت امیر حمزہ سے آنحضرتؐ نے بیاہا تھا۔ عمر کو حضرت علیؓ کے وقت میں فارس اور بحرین کی حکومت ملی تھی۔

حضرت ام حبیبہؓ سردار مکہ ابوسفیان کی لڑکی تھیں یہ اپنے خاوند عبید اللہ بن حبش کے ساتھ حبش کو ہجرت کر گئیں۔ وہاں عبید اللہ کے مرنے پر تنہا رہ گئیں۔ عمر ابن عمیرہ ضمیری کو بھیج کر آپ نے نجاشی بادشاہ حبش کو اپنا وکیل کیا اور اس نے آنحضرتؐ کے ساتھ ام حبیبہ کا عقد کیا اور ان کو آنحضرتؐ کے پاس مدینہ بھیج دیا۔

حضرت زینبؓ بنت حبش پہلے زید بن حارثہ کے عقد میں تھیں۔ زید نے طلاق دی تب آنحضرتؐ نے خواستگاری کی اور زید ہی کو پیغام بھرنایا۔ اس وقت تک آیتہ پر وہ نازل نہیں ہوئی تھی۔ حضرت زینب نے زید کو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ اور رسول اللہ کا پیغام سن کر کہا کہ میں نماز پڑھ لوں تو جواب دوں گی۔ اسی اثناء میں آیت اتری۔

”جب زید اس سے اپنی غرض پوری کر چکا یعنی طلاق دے چکا تو ہم نے اس کو تجھ سے بیاہا تاکہ مومن اپنے لے پالکوں کی بیویوں سے عقد کرنے میں جب وہ مطلقہ ہو جائیں کوئی حرج نہ سمجھیں۔“

یہ فلما قضی زید مہاد طراز و جنا کہا لکیلا یكون علی المؤمنین حرج فی الزواج او عیالہم اذا قضوا منہن وطرا۔



آنحضرت زید کو بہت مانتے تھے۔ گو یادہ آنحضرت کے منہ بولے بیٹے تھے۔ منافق کہتے لگے کہ آنحضرت نے اپنی بہو سے نکاح کیا اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

”محمد تم میں سے کسی مرد کا باپ نہیں ہے رسول ہے اور خاتم النبیین ہے۔“

ممکن ہے کہ اس وقت آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت زینبؓ کو اپنی زوجیت میں قبول کرنا جہلا کے نزدیک نامناسب امر ہو۔ لیکن اس زمانے کی موجودہ حالت پر نظر رکھ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آنحضرت کا فعل بڑی ہی مصلحت پر مبنی تھا۔ پیغمبر نے ہر طور پر نکاح کی آزادیوں کا سبق خود اپنے فعل سے اپنی امت کو دیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ نکاح کے معاملات کو لوگ نہیں معلوم کس طرح ڈراونا بھیانک غیر معمولی وحشت انگیز معاملہ سمجھنے لگے۔ نکاح سے اصل عرض یہ ہے کہ لوگ زنا سے بچیں زنا میں مختلف عوارض لاحق ہونے اور روز کے جھگڑے قضیے پیدا ہونے کے علاوہ ایک خرابی یہ ہوتی ہے کہ پرورش اولاد کے لئے کوئی مناسب طریقہ پیدا نہیں ہوتا اور انتظام عالم میں فتور واقع ہونے کا احتمال ہوتا ہے عورتوں کی طرف سے مردوں کا اور مردوں کی طرف سے عورتوں کا میلان طبع قانون فطرت ہے اس کا توڑنا خدا سے لڑنا ہے شرع نے اس میلان طبع کو ذرا مقید اور مہذب کرنا چاہا ہے کہ زنا کی حالت پیدا نہ ہو یا یہ کہ زنا سے انسان کا عملی طور پر بچنا آسان قرار دینے کے جتنے وسائل تھے ان کا نکاح، طلاق، خلع وغیرہ مسائل متعلقہ زنا شوٹی میں لحاظ رکھا گیا اب ان سیدھی سیدھی پاک باتوں کو اپنی جہالت سے کوئی تماشا بنالے تو یہ مرض لا علاج ہے دیکھو زنا کاری فصل بست و دوم)

حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے معاملات میں بہت کچھ شرعی تعلیم کی گئی ہے۔ سوا زید کے اور کسی صحابی کا نام قرآن میں نہیں ہے۔ حضرت زید ایک شریف عرب کے لڑکے تھے ایک ظالم کسی طرح انکو پکڑ کر لے گیا۔ پیغمبر خدا کے ہاتھ یہ غلام ہو کر بچے۔ جب ان کے باپ کو خبر ہوئی تو وہ لینے آئے۔ پیغمبر نے آزاد کر دیا۔ لیکن وہ ایسے مہربان کا ساتھ کب چھوڑنے والے تھے۔ وہ اپنے گھر نہ گئے اور آزاد ہو کر پیغمبر ہی کے پاس رہنے لگے آنحضرت نے ان کو بیٹے کی طرح پالا یہ جوان ہوئے تو چاہا کہ اپنی پھوپھی زاد بہن زینب کے ساتھ ان کو بیاہ دیں۔ حضرت زینب اور ان کے بھائی عبداللہ نے زید کی سابق غلامی پر نظر کر کے تامل کیا اس وقت یہ آیت اتری۔



کسی مسلمان مرد یا عورت کو زینیا نہیں ہے کہ جب خدا اور رسول ان کے کام میں حکم دیں تو وہ پھر اپنی رائے کو دخل دیں۔

ظاہر ہے کہ اس آیت سے صرف یہ مقصود تھا کہ ایک دوسرے کو صرف خارجی اسباب کی وجہ سے معاملات نکاح میں ذلیل نہ سمجھے۔ حضرت زینب نے بیاہ تو کیا لیکن یہ خیال دل سے نہ گیا کہ غلام کو اسخوں نے شوہر بنا یا ہے۔ حضرت زید کو حضرت زینب سے ہمیشہ بے لطفی رہی پیغمبر خدا نے سمجھا یا لیکن اس سے بھی کام نہ نکلا تو حضرت زید نے حضرت زینب کو طلاق دیدی اختلاف مزاج کی حالت میں فریقین کے لئے طلاق سے عمدہ کوئی دوسرا چارہ کار نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ اس طلاق سے حضرت زینب کچھ ملول ہوئی ہوں۔ ان کو یہ خیال ہوا ہو کہ غلام نے بھی مجھے اپنے قابل نہ سمجھا۔ آنحضرتؐ نے انکی تسکین کے لئے خود اپنی زوجیت میں ان کو لینا چاہا اور زید ہی کی معرفت پیغام نکاح بھی بھیجا۔ حضرت زینب کے پہلے نکاح میں آیت قرآنی نازل ہوئی تھی اسخوں نے ایک شان بے اعتنائی سے فرمایا یا اقتضائے فرط غم سے یہ کہا کہ جیسا خدا حکم دے گا کیا جائے گا۔ کیا عجب کہ حضرت زینب کو بھی پیغمبر خدا کے ساتھ نکاح کرنے میں وہی تامل تھا جو منافقوں کے دل میں آیت قرآنی اترنے کے بعد بھی قائم تھا اور یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ جب حضرت زینب کا پہلا نکاح وحی سے حضرت زید کے ساتھ ہوا تھا تو وہ دوسرے نکاح کے لئے بھی نص قرآنی کی منتظر تھیں۔ حکم ہوا کہ زینب کا نکاح جیسا اوپر پوری آیت پڑھ کر بیان کیا گیا ہے۔ حضرت زینب کے سمجھنے کو یہ کافی تھا وہ نہایت مسرت سے پیغمبر خدا کی زوجیت میں داخل ہو گئیں۔ لیکن منافقین اس پر بھی ہنستے تھے۔ منافقوں کی شان میں تیسری آیت اس مضمون کی نازل ہوئی کہ محمدؐ کسی کا باپ نہیں ہے یعنی یہ خیال کہ بے پالک کی بیوی سے نکاح بیجا ہے بالکل غلط ہے۔ یہ سب اہتمام صرف اس لئے تھا کہ امت محمدیؐ کو نکاح کی حقیقت معلوم رہے۔ لیکن افسوس کہ لوگ پھر بھی اسے نہیں سمجھتے۔

حضرت زینب بنت حذیمہ بھی آنحضرتؐ کی ازواج مطہرات سے ہیں۔ پہلے ان کے کئی نکاح ہو چکے تھے۔ بعضوں نے لکھا ہے کہ آنحضرتؐ سے ان کا نکاح پانچواں تھا۔ حضرت میمونہؓ کی نسبت بھی مشہور ہے کہ آنحضرتؐ سے انکا تیسرا یا پانچواں نکاح تھا۔

لے کان لمومن ولا مومنہ اذا قضی اللہ ورسوله امران یكون لہم الخیرة من امرہم۔



حضرت جویریہؓ جب آنحضرتؐ کے نکاح میں آئیں اس وقت ان کا پہلا شوہر مرچکا تھا آنحضرتؐ کے ساتھ ان کا دوسرا نکاح تھا۔

حضرت صفیہؓ کا نکاح آنحضرتؐ کے ساتھ تیسرا تھا۔

ایک اعتراض پیغمبرؐ خدا پر یہ کیا جاتا ہے کہ وہ شہوت پرست تھے ان کو اتنی بہت سی بیویوں کی کیا ضرورت تھی۔ شہوت پرست ہونے کی نسبت تو یہ کہنا کافی ہے کہ آپؐ کبھی زنا سے متہم نہیں ہوئے۔ پچیس برس تک آپؐ نے کسی عورت سے قربت نہیں کی اور عین شباب کو ستر انٹی برس کے بڑھوں کی طرح کا ٹاٹا اس کے بعد شادی بھی کی تو اپنے سے زیادہ عمر والی عورت سے کی۔ ۲۵ برس کے بعد آپؐ نے عقد نکاح کرنے شروع کئے۔ وفات تک سات بیویاں موجود تھیں لیکن ان بیویوں میں بجز حضرت عائشہؓ کے اور کسی بکر سے آپؐ نے عقد نہیں کیا برابر بیواؤں ہی سے عقد کیا۔ سب سے زیادہ آپؐ عائشہؓ کو چاہتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی عدل کا بھی خیال رکھتے تھے ان عورتوں کا بڑھنا گویا حضرت عائشہؓ ایسی پیاری بیوی کی ملاقات میں فرق ڈالنا تھا۔ اور اس لئے یہ قیاس کہ یہ عورتیں لطف بڑھانے کے لئے عقد نکاح میں لائی گئیں بالکل قائم نہیں ہوتا۔ جس فقر وفاقہ سے آپؐ بسر کرتے تھے وہ اظہر من الشمس ہے نہ آپؐ کی زوجات کے گھر درست تھے نہ آپؐ کے پاس اور کوئی سامان عیش و نشاط تھا۔ کیا شہوت پرستی کے یہی نشان ہیں کہ مسن بیواہیں گھر میں بند کر کے ان کے ساتھ چٹائی چمڑے کی کھال پر سویا جائے۔ اور فقر وفاقہ سے بسر کی جائے؟ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر اتنی بیویوں کے بڑھانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب تھوڑے غور کے بعد بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے۔ آنحضرتؐ قانون زبانی جاری کرنے آئے تھے قرآن تو گویا ایک اصول کی کتاب ہے فقہ کے مسئلے حدیث کو قرآن کے ساتھ ملا کر پیدا کئے گئے ہیں۔ حدیث نقل کرنے کے ذریعہ تھے اصحاب۔ غیر عورتوں سے صحبت رکھنا مناسب نہ تھی اور جو باتیں فقہ کی عورتوں سے متعلق ہیں وہ مردوں کے سامنے بیان کرنے کی نہیں تھیں اور نہ مردوں کے پوچھنے کی تھیں۔ یہی باعث تھا کہ اتنی بہت سی عورتیں آنحضرتؐ کے پاس تھیں جن کی بدولت آنحضرتؐ حیض۔ نفاس۔ لہارت وغیرہ وغیرہ کے مسئلے اور نیز بہت سی باتیں ازواج مطہرات سے دوسری مسلمان عورتوں کو معلوم ہوئیں اور پھر ان کے ذریعہ سے عام مسلمانوں میں پھیلیں۔ ایک یہ غرض بھی تھی کہ لوگ بیواؤں سے عقد کرنا عیب نہ سمجھیں۔ بکر کے ساتھ نکاح کرنا ہرزمانے میں انسانی طبیعت کا مقتضار ہے۔ پیغمبرؐ خدا نے چاہا کہ لوگوں



میں بیواؤں کے عقد ثانی کی تحریریں اپنے فعل سے پیدا کریں باوجود اس کے آنحضرت کے بعد ہی ایران میں "زن بیوہ مکن اگرچہ حور است" کا مقولہ جاری ہوا اور پھر ہندوستان میں آکر تو بیواؤں سے عقد کرنا بند ہی ہو گیا۔ اگر پیغمبر صاحب کی سنت نہ ہوتی تو شاید شرعی تحریم بھی قائم کر لی جاتی۔ یہ غلط مشہور ہے کہ ہند کے مسلمان اپنی بیوہ بہنوں اور بیوہ لڑکیوں کا عقد نہیں کرتے۔ وہ خوشی سے کریں لیکن کوئی منظور بھی کرے کیا وہی کرتے پھر یہ خدمت گاروں کے سر منڈھ دیں بیچارے کیا کریں۔ بیواؤں کے ساتھ شادی کرنے میں تو لوگ خود رکتے ہیں اور مشہور یہ کر رکھا ہے کہ بیوہ لڑکیوں کے ساتھ بیاہنے پر ان کے اولیا راضی نہیں ہوتے۔ چھوٹی چھوٹی حیثیت کے آدمی بھی اپنے لئے بکر ہی تلاش کرتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ شاہ دارین محمد مصطفیٰ کے عقد میں بجز حضرت عائشہؓ کے تمام بیوائیں تھیں۔

ایک ملکی مصلحت بھی ان بیاہوں میں شامل تھی وہ یہ کہ مختلف قبیلوں میں شادی کرنے سے آنحضرتؐ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے جاں نثاروں کا گردہ بڑھ جائے گا۔ اس وقت کے دستور کے مطابق ایسا خیال ایک ملکی مسئلہ تھا اور بڑے مصالح پر مبنی تھا۔



## فصل نمبر ۴۴

### عدالتی کارروائی

#### عہدہ قضا

مسلمانوں میں شروع شروع عہدہ قضا جہانہ تھا پیغمبرؐ اور ان کے بعد خلفاء اربعہ دینی اور دنیاوی احکام برابر تعلیم کرتے تھے۔ نماز پڑھاتے تھے بیت المال کی حفاظت کرتے تھے۔ احکام شرع بتاتے تھے ان کے اجرا اور نفاذ کے نگران رہتے تھے۔ فوجی احکام بھی صادر کرتے تھے۔ بنو امیہ کے زمانے میں یہ طریقہ نہ رہا۔ کچھ تو خلیفہ وقت کی عیدم الفرستی (وہ کسی سبب سے ہو) باعث ہوئی اور کچھ عوام کا خیال خلفاء وقت کی نسبت ایسا ہوا کہ وہ تمام امور میں خود کو مدارالمہام رکھنا خلافت مصلحت سمجھے۔ جدا جدا عہدے قائم ہونے لگے تو عدالتی کارروائی کے لئے قاضی القضاة اور ان کے ماتحت قاضیوں کا تقرر ہوا اور قاضی کی مدد کے لئے مفتی مقرر کئے گئے جیسا کہ اب یورپ میں ججوں کے ساتھ ایسیر اور جوری کام کرتے ہیں) بنو عباس کے عہد میں بھی یہی قاعدہ جاری رہا۔ عوام سے قاضیوں کو زیادہ تعلق رہتا ہے اور انسان سب برابر نہیں ہوتے اس لئے قاضیوں کی عیب جوئی کے اشارات شروع ہی سے قصہ کہانیوں کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ اسلام کے زمانہ غرور میں قاضیوں کے انتخاب میں بڑی احتیاط کی جاتی تھی محض فضیلت کی پگڑی بندھ جانا یا کوئی امتحان پاس کر لینا اس عہدہ کا مستحق نہیں ٹھہراتا تھا اس عہدہ کے لئے بہت سی شرطیں تھیں جو قاضیوں کے تقرر کے وقت ملحوظ رکھی جاتی تھیں فقہ کی ایک چھوٹی سی کتاب کتز کی عبارت کا ترجمہ ہے وہ چاہیے کہ قاضی بد مزاج، سنگدل، سرکش



اور دشمنی کرنے والا نہ ہو۔ قاضی ایسا شخص ہونا چاہیے جس کی پرہیزگاری، عقل، صلاح، سمجھ حدیث دانی اور صحابہؓ کے قول اور شریعت کی راہوں کے عالم ہونے پر اعتماد ہو۔ مفتی کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔ کوئی شخص قاضی کو ہد یہ سمجھے تو قاضی اسے واپس کر دے۔ دعوت بھی قاضی کسی کی قبول نہ کرے۔ خصوصاً وہ جو صرف قاضی ہی کی دعوت ہو۔

قاضی کی تہذیب اور خلق کی نسبت محکوم ہے۔

نماز جنازہ اور مرلیض کی عبادت کے لئے قاضی کو جانا چاہیے۔ مدعی اور مدعی علیہ دونوں کو قاضی برابر بٹھائے اور دونوں کی طرف توجہ کرے اور ایک سے کان میں بات نہ کرے اور نہ اشارہ سے کچھ کہے۔ نہ کسی کو ان میں سے حجت سکھائے اور نہ کسی کو مدعو کرے۔ نہ کسی سے ہنسی کرے اور نہ گواہ کو گواہی دینے کا طریقہ سکھائے۔

قاضیوں کا انتخاب شروع شروع بڑے اہتمام سے کیا جاتا تھا۔ مشہور ہے کہ اخیر زمانہ بنو امیہ میں امام محمد ابن مالکؒ اور شروع زمانہ بنو عباس میں امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ عہدہ قضا کے نامنظور کرنے سے مورد عتاب سلطانی ہوئے تھے۔ ممکن ہے کہ سلطان وقت کو محض ان کی لیاقت ذاتی کی وجہ سے ان کا قاضی القضاة مقرر کرنا مناسب معلوم ہوا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ملکی مصالح مقتضی ہوئے ہوں کہ ایک بااثر شخص کا ملازمت میں داخل ہو جانا استحکام سلطنت کا باعث ہوگا۔ ان بزرگان دین کے انکار کی وجہ یہ مشہور ہے کہ اتنا بڑا بار لینا انھوں نے پسند نہ کیا۔ لیکن ممکن ہے کہ یہ وجہ نہ ہو۔ جو بار پیغمبر خدا اور خلفائے راشدین نے اٹھایا اس کے اٹھانے کی عزت سے گریز کرنا اعلیٰ درجہ کی حب الوطنی کے خلات نہیں تو اس کے موافق سمجھی نہیں ہے۔ میری سمجھ میں انکار کی وجہ ایک یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دربار خلافت سلاطین عجم کا رنگ پکڑ رہا تھا ان سیدھے سادے مسلمانوں نے خلافت دانش تصور کیا کہ سلطان وقت کے ملازم ہو کر اس کے جائز اور ناجائز احکام کی پیروی سے اپنی ورع میں فرق ڈالیں یا ان سے روگردانی کر کے خود کو مورد عتاب سلطانی قرار دیں۔

جس طرح ہندوستان کے فاتحین اعلیٰ درجے کے اوصاف ساتھ نہیں لائے اسی طرح یہاں کے قاضی اور مفتی بھی اعلیٰ درجہ کے اوصاف سے منتصف نہیں تھے۔ وجہ یہ تھی کہ عربوں کی سلطنت یورپ افریقہ اور ایشیا میں نابود ہونے کے بعد یہاں اسلام پہنچا اور ہم نے بار بار ثابت کیا ہے کہ اسلام کی حالت اپنے عجائبات کے ساتھ اسی وقت تک نمونہ قدرت تھی جب تک وہ عربی



النسل خلفا کی حمایت میں تھا ہم کیا تمام یورپین مورخ ہی رائے رکھتے ہیں اور اس بارہ میں غیروں ہی کی رائے زائد مستند ہو سکتی ہے۔ فاتحان ہندوستان کی کیا حالت تھی اس کے لئے ہند اور اہل اسلام فصل ۲ پڑھیے۔ لیکن فاتحین ہند سے قاضیان ہند نسبتاً اچھے تھے اور اسکی وجہ یہ تھی کہ وہ برابر قریشی النسل علماء سے منتخب کئے جاتے تھے۔ قرآن و حدیث پڑھنے سے ایک خاص صلاحیت ان میں پیدا ہو جاتی تھی۔ فوجی مانی اور ملکی خدمتیں ترک تاتا رہا اور مغل انجام دیتے تھے۔ ہنود بھی ان خدمتوں پر مامور ہوتے تھے۔ لیکن قاضیوں اور مفتیوں کا گروہ وہ زائد تر مسلمان اور وہ بھی عرب یا عربی النسل عجمی مسلمانوں سے منتخب کیا جاتا تھا وہ لوگ ہندوستان میں اسی طرح آتے تھے جس طرح اب سویلین انگلینڈ سے آتے ہیں فرق اتنا ہے کہ یہ امتحان پاس کر کے اور تقرری کا پروانہ لے کر چلتے ہیں اور وہ علم و ہنر اور قومی امتیاز کے بھروسہ پر چلتے تھے اور آتے ہی خدمتوں پر مامور ہو جاتے تھے۔ ابن بطوطہ کا سفر نامہ پڑھنے سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کے دربار شاہی میں کس درجہ اس کی آؤ بھگت ہوئی تھی اور بہ جبر یا باخوشی عہدہ قاضی القضاة اسے دیا گیا تھا۔ تاریخ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ محمد تغلق نے خلیفہ بغداد سے جو اس وقت ترکوں کے ہاتھ میں شاہ شہر پنج سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا خطاب اور سند سلطنت نہایت شوق سے حاصل کی ہندوستان میں جتنے گھر پرانے قاضیوں کے ہیں اکثر ان میں عربی النسل ہیں اور جتنے عربی النسل خاندان ہندوستان کے مختلف حصوں میں آباد ہیں انکو کم و بیش ملکیت زمین بھی شاہوں نے عطا کی تھی اور اس لئے اکثر حصص ہند میں ملکوں سے انکی اولاد کو تعبیر کرتے ہیں انھیں امور پر لحاظ کر کے میرا خیال ہے کہ عربی النسل علماء کو شاہان ہند مختلف حصص ہند میں آباد کرتے تھے جاگیریں دیتے تھے عہدے عطا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اسلامی تہذیب ان کے ذریعہ سے پھیلاگی اور شرایع اسلام سے یہ لوگوں کو واقف کریں گے اور ایک حد تک اس میں کامیابی بھی ہوگی کیونکہ گئی گذری حالت میں بھی ہندوستان کی عدالتوں کا انتظام اور ضیغہ جات کے انتظام سے اچھا تھا قاضیوں اور مفتیوں نے ان قنادی سے جو انکے بہت پہلے مدون ہو چکے تھے اعلانیہ طور پر کبھی گریز نہیں کیا اور علمائے عصر نے احکام فقہ کو جس حد تک اس میں پہلے ترقی ہو چکی تھی بدستور قائم رکھا نہ انخطا میں اس سے زائد اور کیا امید ہو سکتی تھی ہمارے بیان کے ثبوت میں برٹش گورنمنٹ کا طرز عمل پیش کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد اس نے نظامت میں مداخلت



پسند نہیں کی تمام صیغوں کے انتظامات درست کرنے کے بعد اخیر میں ادھر توجہ کی۔ ضعف سلطنت مغلیہ کے باعث جتنے خطرات پیدا تھے ان میں سب سے کم خطرناک یہی صیغہ سمجھا گیا اور ایک طبیب حادثی کے طور پر تمام دیگر امراض کے رفع کرنے کے... بعد ایٹ انڈیا کمپنی نے ادھر توجہ کی۔

## دیوالیہ

قید کی سزا دین کے باقی رہنے پر مسلمان بھی دیتے تھے اور مفلسی ثابت ہونے پر وہ رہا بھی کرتے تھے لیکن شے بیعہ کے زرمین ہر محل یا ضمانت کے مواخذہ میں جو کوئی قید ہوتا تھا اس کی مفلسی اس کی رہائی کی مانع نہیں ہوتی تھی گویا نادار کے لئے قرض لینا یا ہر محل مقرر کر کے کسی عورت کو دھوکہ دینا یا ناداری کی حالت میں کسی کا ضمان ہو جانا ایک قسم کا جرم فوجداری تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ قانون اسی وقت مناسب تھا جب کل احکام شرع زیر عمل تھے سودی بہوار بند تھا قرض حسنہ سے لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوتی تھیں خرید و فروخت زائد تر نقد ہوا کرتی تھی اب کہ تمام تجارت ایک قسم کی قمار بازی ہو رہی ہے نہایت ہی نیک نیتی سے روزگار کیا جائے جب بھی دیوالہ نکل جاتا ہے قید کی سزا نادار مدیون کو دنیا مناسب نہ ہوگا۔ دیکھئے "زنا کاری فصل" جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ احکام شرع اسی وقت ہی لو انسان کے مہذب کرنے والے ہو سکتے ہیں جب ان پر پورا پورا عمل کیا جائے۔ آدھا تیر آدھا بٹیر بجائے نفع کے ضرر پہنچاتا ہے۔

## پنچایت

پنچایت کے قاعدے مسلمانوں میں ایسے ہی تھے جیسے کہ اب ہندوستان میں رائج ہیں۔ متخاصمین اپنی نزاع کے فیصلہ کے لئے جب کسی کو منتخب کرتے تھے تو حاکم عدالت پر اسے ترجیح دیجاتی تھی۔



## فصل نمبر ۲۵

### شہادت

شہادت کا قانون بھی مسلمانوں میں مثل اور قوانین کے بہت زائد مکمل ہے معاملات کی سادگی اور راستبازی اور قوم کی مردانگی اور عالی حوصلگی کے اصول پر اس کے مسائل متفرع ہیں مسلمانوں میں یہ طریقہ نہیں ہے کہ فریقین کے گواہ گزریں اور پھر عدالت غور کرے کہ کن کے گواہ سچے ہیں۔ نہایت برانظارہ ہے کہ دو میں سے ایک ضرور دروغ خلفی کرتا ہے اور عدالت مجبور ہے کہ جھوٹے کا کچھ نہیں کر سکتی اور روز بروز عوام میں دروغ خلفی ترقی کرتی ہے۔

باب جرائم میں گواہوں کی تعداد اور ان کے متعلق احکام پورے طور سے بیان ہو چکے ہیں۔ رہے دیوانی کے معاملات ان کے لئے بہت مختلف صورتیں ہیں۔ مختلف حالتوں کے لئے مختلف طریقے فتاویٰ کے ذریعہ سے قائم ہوئے ہیں گواہوں کی تعداد معین کر دی گئی ہے شہادت کس کو دینا چاہیئے بتا دیا گیا ہے۔ مختلف معاملات کے لئے مختلف طریقے جو مناسب حال تھے قائم ہو گئے ہیں فقہ کی کتاب سامنے رکھ کر تمام صورتوں کا خیالی نقشہ جما کر ذہنی عدالت قائم کی جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ اس سے اچھی صورت نوع انسانی کی حاجت براری کے لئے جہاں تک اس کو محاصمت سے تعلق ہے پیدا نہیں ہو سکتی۔ تمام صورتوں کا بیان کرنا مضمون کی طوالت کا باعث ہو گا۔ ایک صورت شفع کی بیان کرنے سے سمجھ میں آ جائے۔ کہ کیسی نہری حالت مسائل شرعیہ کی ہے۔



## شفعہ

مسئلہ شرع یہ ہے کہ اگر کوئی اپنا مکان فروخت کرے تو مکان کے شریک یا پڑوسی کو یا اس شخص کو جو اس راہ میں شریک ہو جو مکان بیعہ تک جاتی ہے یہ حق ہوتا ہے کہ جتنا روپیہ منسری نے دیا ہے اتنا ہی دے کر خود وہ مکان لے لے اس حق کو حق شفیعہ کہتے ہیں۔ پیغمبر خدا کی حدیث سے یہ حق مسلمانوں میں قائم ہوا ظاہر ہے کہ نیک نیتی اور صفائی سے اس حق کا نفاذ کیا جائے تو بے انتہا آسائش کے ذریعے اس سے تمدنی حالت میں پیدا ہو سکتے ہیں یہ قانون اسلام کی خصوصیات سے ہے۔ دنیا میں اور کہیں یہ قانون نہیں تھا اب جہاں ہے مسلمانوں سے ماخوذ ہے لیکن اگر بد نیتی سے اس کا نفاذ کیا جائے تو اس سے زائد مضر اور آزادی کا روکنے والا کوئی دوسرا قانون نہیں ہو سکتا۔ اب شرعی مقننون نے بد نیتی کی روک تھام کے لئے اس کے متعلق شہادت میں ذرا سختی قائم کی ہے اور وہ سختی بجائے خود نہایت سادہ اور سیدھے طریقے پر مبنی ہے۔ یعنی شفیع کے لئے یہ حکم ہے کہ جب وہ عدالت میں آئے تو حلف سے کہے کہ بیع کی خبر سننے کے ساتھ ہی میں نے اپنی رائے خریداری کے متعلق قائم کی تھی۔۔۔۔۔ اگر کسی وجہ سے حلف لینے کے لئے نہ آسکے تو اس کو گواہوں کے ذریعے سے بھی ثابت کر سکتا ہے۔ اول درجہ تو یہ ہوا اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ پھر وہ گواہوں سے ثابت کرے کہ محض ارادہ قائم کر لینے پر وہ مکتفی نہیں ہوا بلکہ مشتری کے پاس یا شے مبیعہ کے پاس پہنچ کر فوراً اپنا ارادہ دو گواہوں کے سامنے ظاہر کر دیا یہ سادہ سادہ مسائل ہیں اور ان کا نام طلب مواثبت اور طلب اشتهاد رکھا گیا ہے۔ اب دونوں نفلوں اور ان کے مفہوم کے سمجھنے میں اس قدر غلطیوں ہوئیں کہ ان مسائل کے مصالح نظر انداز ہو گئے اور ان امور کا گواہوں سے کہلانا ایک قسم کی رسم کا ادا کرنا سمجھا گیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ حق شفیعہ سے اگر طلب مواثبت اور طلب اشتهاد نکال ڈالئے تو حق شفیعہ بجائے تمدنی حالت درست کرنے کے اس کا محض ثابت ہوتا ہے پڑوسی پورا دام نہیں دیتا اختیار شفیعہ سے ڈرتے ہیں بچنے والا مبتلائے عذاب ہے اگر کسی نے دل کڑا کر کے خرید بھی لیا تو ایک سال تک وہ اپنی حالت غیر محفوظ پاتا ہے۔ سال بھر میں حالتیں بدل جاتی ہیں ارادوں میں انقلاب پیدا ہوتا ہے سال کے ختم پر ایک ایسے شخص نے دعویٰ شفیعہ کا ارادہ کیا جو شروع سال میں گداگری پر بسر کرتا تھا استطاعت خریداری بالکل نہیں رکھتا تھا دیکھیے خریدار کے لئے کتنی بڑی نہجمت کا سامنا



ہوا۔ غرض کہ عدالتی کاروائیوں میں بھی بڑے بڑے مصالح اور نکات ہیں جن سے واقف ہونے اور ان پر غور کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ شرع محمدی نے اپنے دنوں میں بہت کچھ آسائش بندگان خدا کو پہنچائی ہیں لیکن یہ بھی واضح رہے جیسا کہ میں بار بار کہہ چکا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ شرع محمدی تمام اصول کے ساتھ متعلق کی جائے جب ہی اس میں آسائش ہے ورنہ نہیں۔ مثلاً اسی مقام پر سمجھیے کہ جہاں شرع محمدی کا مسئلہ شفع روح ہو کہ متعلق کیا جاتا ہے اور طلب موثبت اور طلب اشہاد کا خیال نہیں ہوتا۔ وہاں مسئلہ شفعہ سے تمدنی حالت میں بجائے بہبودی کے ابتری پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے

### مفقود الخیر

مفقود الخیر کی نسبت احکام شرع نہایت اچھے ہیں کہ اسکی جائداد کے انتظام کے لئے اس کو مردہ تصور کر لیتے ہیں اور دیگر امور کی نسبت اسے ایک زمانہ معین تک زندہ مانتے ہیں۔ زمانہ انتظار عنفیوں کے نزدیک بے شک بہت زائد ہے جو بسا اوقات نامناسب وقفہ کہا جاتا ہے۔ لیکن اور ائمہ کے نزدیک اس سے بہت کم زمانہ رکھا گیا ہے۔ اور اوسط حساب سے کم و بیش وہی ہوتا ہے جو انگریزی قانون میں معین ہے یعنی آٹھ سال اور بعض ائمہ نے اس سے بھی کم زمانہ رکھا ہے۔ امام مالک نے ۴ برس کی مدت رکھ کر عورتوں کے حقوق کی نگہداشت کی ہے اور مفقود الخیر کی بیوی کو یہ حق دیا ہے کہ اس کے بعد وہ قاضی سے افتراق کا حکم صادر کرائے۔







# باب پنجم

عقائد مذہبی اور علمی مباحث

## فصل نمبر ۴۶

حقیقت اسلام

کوئی سمجھے تو دنیا کی ہر ایک چیز نمونہ قدرت ہے اور سوچے تو ہر ذرے سے صنعت کردگار ہو پید ہے کن کن چیزوں کا نام لیا جائے۔ آفتاب، ماہتاب، ستارے، زمین، ابر دریا، پہاڑ، آگ پانی، ہوا، مٹی، حیوانات، نباتات، جمادات وغیرہ ہر ایک بحال خود تماشہ اور بجائے خود ذریعہ معرفت ہے۔ ان کو آنکھوں سے دیکھنے والے تو سب ہی ہیں۔ لیکن غور کرنے والے کم ہیں۔ مثلاً تغیر موسم کہ وہ خود ایک تماشہ ہے۔ ابھی گرمی تھی، سارا جسم پھکا جاتا تھا کہ دفعتاً ہوا چلی اور گھرا مینچو برسے لگا۔ زمین سے آسمان تک کرہ نار تھا اور دو ایک منٹ میں طبقہ زمہریر ہو گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چلے آتے ہیں۔ زمین سطح آب کی طرح سپید ہو رہی ہے کہ نباتات نے زمین سے اپنا سر نکالا۔ بوسے ہوئے بیج دو چار روز ہی میں جم گئے۔ سبزہ زمردین سے تمام زمین بھر گئی۔ درختوں میں بھی نئی نئی کوئلیں نکلیں۔ جامہ سبز پہن کر تمام درخت اکڑے ہوئے کھڑے ہیں۔

برگ درختاں سبز در نظر ہوتیار ہر وقت دفتر است معرفت کردگار

برسات کا موسم جلسے پر جاڑے کا موسم شروع ہوا اور جاڑے کے بعد گرمیاں آئیں جاڑوں



وہ گرمیوں میں بیکار ہو کر خود بخود نظروں سے گر گئیں۔ برسات میں یہ سمجھا گیا تھا کہ پانی نباتات کی جان ہے۔ جاڑے کی شب شبنم کی وجہ سے لہف برسات ہے۔ لیکن پھر بھی سبزہ زار زندگی سے ناخوش ہے اور اپنی صورت سے بیزار ہے۔ درختوں کے پتے گر گئے ہیں۔ سوکھی ٹہنیاں کھڑی موسم بہا پہ ماتم کر رہی ہیں یا آئندہ بہار کے خیر مقدم کے لئے رہنہ تن خواب گاہ سے دوری چلی آتی ہیں۔ جاڑوں میں تو کچھ شبنم کا آسرا تھا اب چیت کی ہوانے اسے بھی الگ کیا زمین جیسی دنی کو خشک ویسی ہی رات کو بھی خشک۔ پھوٹا ہوانے سطح زمین کو سوکھی رکھنے سے مشابہ بنا دینا ہے قیاس چاہتا ہے کہ سبزہ برسوں دیکھنے میں نہ آئے گا کہ دفعتاً تغیر موسم نے اپنا زور دکھایا موسم برسات سے بھی کہیں زیادہ خوشنما حالت میں سروں پر پھولوں کے تاج رکھے ہوئے نئی پتیاں نمودار ہوئیں۔ دنیا کے انقلابات کا بظاہر ایک سبب ہے لیکن وہ سبب محض تسکین قلب کے لئے ہے۔ نہ کوئی کلیہ ہے اور نہ کوئی معین قاعدہ ہے جو حالت پیدا ہوتی ہے انسان اس کے لئے کوئی راستہ قائم ہی کر لیتا ہے اور اس جھوٹ موٹ کی بلے زنی کو وہ انتہائے علم یا کمال دانش تصور کرتا ہے لیکن جو جتنا ہی سمجھدار ہے وہ اتنا ہی معاملات دنیا میں اپنی رائے کو ناقص اور عقل کو ناکافی محض سمجھتا ہے۔ بیشک خدا نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے اور اسی کو تقدیر کہتے ہیں لیکن ہم نہیں سمجھتے۔

علم طب کے پڑھنے والے اور علم تشریح کے جاننے والے پیٹھ کے دھندے سے فرصت نہیں پاتے ورنہ صنعت کردگار کے معائنہ سے دیوانے بن جائیں۔ انسان پیدا ہوا بچا جوان ہوا۔ بوڑھا ہوا۔ کمزور ہوا اور مر گیا اور کبھی چلتے چلتے گرا اور قبل از وقت مر گیا اس دوران میں اس کی حالت بے انتہا تغیرات سے دوچار ہوتی ہے جن میں سے اکثر اسے خود محسوس نہیں ہوتے خود اس کی ترکیب جسم کے متعلق ایسے ایسے راز اور ایسی ایسی حکمتیں ہیں کہ تمام دنیا کا علم حاصل ہونے پر بھی انسان خود کو پہچان نہیں سکتا اور نہ اپنے جسم کی ماہیتوں کا مددگار بل بن سکتا ہے اللہ اللہ کچھ ٹھکانا ہے۔ جس طرح آنکھ کے تل میں تمام عالم سما یا ہوا ہے اسی طرح انسان جزو ضعیف تمام قدرت کا ایک خلاصہ ہے یا دوسرے معنوں میں کہیے تو قادر مطلق کی بے انتہا صنعتوں کا ایک ادنیٰ نمونہ یا باغ عالم کا ایک ادنیٰ اشکوفا ہے۔

بہر حال انتظام عالم پر غور کیا جائے، خود اپنے وجود اور ترکیب جسم پر لحاظ کیا جائے دنیا کے انقلابات اور عالم کے موجودات پر بغور نظر ڈالی جائے تو ان تمام چیزوں میں کم سے کم



ایک قوت کا ادراک تو ہر فرد بشر کو ہو گا اور یہ معلوم ہو گا کہ اسی قوت سے چیزوں کا وجود قائم ہے۔ پھر اس وجود کے اسباب پر غور کیا جائے تو ہر ایک اپنے پندار کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور سمجھ لے گا۔ سوچنے والے ذرا بھی سوچیں تو ان قوتوں کو جدا جدا خالق ماننے کی جرأت نہ کریں گے اور نہ یہ کہہ سکیں گے کہ یہ اسباب باہم ایک دوسرے سے بے تعلق ہیں۔ اب یہ قوتیں بہ حیثیت مجموعی یا یہ اسباب بہ شکل واحد کسی قوت یا سبب پر خواہ مخواہ ملتی ہوں گے بس اسی علت الحلل کو اہل اسلام الہ یا خالق سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی ذات واحد کو مختلف اعتبارات سے قادر مطلق۔ رب۔ رحیم۔ رزاق وغیرہ وغیرہ پیارے ناموں سے پکارتے ہیں۔

اسلام پہلے یہ سکھاتا ہے کہ مختلف قوتوں کو تم اللہ نہ کہو اور نہ مختلف اسباب کو خالق سمجھو۔ یہ ضرور مانتا ہے کہ اللہ نے ہر چیز کے عدم وجود کے لئے اسباب بنا رکھے ہیں۔ معمولی طور پر ان اسباب کے خلاف نہیں ہوتا ان اسباب پر غور کرنا انسان کا فرض ہے بلکہ ایک قسم کی عبادت یہ بھی ہے۔ لیکن اسلام یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ خالق مطلق نے انسان کو پیدا کر کے اپنا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ دنیا کا گورکھ و ہند بنا کر وہ خود موجود معطل بن بیٹھا۔ بیشک اللہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ وہ اسباب سے قطع نظر کر کے ہر وقت اپنے اختیار تمیزی کو نافذ کرتا رہے علم اور تجربہ کہتا ہے کہ خدا ایسا نہیں کرتا لیکن یہ کہنا کہ وہ چاہے جب بھی نہیں کر سکتا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ خدا کو واحد اور قادر مطلق ماننے میں جو مصلحت ہے اسے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ دنیا میں عقلی باتیں وقوع پذیر ہوتی ہیں ان کے لئے ایک نہ ایک سبب ضرور ہوتا ہے۔ سبب یا تو ایسا ہے کہ انسان اس کو بادی النظر میں یا ذرا غور کے بعد سمجھ جاتا ہے یا ایسا ہے کہ انسانی عقل اس کے ادراک سے قاصر ہے آخر الذکر صورت میں بسا اوقات انسانی کمزوری گمراہی کی طرف منجر ہوتی ہے۔ مثلاً بیماری کی حالت میں طبیب کے پاس جانا۔ عطار سے دوا مانگنا حجام کی خوشامد کرنا بجا نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا دار اسباب ہے اسباب کا محتاج بنا گیا قانون قدرت کے بالکل موافق ہونا ہے لیکن بیماری کو خطرناک سمجھ کر اسباب ظاہر سے چشم پوشی کی جائے اور کسی جاہل کے کہنے سے بیمار اپنے جسم کے برابر دھاگنا پ کر پیل کے درخت میں پیٹ آئے اور امید رکھے کہ پیل شفا بخشنے میں اپنا اثر دکھائے گا تو یہ عقلاً بہت معیوب ہے اور اسلام اس کو شرک بتاتا ہے اور صاف صاف کہتا ہے کہ انہیں کم فہمیوں کے ٹٹانے کے لئے میں ضروری سمجھا گیا ہوں یعنی اسباب ظاہر نہ ہوتے ہوئے کسی شے کو بے وجہ



قادر مطلق مان لینا قادر مطلق کی قوت سے انکار کرنا ہے اور اسی کو اصطلاح شرع میں کفر کہتے ہیں۔ یا ایسی بھی حالت میں کسی کو اللہ کا ساتھی سمجھ لینا شرعی اصطلاح میں شرک کہلاتا ہے اور یہ کفر و شرک دونوں نوع انسانی کے لئے بید مضر ہیں۔ جس طرح عالم اسباب ظاہر میں بسا اوقات حاکم وقت کی اجازت لازم ٹھہرتی ہے اور بغیر اس کے انسان کو آرام میسر نہیں آسکتا ویسے ہی اسباب مخفیہ میں ایک قوت (اللہ) کو قادر مطلق ماننا۔ صبر۔ قناعت۔ دلجمعی۔ قوت دل اور مضبوطی خیالات کا سبب ہوتا ہے اور تجربہ کہتا ہے کہ بغیر ان باتوں کے سچی خوشی جس کی احتیاج سے کوئی بے نیاز نہیں ہو سکتا کسی طرح حاصل نہیں ہوتی جس طرح کئی خدا کے ماننے میں انسان کے خیالات میں پریشانی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح خدا کے انکار کرنے سے بھی دل میں کمزوری اور بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے سب کو خود سے بڑا سمجھنے سے جس طرح دل بے انتہا کمزور ہو جاتا ہے اسی طرح کسی کو خود سے بڑا نہ سمجھنے سے بے انتہا زبردست ہو جاتا ہے اور یہ دونوں حالتیں انسان کے حق معاشرت و حسن تمدن پر برا اثر رکھتی ہیں۔ اعتدال کی حالت یہ ہے کہ انسان صرف ایک خدا کا قائل ہو۔ کسی سے نہ ڈرے مردانہ وار معاملات دنیا میں کوشش کرے۔ کامیابی کی صورت میں خدا کا شکر کرے کہ نخواستہ پیدا نہ ہو اور ناکامی کی حالت میں یہ سمجھے کہ السعی منی والالتیام من اللہ۔ اپنے مقدر نے نہ چاہا کام نہ ہو آئندہ سہم کوشش کی جائے گی خدا سے ناامید نہ ہونا چاہیے۔ انہیں معتدل خیالات سے دنیا میں موحل قومیں ہمیشہ خوشحال اور سرسبز رہتی ہیں اور اسی لئے اس اعتدال کی تعلیم اسلام نے بھی کی ہے۔

اللہ ایک ہے لا الہ الا اللہ اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ دو تین اللہ نہیں ہیں۔ بلکہ اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ دنیا میں جتنی باتیں ہوئیں۔ ہو رہی ہیں۔ یا ہوں گی ان سب کا سبب صرف وہ قوت ہے جس کو مسلمان اللہ کہتے ہیں اور چونکہ یہ ایسی قوت یا ایسا سبب ہے جہاں تمام قوتیں یا اسباب منتهی ہوتے ہیں اس لئے اس قوت یا سبب کا قادر مطلق ہونا لازم ہے۔ اور کسی کو قادر مطلق نہیں کہہ سکتے جب تک اس کے شریک یا ہمسر کا وجود ممکن نہ ہو۔

خدا کا شریک کوئی دوسرا چھرا یا جائے تو خدا کو تکلیف نہیں ہوتی اور نہ خدا کو کوئی رنج پہنچتا ہے۔ جب اس کے وجود سے انکار کیا جاتا ہے۔ وہ ان باتوں سے بے تیار ہے۔ یہ باتیں شرع محمدی میں اس لئے ممنوع ہے کہ خود انسان کو ان باتوں سے بالآخر اذیت پہنچتی ہے۔

منہ سے لا الہ الا اللہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تمام امور دنیاوی میں اللہ ہی سبب سمجھا جائے۔ خدا کی عظمت اور جلال کسی حالت میں کم نہ ہو عملی طور پر یہ دکھا دیا جائے کہ کلمہ گو کے دل سے کسی



انسان یا حیوان کا خوف یا دنیاوی طمع اللہ کے قادر مطلق ہونے کے علم اور یقین کو ذرا بھی کم ہونے نہیں دیتی۔ مسلمان کسی سے ڈرتا ہے تو صرف اسی حالت میں کہ وہ ڈرنے کو اپنے اوپر شرعاً فرض جانتا ہے بیجا خوشامد، بے موقع چالپوسی ناروا انما می یہ ہرگز اہل اسلام کا شعار نہیں ہے اسلام جو شجاعت تعلیم کرتا ہے اس کا اقتضا یہ ہے کہ اگر لاتلقوا بایدیکم الی التہلکۃ قرآن میں نہ آتا تو اہل اسلام بوقت ضرورت سانپ ہاتھ سے پکڑ لیتے۔ شیر کے منہ میں کلانی ڈال دینے یا دریا میں کود پڑنے میں بھی دریغ نہ کرتے غرض کہ مسلمان کی شان سے ہے کہ وہ اللہ کو ہر دم حاضر و ناظر سمجھیں اور یہی ان تمام ترقیوں اور کامیابیوں کی جڑ ہے جو کچھ مسلمانوں کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ زمیندار کے نزدیک تحصیلدار مالگزار خدائے حلقہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن معائنہ تحصیل کے لئے کوئی چھوٹا سا مجسٹریٹ ضلع یا کشر قسمت آجائے تب دیکھئے کہ تحصیلدار ہے کہ ادنیٰ چہرہ اسی کی وقعت بھی عوام کی نظروں میں نہیں رکھتا۔ سٹوڈی دیر کے لئے اس کی حالت بدل جاتی ہے مشعل کے آگے چراغ کی روشنی زائل ہوئے بغیر نہیں رہتی دن میں سورج کے سامنے مشعل کی کیا مجال کہ اپنی روشنی پھیلا سکے۔ ضرب المثل ہے کہ نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے بس یوں ہی سمجھنا چاہیے کہ اللہ کو پورے یقین کے ساتھ حاضر و ناظر اور قادر مطلق جاننے والوں کو سچ کوئی دوسری شے قابل لحاظ نہیں معلوم ہوتی ایسے لوگ نہ خوف بیجا کو قریب آنے دیتے ہیں اور نہ کسی چیز کی طمع دل میں رکھتے ہیں۔ بھڑٹ، چوری، زنا، غیبت، کبر، لالچ، بغض حد وغیرہ اخلاق مذموم ان سے اس طرح فرار کرتے ہیں جس طرح تاریکی شب سے نور اور حرارت آفتاب سے۔ شبنم منہ سے۔ موجد بن جانا تو آسان ہے۔ لیکن دل سے اور یقین سے موجد ہونا ذرا مشکل ہے اور اس زمانہ میں تو بہت ہی مشکل ہے۔ اسلام نے یہ سمجھایا ہے کہ کافر کلمہ پڑھنے سے ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا وہ آج ماں کے پیٹ سے نکلا۔ تو جید زبانی کوئی چیز نہیں ہے ہاں سچے دل سے اگر مانی جائے تو آدمی کی ماہیت اس سے بدل جاتی ہے سانپ جس طرح کچھلی سے نکل کر نئی حالت پیدا کرتا ہے اسی طرح انسان بھی موجد بننے سے ایک نئی دنیا میں آ جاتا ہے اس تو حید سے کچھ ایسے خیالات حمیدہ اور عقائد حسنہ پیدا ہوتے ہیں کہ انسان اپنی پہلی حالت سے کوئی نسبت ہی نہیں رکھتا۔ سچے اسلام نے اپنا جلوہ دکھایا نہیں کہ جن جاتا رہا۔ ہمت بڑھ گئی دل و دماغ میں قوت آگئی۔ خیالات میں تازگی اور شادابی پیدا ہوئی۔ حق اور باطل میں تمیز ہونے لگی تاریکی خیالات زائل ہوئی۔ مختصر یہ کہ اسلام سے دفعۃً نوعیت ہی بدل گئی۔ کسی گاؤں کے دو سبائیوں سے کاشتکاری



کے کام میں گھریا چھوڑ دیا جائے اور چھوٹا کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم پانے کے لئے انگلینڈ بھیج دیا جائے  
اب آٹھ دس برس کے بعد چھوٹا سجاٹی اپنے گھر واپس آئے تو ظاہر ہے کہ بڑے سجاٹی کو چھوٹے  
سے کوئی نسبت نہ ہوگی۔ انگلینڈ کی تعلیم اور صحبت پچھلے لڑکے پر کچھ ایسا اثر ڈال دے گی کہ اس  
کی فطرت ہی بدلی ہوئی نظر آئے گی اس سے کہیں زیادہ حیرت افزا ترقی تھی جو ابتداء اسلام کی بدولت  
آنا فانا عرب اور اس کے گرد و نواح کے باشندوں کو حاصل ہوئی۔ مسلمانوں کی صحبت نصیب ہوتے  
ہی تمام باتوں میں آسمان وزمین کا فرق ہو جاتا تھا سبب صرف یہ تھا کہ پیغمبر خدا کے اثر صحبت  
سے لوگ توحید کے معنی سمجھتے تھے اور اس پر دل سے یقین کرتے تھے اور بے تکلف اس قابل  
تھے کہ اپنے یقین کو فیض صحبت سے دوسروں کی طرف منتقل کر سکیں۔

## رسالت

تصدیق رسالت کے ساتھ منہ سے کلمہ توحید کہنا اور دل سے اس پر یقین کرنا اسلام کے  
کے لئے کافی ہے۔ یہ تو ایک مسلم بات ہوئی اب گفتگو یہ ہے کہ یقین یا تصدیق باقلب کیا شے  
ہے بعضوں نے لکھا ہے کہ جو شخص بغیر انفعال بڑے بڑے معاصی کا مرتکب ہو وہ ہرگز مومن  
نہیں ہے اور حجت یہ کی ہے کہ خدا کو سچے دل سے حاضر اور ناظر جاننے والا یا دل کی آنکھ سے  
اس کا دیکھنے والا ارتکاب جرائم کر ہی نہیں سکتا اگر کسی فوری اثر اور دیوانہ وار جوش کی وجہ سے وہ جاہ  
اعتدال سے کبھی پھر بھی گیا تو خدا کا خیال اسے پھر اپنی اصلی حالت پر ضرور کھینچ لائے گا اسی بازگشت  
کو اصطلاح شرع میں توبہ کہتے ہیں ایک شخص منہ سے تو کلمہ پڑھتا ہے لیکن اس کے افعال بالکل  
مسلمانوں کے سے نہیں ہیں۔ اگر یہ مسلمان ہے تو پیغمبر کے زمانے میں منافق کس کو کہتے تھے منافق  
وہ تھے جو خوف، طمع یا مصلحت سے کلمہ تو پڑھ لیتے تھے لیکن ان کے دلوں میں کچھ بھی اسلام کا  
خیال نہ تھا۔ اب زمانہ حال کے مسلمان اپنی طبیعتوں پر غور کریں کہ وہ کلمہ گو محض اس لئے ہیں کہ ان  
کے باپ دادا کنبہ ناستہ والے کلمہ گو تھے۔ یہ سبھی ان کی تقلید کرنے لگے یا کہ وہ خود اس طرح توحید  
کے دلدادہ ہیں کہ اگر مسلمان گھرانے میں پیدا نہ ہوتے جب بھی توحید کی محبت انہیں اسلام کی  
طرف ضرور کھینچ لاتی اب ہر شخص بطور خود فیصلہ کرے کہ اس کے اسلام کی نوعیت کیا ہے یہاں  
اس زمانے کے اسلام پر کوئی لیکچر نہیں دینا ہے لیکن اس قدر لکھنا بھی بے موقع نہیں ہے کہ زمانہ  
گزشتہ کی حالت کچھ ہی ہو اس زمانہ میں منہ سے کلمہ پڑھ لینا مسلمان ہونے کے لئے ہرگز کافی نہیں



ہے۔ وہ زمانہ انہیں زمانے والوں کے ساتھ گیا کہ ادھر کلمہ پڑھا ادھر فیض صحبت نے کلمہ کا مفہوم دل پر نقش فی الحجر کندہ کر دیا اور تصدیق خود بخود حاصل ہو گئی۔ اب تو یہ حالت ہے کہ ہم خود ہی مسلمان نہیں ہیں دوسروں کو کیا مسلمان کریں گے۔ ہم خود راہ بھولے ہیں دوسروں کو کیا راہ دکھائیں گے۔ کئی صدی پہلے سے مسلمانان درگور و مسلمانان در کتاب کہا جاتا تھا۔ اب تو اس مقولے کے سمجھنے والے بھی مفقود ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں موجودہ اسلام کی تفسیریک مقصود نہیں ہے۔ لیکن مصلحتاً لکھنا ناگزیر ہوا کہ اس کتاب میں حالت اسلام اس طرح لکھی جاتی ہے کہ اس کے پڑھنے کے بعد مسلمان تمام بنی نوع انسانی میں اشراف اور افضل دکھائی دیں اور ان کے طریقے سب کے طریقوں سے اعلیٰ اور اکمل معلوم ہوں اور اسلام گویا نعمت خدا معلوم ہو۔ اس کتاب کی لمبی چوڑی داستانیں پڑھنے والے جب خارج میں مسلمانوں کے اطوار دیکھتے تو کہتے کہ: اگر یہی نعمت خدا ہے تو ہم اس نعمت سے درگزر سے۔ یہ مسلمان ہی کو مبارک رہے۔ اس لئے مختصر طور پر دکھا دینا ناگزیر ہوا کہ زمانہ حال کے مسلمان اور خصوصاً ہند کے مسلمان بہ شکل اپنے کو مسلمان کہہ سکتے ہیں۔ کچھ دنوں پہلے مسلمان کے یہاں اہل اسلام کی صورت بنا کر خیر اسلام کے نقال سمجھے جاتے تھے اور اب زمانے کے ایر پھیر سے وہ حالت بھی جاتی رہی۔ اب مسلمانوں کو مسلمانان صورت بنانے سے بھی نفرت ہے۔ اہل اسلام ہونا اور اسلام پر فریفتہ ہونا کیسا۔ جس اسلام کی عظمت اور حکمت اس کتاب میں دکھائی جاتی ہے وہ اسلام معدوم نہیں ہے اور نہ معدوم ہو سکتا ہے لیکن بہت ہی خاص خاص لوگوں میں ہے اور وہ بھی اس طرح کہ بے سرو سامانی کی حالت میں پڑا اپنے پرانے چاہنے والوں کے سوگ میں ماتم کر رہا ہے اگر اسلام کا نعمت خدا ہونا عملی طور پر دیکھنا ہے تو ناظرین پچھلے مسلمانوں کے کارنامے اس کتاب کے صفحے الٹ کر پڑھیں اور سمجھیں کہ جب تک اسلام اسلام کی طرح سمجھا گیا اس نے کیسے کیسے سلوک اپنے چاہنے والوں کے ساتھ کئے اور اپنے چاہنے والوں کو کیا سے کیا کر دیا یا انہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا اب بھی جو لوگ اس کے چاہنے والے ہیں اپنی نعمت سے وہ ان کے ساتھ دریغ نہیں کرتا۔ لیکن دو ایک کا تنعم یا دو چار کی حالت کسی شمار میں نہیں۔ سب سچے دل سے اسکی پیروی کریں تو معلوم ہو کہ اسلام کا چشمہ فیض کبھی خشک نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے سچے اور مستحکم اصول کسی حالت اور کسی زمانے میں نامناسب کہے جاسکتے ہیں یہ ہر وقت ہمارے اخلاق درست کرنے کو تیار ہے بشرطیکہ اس سے مناسب طور پر مدد چاہا جائے۔ نوع انسانی کی اصلاح کے لئے اسلام



سے اچھا قانون نہیں بن سکتا۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ خود اہل اسلام جب چاہتے ہیں کہ اپنی حالت درست کریں تو غیر قوم کے برے قواعد کی پیروی کرتے ہیں۔ اسلام میں نے تمام دنیا کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا تھا آج وہ پرانی مسجدوں کے کھنڈروں میں ارکان و صنوع کی صحت، درستی صفت نماز جنازہ وغیرہ وغیرہ خد محدود امور پر منحصر ہو رہا ہے اور اس زمانے کے بڑے بڑے علماء کی تنگ خیالی یہ کہہ رہی ہے کہ انہیں چنار کان میں اسلام کی تمام خوبیوں کا ظہور ہے اور یہ نہیں سمجھتے کہ آج اسلام کے عمدہ اصول کے کاربند ہونے سے یورپ کی قوم کس درجہ نمایاں حالت رکھتی ہے۔ غضب ہے کہ اہل اسلام اور وہ بھی کیسے کہ بڑے بڑے متقی جو آمین بالبحرین کر۔ یا نماز کی صفت ٹیڑھی دیکھ کر مرنے کو تیار ہو جائیں یہ بھی نہیں جانتے کہ ایفائے وعدہ کیا شے ہے۔ معاملات بیع و شری میں دیانت کا کیا مقتضی ہے۔ بد عہدیوں کا مفہوم کیا ہے۔ اور رزق حلال کس کو کہتے ہیں۔

”محمد رسول اللہ“ محمد خدا کا پیغام بر ہے۔ منہ سے تو یہ پانچ لفظ کا جملہ بہت ہی آسانی سے بولا جاتا ہے لیکن اس پر عمل کرنا اور اس کو سچا سمجھنا آسان نہیں ہے جتنا منہ سے کہہ ڈالنا۔ ایمان کی تکمیل کے لئے وحدانیت کے ساتھ یہ بھی ماننا ضروری ہے کہ آنحضرت محمد خدا کے پیغمبر ہیں۔ یعنی جتنی باتیں آنحضرت نے سکھائی ہیں وہ سب اللہ کی طرف سے ہیں اور اس لئے وہ سب حکمت سے بھری ہوئی ہیں۔ اللہ کی طرف سے ہیں۔ یہ سمجھنا تو اعتقاد اور یقین پر مبنی ہے۔ لیکن ان کا حکمت سے پر ہونا سوچنے اور سمجھنے کی بات ہے اور غور اور فکر سے اس اعتقاد اور یقین کی استواری میں بہت کچھ مدد ملتی ہے یعنی جب بعد غور و فکر کے یہ معلوم ہو کہ جو قانون آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری کیا وہ تمام گزشتہ موجودہ اور آئندہ قوانین سے عقلاً افضل ہے تو خود بخود عقل سلیم مان لے گی کہ ایسا مستحکم اور لازوال قانون حکمت اور نعمت سے بھرا ہوا سوائے خالق عالم کے دوسرے کا بنایا ہوا ہو ہی نہیں سکتا۔ خدا کا گھر۔ خدا کی کتاب۔ خدا کا قانون۔ خدا کا حکم ان سب میں اضافہ محض اظہار تحفیس کی غرض سے ہے۔ ورنہ کوئی گھر کوئی کتاب کوئی قانون کوئی حکم ایسا نہیں ہے جو خدا کے علت العلل ہونے کے لحاظ سے خدا کا نہ سمجھا جائے۔ ”شریعت خدا کا قانون ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس قانون قدرت نے انتظام عالم قائم کیا ہے اس کا مقتضایہ ہے کہ انسان پر لطف زندگی بسر کرنے میں شریعت محمدی یعنی اس قانون کا پابند رہے جو قانون ربانی کہا جاتا ہے۔ قرآن کلام اللہ ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے جو قانون بندوں کے لئے بنایا اس کا اس میں ذکر ہے اور اللہ نے بندوں کی تعلیم کے لئے اپنے رسول پر اتارا ہے۔ یوں تو ہر چیز اللہ کی بنائی ہوئی



ہے اور تمام چیزیں اسکی اتاری ہوئی ہیں لیکن شریعت محمدی یعنی قرآن کی نسبت یہ تخصیص انھیں معنوں میں ہے جنکی توضیح اوپر کی گئی ہے۔

پیغمبر کو رفاہ مر سے تعبیر کریں تو نئے خیال والے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ تاریخ جاننے والے متفق ہیں کہ پیغمبروں سے ہمیشہ اصلاح حالت ہوتی رہی ہے۔ کسی زمانے میں کوئی قوم مذہبی خیال سے خالی نہیں رہی۔ خلقت آدم سے مذہبی خیالات کا وجود پایا جاتا ہے۔ گویا نبی نوع انسانی کے ساتھ ہی مذہب بھی پیدا ہوا۔ عقل سے کام نہ لینا بڑا ظلم ہے۔ خلقت انسان کے ساتھ مذہب کا لزوم روز ازل سے ہے اور آخر کچھ اسکی وجہ سوچنا چاہیے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس فطرت نے انسان پیدا کئے اسی نے انسان کے ہذا من زندگی بسر کرنے کے لئے قانون بھی بنا دیئے اس قانون کے بنانے والے اصطلاح مذہب میں رسول اور نبی کے نام سے پکارے جاتے ہیں اصول میں یہ قوانین یکساں ہیں جہاں کچھ اختلاف ہے وہ بہت ہی ضعیف اور ناقابل لحاظ ہے ایک جدید پیغمبر کا آنا اس عرض سے نہ تھا کہ کسی نئے دین یا نئے خدا کا وجود اس کو قائم کرنا تھا بلکہ ایک پیغمبر کے احکامات کو جب اس کی امت بھولنے لگی تو اصلاح حالت اور یاد دہانی کے لئے دوسرا پیغمبر یا رفاہ مر آیا اسوقت دنیا کے مختلف مذاہب میں جو اختلاف ہے وہ محض امت کی غلط فہمیوں یا تصور کا نتیجہ ہے اور یہی ایک بڑا ثبوت اس امر کا ہے کہ کیوں پے در پے پیغمبروں کے آنے کی ضرورت ہوئی۔ پیغمبر آخر الزماں کا درجہ جو اور پیغمبروں سے فائق سمجھا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انکی بعثت ایسے زمانے میں ہوئی کہ دنیا بہت کچھ ترقی کر چکی تھی جو کام پہلے انبیاء کے متعلق تھا وہ پیغمبر آخر الزماں کے علمائے امت کے تعلق کیا گیا۔ علمائے امتی کا انبیاء بنی اسرائیل۔ دیکھو ہر قرن اور ہر فرقہ میں سولے قرآن کے کتنی مذہبی کتابیں قرآن کی موافقت میں یا اس کی تفسیر میں تصنیف ہوئیں۔ اصلاح امت کے لئے کیسے کیسے لوگ پے در پے پیدا ہوتے رہے اور انھیں درمیانی اشخاص کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ ہم اسلام کو مانیں یا نہ مانیں۔ اسے سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ لیکن اسلام کی تصویر کہیں سے خراب یا میلی نہیں ہونے پائی۔ اب جس پیغمبر کی امت میں انبیاء بنی اسرائیل کی طرح علماء پیدا ہوں اس کے خاتم النبیین افضل البشر ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ محمد رسول اللہ کے ساتھ ایک صفت اور بھی مخصوص ہے جو دوسرے پیغمبروں میں کم ملے گی وہ یہ کہ آنحضرتؐ نے ترک دنیا کی ترغیب دے کر خدا شناسی کی تعلیم نہیں کی بلکہ یہ بتلایا کہ دنیا اور دین دونوں کو ساتھ ساتھ رکھ کر کیونکر ایک انسان اعلیٰ درجے کی خوشی حاصل کر سکتا ہے۔ آنحضرتؐ جو قانون اپنی امت



کے لئے لائے اس پر غور کرنے سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ ممکن کوئی دوسرا دین نہیں ہو سکتا اور نہ بجز شرع محمدی کے کوئی دوسری شرع ایسی ہے جس پر عمل کرنے والا سچی خوشی سے فیضیاب ہو۔ قرآن میں اسی طرف اشارہ ہے: "الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً" کتاب ہذا میں مختلف مقامات پر دکھایا گیا ہے کہ آنحضرت کی تعلیم مذہب تمام امور میں افضل اور اکمل ہے آنحضرت کی فضیلت خصوصیت کے ساتھ بیان کرنے کا یہ کوئی محل نہیں ہے کیونکہ تمام کتاب اسی بحث میں ہے اس کتاب کو ناظرین غور سے پڑھیں گے تو خود بخود ان کے منہ سے نکل جائے گا کہ: "محمدؐ تو رسول برحق ہے اور دنیا میں کوئی بشر تجھ سا مجمع کمالات پیدا نہیں ہوا تیری شریعت تیری افضلیت کی دلیل ہے۔"

بعضوں کا خیال یہ ہے کہ امور دنیا ایک معین قانون قدرت پر چلتے رہتے ہیں۔ خدا کو پیغمبر پیدا کرنا۔ اس کے پاس جبرئیلؑ کی معرفت کتاب بھیجنا۔ معجزات سے اپنے پیغمبر کو سچا ثابت کرنا اس دخل در معقولات سے کیا واسطہ؟ اس کا جواب وہی ہے جو پہلے لکھا گیا کہ اہل اسلام کیا دنیا کا کوئی سمجھ دار یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ نے دنیا کا گو رکھ دھندا بنا کر اپنے وجود کو محفل کر دیا۔ انسان جو یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ خالق مطلق نے پہلے انڈے سے مرغی پیدا کی یا مرغی سے انڈا اسکی مجال نہیں ہے کہ تحقیق عالم پر کوئی ایسی قطعی رائے قائم کر لے کہ اس سے عدول کرنے کو بے عقلی سمجھ

جیف بریں دانش و فرزانگی

لیکن جو لوگ ایسے ہی مندی ہیں کہ جو بات ان کے ذہن میں آئی اس کے خلاف سمجھ ہی نہیں سکتے ان سے پوچھا جائے کہ کبھی کبھی دم دار ستارے کا ظاہر ہونا۔ خود بخود پہاڑ سے آگ کا شعلہ نکلنا آسمان سے شہاب ثاقب گرنا اسی قسم کی ہزاروں لاکھوں باتیں ہیں کہ سائنس کوئی نہ کوئی وجہ یا تاویل اسکی نسبت پیدا کر ہی لیتی ہے جیسے یہ سمجھتے ہیں کہ اتنے دن کے بعد دم دار ستارے کا نکلنا انتظام عالم کے لئے ضروری ہے گردش فلک مقتضی ہے کہ سورج گرہن اور چاند گرہن ضرور ہو کرے ویسے ہی اگر یہ بھی سمجھ لیں کہ انتظام عالم کا مقتضی ہے کہ معین وقت کے بعد مخلوقات کی اصلاح حال کے لئے ایک مقنن یا رفاہی رسول اللہ کے لقب سے وقتاً فوقتاً پیدا ہوتا ہے تو کیا استحالہ ہے اگر یہ کہا جائے کہ مدار ستارے آنکھ سے دکھائی دیتے ہیں اور اس لئے کوئی نہ کوئی وجہ دل سے پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی کو کیا غرض ہے کہ پیغمبروں کے وجود سے بحث کرتا پھرے۔ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ "بیشک غرض ہے" حالات دنیا پر رائے



قائم کرنا یہ سبھی ایک کام انسان کے تعلق کیا گیا ہے۔ جن ملکوں میں سیکڑوں قانون اور رعایا کی عام رائے شامل کرنے کے بعد قانون بنتے ہیں وہ ہر روز معرض ترمیم رہتے ہیں اور پھر بھی نقص و عیب سے پاک کبھی نہیں ہوتے۔ محمد امی محض تھا اور ایک ناتمہ بیت یافتہ قوم سے تھا لیکن اس کا قانون آج تیرہ سو برس گزرنے پر بھی ویسا ہی عمدہ اور کارآمد ہے جیسا شروع میں تھا جنگلیوں اور پہاڑیوں کے درست کرنے کے لئے وہ اتنا ہی کارآمد ہے جتنا کہ حکمائے وقت اور عقلائے زمانہ کو مہذب اور شائستہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ بغیر خاص نائیدربانی کے یہ کام محمد نے کیا اور خاص نائیدربانی ہی کا دوسرا نام رسالت یا نبوت ہے جو لوگ اس کو پورے طور سے سمجھتے ہیں وہ رسالت کے وجود کو دل کی آنکھ سے اسی طرح دیکھتے ہیں جس طرح مدار ستارے یا کسوف و خسوف کو چشم ظاہر سے ہم سب دیکھتے ہیں۔ آنکھ تو خطا بھی کرتی ہے و جہان خطا نہیں کرتا۔



## فصل نمبر ۴

### کارخانہ قدرت پر نصوص قرآنی

”لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے جو گزرے ہیں انکو پیدا کیا۔ عجیب نہیں کہ تم پر ہیز گار ہو جاؤ۔ اسی نے تمہارے لئے زمین کا بچھونا بنایا۔ آسمان کی چھت بنائی۔ اور آسمان سے پانی برسا کر تمہارے کھانے کے لئے پھل پیدا کئے۔ کسی کو اللہ کا ہم پلہ نہ بناؤ۔ تم خود جانتے ہو۔ سورہ بقرہ کو ع ۳۔“

”کیونکہ تم خدا کا انکار کر سکتے ہو تم بے جان کے تھے اور اس نے تم میں جان ڈالی۔ تمہیں وہ مارے گا اور زندہ کرے گا اور پھر اسی کے پاس تم واپس جاؤ گے اسی نے تمہارے لئے زمین کی کل کائنات پیدا کی ہے اور پھر آسمان کی طرف متوجہ ہو کر سات آسمان ہموار بنا دیئے ہیں وہ ہر چیز سے واقف ہے۔“ سورہ بقرہ کو ع ۳۔

”تمہارا معبود خدائے واحد ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ بڑا رحیم کرنے والا مہربان ہے۔“ سورہ بقرہ کو ع ۱۹۔

”بے شک آسمان و زمین کا پیدا کرنا۔ رات دن کا ادل بدل۔ جہازوں کا دریا میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر چلنا۔ مینہ کا آسمان سے برسانا اس سے مری ہوئی زمین کا پھر سے زندہ ہونا اور اس میں ہر قسم کے جانوروں کا پھیلانا۔ ہواؤں کا پھیرنا۔ بادلوں کا آسمان و زمین کے درمیان میں گھرارہنا ان سب میں دانش مندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ سورہ بقرہ کو ع ۲۰“



• پیغمبر تو کہہ - اے خدا ملک کے مالک جسے تو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے - جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے - خیر تیرے ہاتھ میں ہے اور تو ہر چیز پر قادر ہے - سورہ آل عمران رکوع ۴ -

• تو ہی رات کو دن میں شامل کرتا ہے اور تو ہی دن میں رات کو شامل کرتا ہے تو ہی بے جان سے جاندار پیدا کرتا ہے اور تو ہی جاندار سے بے جان نکالتا ہے اور جسے چاہتا ہے بے حساب رزی دیتا ہے - سورہ آل عمران رکوع ۳ -

• آسمان اور زمین کی بناوٹ اور رات اور دن کے رد و بدل میں ان عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں جو کھڑے ہوئے - بیٹھے ہوئے - لیٹے ہوئے خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت پر غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے پروردگار تو نے اسے بے فائدہ نہیں بنایا ہے - تیری ذات پاک ہے - ہم کو عذاب دوزخ سے محفوظ رکھنا - پروردگار تو نے جسکو دوزخ میں ڈالا اسکو خوار کیا - گنہگاروں کا کوئی بھی مددگار نہیں ہے - اے پروردگار ہم نے ایک منادی کرنے والے پیغمبر کو سنا کہ ایمان کی منادی کر رہا تھا اور لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ - تو میں ایمان لایا - پروردگار ہمارے گناہ معاف فرما - اور ہم سے ہمارے گناہ دور کر - اور نیک بندوں کے ساتھ ہمارا خاتمہ کر - سورہ آل عمران رکوع ۲۰ -

• ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا - کیا تم بتوں کو معبود مانتے ہو - میں تم کو اور تمہاری قوم کو صریح گمراہ پاتا ہوں - پھر ہم ابراہیم کو آسمان اور زمین کے استقامت دکھانے لگے تاکہ

لے الہم ملک الملک توتی الملک من تشار وتنزع الملک من تشار وتحر من تشار وتذل من تشار بیدک الخیر انک علی کل شیء قدیر -

لے تویح الیل فی النهار وتویح النهار فی الیل وتخرج الحی من المیت وتخرج المیت من الحی وترزق من تشار بغیر حساب -

لے ان فی خلق السموات والارض واختلاف الیل والنهار المیت لا ولی الا لیسب الذین یدکرون اللہ قیاماً ونحواً وعلیٰ جوہم ویفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت هذا باطلاً سنجد فقنا عذاب النار ربنا انک من تدخل النار فقد اخرجتہ وما للظلمین من النار ربنا اننا سمعنا منادياً ینادی للایمان ان امنوا برکم فامنوا - ربنا فاعف عننا وکفر عنا سبنا وکفرنا وکفرنا مع الابرار -



وہ یقین کرنے والوں میں ہو جائے۔ جب رات ہوئی تو ایک ستارہ نظر آیا۔ وہ کہنے لگا کہ یہ میرا پروردگار ہے۔ جب وہ غروب ہو گیا تو بولا غروب ہونے والی چیزوں کو میں پسند نہیں کرتا۔ پھر چاند کو جھکتا ہوا دیکھا تو کہنے لگا یہی پروردگار ہے۔ جب وہ بھی غروب ہو گیا تو وہ بولا میرا پروردگار مجھ کو راہ راست نہ دکھلائے گا تو بے شک میں گمراہ رہوں گا۔ پھر جب سورج جھکتا ہوا نظر آیا تو کہنے لگا کہ یہی میرا پروردگار ہے کہ یہ سب سے بڑا ہے۔ جب وہ بھی غروب ہو گیا تو بولا بھائیو! تم خدا کے ساتھ شرک کرتے ہو۔ میں اس سے بری ہوں۔ میں تو ایک کا ہو کر اپنا رخ اسی ذات پاک کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمان اور زمین کو بنایا۔ میں مشرکوں میں نہیں ہوں اس کی قوم جھگڑنے لگی۔ تو اس نے کہا تم مجھ سے خدا کے پاس سے جھگڑتے ہو وہ مجھ کو یہاں راستہ دکھا چکا ہے۔ میں ان بتوں سے نہیں ڈرتا جن کو تم اس کا شریک ٹھہراتے ہو۔ ہاں خدا مجھ کو بے شک نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس کا علم تمام چیزوں پر حاوی ہے۔ کہا تم نہیں سوچتے میں کیونکر اس چیز سے ڈروں جس کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ تم کو خوف نہیں معلوم ہوتا کہ تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے اور پھر تم دوسروں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ تم سوچو اگر تم کو علم ہے کہ ہم میں سے کون اطمینان سے رہے گا۔ جو لوگ خدا پر ایمان لائے ہیں، اور اپنے ایمان میں بے انصافی کی آمیزش نہیں کی ہے۔ یہی لوگ اطمینان سے رہیں گے اور یہی راہ راست پر ہیں۔ سورہ النعام رکوع ۹۔

۱۰۔ اسی نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر ہر قسم کے نباتات پیدا کئے۔ نباتات سے ہری ہری کوٹھیں پیدا کیں اور ان کو پلوں سے گتھے ہوئے دانے پیدا کئے۔ کھجور کے گاجے سے

۱۱۔ واذا قال ابراهيم لابيه اذرا اتخذنا آلهتنا اربك وقومك في ضل مبين ولذالك نرى ابراهيم ملكوت السموات والارض وليكون من الموقنين فلما جن عليه اليل راكوبا قال هذاري فلما اقل قال انا فلين۔ فلما را القمر بازغا قال هذاري فلما اقل قال لن لم يهدني وبي لا كوتن من القوم الضالين فلما را الشمس بازغة قال هذاري هذالك فلما اقلت قال بقوم اتى برى مما شركون انى وجهت وجهى للذى فطر السموات والارض حنيفا وانا من المشركين وعاجه قومه قال اتحاجونى فى الله وقد هديت ولا اخاف ما تشركون به الا ان يشار ربى شيا وسيع ربى كل شى علما افلا تتذكرون وكيف اخاف ما اشركتهم ولا تخافون انكم اشركتم بالله ما لم ينزل به عليكم سلطانا فامى الفرقين اصحى بالا من ان كنتم تعلمون۔ الذين آمنوا ولم يلبسوا ايمانهم بظلم اولئك هم الامن وهم مهتدون۔



گچھے جھکے پڑتے ہیں۔ انگور، زیتوں اور انار کے باغ صورت میں یکساں اور مزے میں مختلف۔ یہ جب پھلنے ہیں تو ان کے پھل اور پھلوں کا پکنا دیکھو۔ مومنوں کے لئے اس میں نشانیاں ہیں۔ سورہ العام رکوع ۱۲۔

تم لوگ خدا کے سوا نرے ناموں کی پرستش کرتے ہو جو تم نے اور تمہارے آباؤ گروہ رکھے ہیں۔ خدا نے ان کے معبود ہونے کی کوئی سند نہیں اتاری ہے۔ سورہ یوسف رکوع ۵۔  
 ساتوں آسمان اور زمین اور جتنی چیزیں ان میں ہیں۔ وہ سب خدا کی تسبیح کرتی ہیں کوئی شے ایسی نہیں جو اسکی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہیں کرتی۔ لیکن تمہاری سمجھ میں نہیں آتا۔ سورہ بنی اسرائیل رکوع ۵۔

تمہارا پروردگار وہ ہے جو تمہارے لئے سمندر میں جہازوں کو چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل یعنی معاشیں تلاش کرو۔ اسمیں شک نہیں کہ وہ تم پر بڑا مہربان ہے۔ سورہ بنی اسرائیل رکوع ۷۔  
 لوگو! اللہ ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا۔ تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے اس نے کان دیئے۔ آنکھیں دیں۔ دل دیئے کہ تم اس کا شکر کرو۔ کیا لوگ پرندوں پر نظر نہیں کرتے کہ آسمان کے میدان میں وہ گھرے ہوئے ہیں۔ انکو اڑتے وقت خدا ہی سنبھالتا ہے اس میں کتنی مومنوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ اللہ ہی نے تمہارے لئے گھروں کا ٹھکانا بنایا۔ جو پالیوں کی کھالوں سے تمہارے لئے خیمے بنائے کو حرج اور مقام کے وقت تم ان کو ہلکا پاتے ہو۔ جو پالیوں کی اون روؤں اور بالوں سے اس نے بہت سے سامان ایک وقت تک بکار آمد چیزیں بنائی ہیں اللہ ہی نے تمہارے لئے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کے سایہ بنائے پہاڑوں میں تمہارے چھپ بیٹھنے کے لئے جگہیں بنائی ہیں۔ تمہارے لئے کرتے بنائے جو تم کو گرمی سے بچائیں اور زمیں

لہ وہو الذی انزل من السماء ماء فاخرجنا به نبات کل شیء فاخرجنا منه خبثا نخرج منه جاثرا کبیرا۔ ومن النخل من ظللها قنونا وانیت وجنت من اعناب والزیتون والرمان مشبہا وغیر متشابہ انظر والی ثمره اذا اثمر ونبیہ ان فی ذلکم لآیت لقوم یؤمنون۔

۱۔ ما تعبہون من ونبہ الا اسماء سمینواہا انتم وآبارکم ما انزل اللہ بہا من سلطن۔  
 ۲۔ تسبیح لہ السموات السبع والارض ومن فیہن وان من شیء الا بسبح بحمدہ ولکن لافہقہون تسبیحہ۔  
 ۳۔ ربکم الذی نزل فی البحر لتغوا من فضلہ انہ کان بکم رھیما۔



بنائیں جو آپس کی زد سے تمہیں بچائیں۔ یوں وہ اپنی نعمتیں تم پر پوری کرتا ہے کہ تم اس کے آگے جھکو۔ سورہ النحل رکوع گیارہ۔

لوگو! اگر تم کو پھر جی اٹھنے میں شبہ ہے تو یوں سمجھو کہ ہم نے تم کو یوں پیدا کیا ہے۔ کہ پہلے مٹی پھر لطفہ۔ پھر خون کا لو تھڑا۔ پھر پوری اور ادھوری بوٹی۔ تاکہ ہم تم پر اپنی قدرت ظاہر کریں۔ عورتوں کے پیٹ میں ایک وقت مقرر تک اپنی مرضی کے مطابق ہم لطفہ قائم رکھتے ہیں پھر تم کو بچہ بنا کر نکالتے ہیں۔ پھر تم کو بڑا کرتے ہیں۔ پھر تم میں سے کوئی مرجاتا ہے اور کوئی اخیر عمر تک پہنچتا ہے تاکہ اب تو کچھ سمجھے۔ تو زمین کو دیکھتا ہے کہ بے حس و حرکت پڑی ہے جب ہم پانی برساتے ہیں تو لہا ہاتی ہے اور ابھرتی ہے اور ہر طرح کی خوشنما روئیدگی اگاتی ہے۔ سورہ الحج رکوع ۱۔

ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا پھر اسکو حفاظت سے لطفہ بنا کر رکھا۔ پھر لطفہ کو لو تھڑا بنایا۔ پھر لو تھڑے کی بندھی بوٹی بنائی۔ پھر بندھی بوٹی کی ہڈیاں بنائیں ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر ایک دوسری صورت میں اسے مخلوق کیا۔ خدا بڑا ہی بابرکت ہے جو تمام بنانے والوں میں بہتر بنانے والا ہے۔ اس کے بعد تم سب کو مرنا ہے پھر قیامت کے دن تم اٹھا کر کھڑے کئے جاؤ گے۔ ہم نے تمہارے اوپر سات آسمان بنائے ہیں اور پیدا کرنے کے ہنر میں ہم انارڈی نہیں تھے۔ ہم ایک اندانے کے ساتھ آسمان سے پانی برساتے ہیں۔ پھر اسکو

لہ والذہاخر حکم من بطون اہمتکم لا تعلمون شئاً وجعل لکم السمع والابصار وانا منہ لعلکم تشکرون۔ الم یروا الی الطیر مسخرات فی جو السماء ما یمسکن الا اللہ ان فی ذلک لآیت لقوم یؤمنون واللہ جعل لکم من یونکم سکناً وجعل لکم من جلود الانعام بیوتاً تستخفون بہا یوم تلحکم ویوم اقامتکم ومن اصوافہا وادبارہا واشعارہا اثباتاً ومتاعاً الی حین واللہ جعل لکم مما خلق تلالاً وجعل لکم من الجبال اکتاناً وجعل لکم سربیل تقیم الحرد سربیل تقیم باسکم کذلک تیم نعمت علیکم لعلکم تسمون۔

تد یا ہا الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقکم من تراب ثم من لطفہ ثم من علقہ ثم من مضغہ مخلقہ بغير مخلقہ لبین لکم ونقر فی الارحام ما نشار الی اہل مسمی ثم نخر حکم طفلاً ثم لتبلغوا اشدکم و منکم من یتوفی و منکم من یر والی ارزل العمر لکیلا یعلم من بعد علم شئاً وترى الارض ہامدة فاذا انزلنا علیہا الماء اهتزت وربت وانبتت من کل زوج بیج۔



زمین پر پھراتے ہیں اور اس پانی کے اڑاے جانے کی بھی قدرت رکھتے ہیں۔ اس پانی سے ہم نے تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کے باغ بنائے ہیں۔ تمہارے لئے میوے پیدا ہوتے ہیں اور تم کھاتے ہو ہم نے طور سینا میں زیتون کے درخت بکثرت پیدا کئے ہیں۔ کھانے والوں کے لئے اس میں دہنیت اور ذائقہ ہوتا ہے۔ چار پاؤں میں بھی عبرت کا مقام ہے کہ جو کچھ ان کے پیٹوں میں بھرا ہے اسی میں سے ہم تم کو دو دو پلاتے ہیں اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ تم ان کو کھاتے ہو اور ان پر اور کشتیوں پر چڑھے پھرتے ہو۔ سورہ المؤمنون رکوع ۱۔ اللہ کے نور سے آسمان و زمین میں روشنی ہے۔ اس کے نور کو یوں سمجھو کہ ایک طاق ہے اور طاق میں ایک چراغ ہے اور چراغ ایک شیشہ کی قندیل میں ہے اور قندیل گویا موتی کی طرح چمکتا ہوا ایک ستارہ ہے اور زیتون کے ایک مبارک درخت کے تیل سے وہ روشن کیا جاتا ہے۔ نہ پورب ہے اور نہ پچم ہے آگ نہ ہو جب بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی آپ جل اٹھے گا گویا نور علی نور ہے۔ اللہ اپنے نور سے جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ لوگوں کے سمجھانے کے لئے وہ مثالیں بیان کرتا ہے اور ہر چیز سے واقف ہے۔ سورہ نور رکوع ۵۔

تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ بادل کو ہانکتا ہے۔ پھر اس کے ٹکڑوں کو آپس میں جوڑتا ہے اور پھر ان کو تہ بہ تہ رکھتا ہے۔ کیا تو نے بادل کے بیچ سے مینھ نکلتے نہیں دیکھا ہے آسمان میں اولوں کے پہاڑ یعنی جھے ہوئے بادل ہیں وہی ان میں سے اولے برساتا ہے چہر چاہتا ہے

لہ ولقد خلقنا الانسان من سلتہ من طین۔ غم جعلنا نطفۃ فی قرار مبین۔ ثم خلقنا النطفۃ علقۃ فخلقنا العلقۃ مضغۃ فخلقنا المضغۃ عظاما نکسونا العظم لحما ثم انشأنا خلقا اخر فلتبرک اللہ احسن الخالقین ثم انکم بعد ذلک لمیتون۔ ثم انکم یوم القيمة تبعثون ولقد خلقنا نوحکم سبع طرائق و ما کنتم من الخلق غفلین۔ وانزلنا من اسماء ما رزقکم فی الارض وانا علی ذباب لقدرون فالنسا انکم بہ جنۃ من نخیل و اعناب لکم فیہا فواکہ کثیرۃ و منہا تاکون و شجرہ ستخرج من طور سینا تثبت بالہدن و صبع للاکلین وان لکم فی الانعام لعیبرۃ لعلکم مما فی بطونہا و لکم فیہا منافع کثیرۃ و منہا تاکون و علیہا و علی الفلک تحملون۔

اللہ نور السموات والارض مثل نورہ مشکوۃ فیہا مصباح المصباح فی زجاہۃ کابنا کوکب دری یوقد من شجرۃ مبرکۃ زینونۃ لاشرقیتا ولا غربتہ یکاد زیتہا یغنی و لو تم تمس نار نور علی نور یدی اللہ نورہ من یثار ویضرب اللہ الامثال للناس واللہ بکل شیء علیم۔



برساتا ہے اور جس پر چاہتا ہے نہیں برساتا۔ بادل میں بجلی کی چمک ایسی ہے گویا آنکھوں کو چکا چوند ہو جاتا ہے۔ اللہ رات اور دن کا ردوبدل کرتا ہے۔ ارباب بعیرت کے لئے اسمیں عبرت ہے اللہ نے تمام جاندار پانی سے پیدا کئے۔ کوئی پیٹ کے بل چلتا ہے اور کوئی دو پاؤں سے چلتا ہے بعض پانچ پاؤں سے چلتے ہیں۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتے ہیں۔ ہر چیز پر اسکو قدرت ہے۔

سورہ نور رکوع ۶۔

خدا کی ذات بڑی بابرکت ذات ہے جس نے اپنے بندے محمد پر قرآن اتارتا کہ تمام جہاں کے لوگوں کو ڈرانے والا ہو۔ وہی تو ہے جس کو آسمان وزمین کی سلطنت ہے۔ نہ اس کے کوئی قرزند ہے اور نہ سلطنت میں اس کا کوئی شریک رہا۔ اسی نے ہر چیز پیدا کی اور ہر ایک کے لئے ایک اندازہ ٹھہرا دیا۔ کفار نے اس کے سوا دوسرے معبود اختیار کر رکھے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے۔ بلکہ خود پیدا کئے گئے ہیں اور نہ وہ خود اپنے برے بچلے پر قادر ہیں اور نہ مرنا اور جینا اور نہ پھر اٹھنا ان کے اختیار میں ہے۔ سورہ فرقان رکوع ۱۔

کہتے جا نور ہیں جو اپنی روزی لادے ہوئے نہیں پھرتے اللہ ہی ان کو روزی پہنچاتا ہے۔ اور وہی تم کو بھی روزی پہنچاتا ہے۔ وہ سب کی سنتا ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ عنکبوت رکوع ۶۔

اللہ مثلاً بیان کرتا ہے کہ ایک شخص غلام ہے۔ جس میں کئی سا بھی ہیں جو آپس میں بڑی کشمکش رکھتے ہیں اور ایک وہ غلام ہے جو تنہا ایک کی ملک ہے۔ کیا ان دونوں غلاموں کی حالت ایک ہو سکتی ہے۔ جواب میں کہا جائے گا کہ نہیں۔ پیغمبر تم سن کر کہو الحمد للہ مگر افسوس

لقد ألم تر ان اللہ یزجی سحاباً ثم یبسط یشم یجعله ركاماً فترى الورد یخرج من غلله ونیزل من السماء من جبال فیها من بروفیصیب بہ من یشار ویصرفہ عن من یشار یکاد سابرقة یدہب بالایصار لقلب اللہ الیل والنہار ان فی ذلک لعبرة لا ولی الا لہما واللہ خلق کل وایتہ من ما رغبتہم من میثی علی رحلین ومنہم من میثی علی اربع یخلق اللہ ما یشاء ان اللہ علی کل شیء قدیر۔

تہ تبرک الذی نزل الفرقان علی عبده لیکون للعلین نذیر الذی له ملک السموات والارض ولم تجد ولا ولم یکن لہ شریک فی الملک وخلق کل شیء فقدرہ تقدراً اتخذ دا من دونہ الصفة لا یخلقون شیئاً ولم یخلقون ولا یملکون لانفسہم مزا ولا انما ولا یملکون موتاً ولا جعدہ ولا نشوراً۔

تہ وکاین من وایتہ لا تحمل رزقہا اللہ یرزقہا وایاکم وهو السميع العليم۔



ہے کہ ان میں سے اکثر اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ سورہ الزمرہ کو ع ۳۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص ایک خدا کو مانتا ہے وہ اس غلام کی طرح ہے جس کا ایک مالک ہوتا ہے خوشی سے زندگی بسر کرتا ہے اور جو شخص سیکڑوں قوتوں کو خدا کا شریک مانتا ہے وہ اس غلام کی طرح ہے جو کئی ایک کے زیر حکومت رہ کر ہمیشہ پریشان رہتا ہے۔



## فصل نمبر ۴

### حکمت و فلسفہ کے متعلق آیات قرآنی

دنیا میں دو قسم کے اسباب ہیں ایک ظاہر اور ایک پوشیدہ۔ جیسا کہ حقیقت اسلام و فصل ۴۶ میں بیان کیا گیا ہے۔ اسباب ظاہر کا سمجھنا انسان کی قوت مدد کہ پر موقوف ہے جتنا ہی غور کرے گا اتنا ہی اچھی طرح وہ ان کو سمجھ سکے گا لیکن اسباب مخفیہ کو سمجھنا عبث ہے کیونکہ وہ صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکتے۔ محض قیاسات سے لوگ کام لیتے ہیں۔ اور قیاس کرنے والے خود ہی حد درجہ یقین نہیں رکھتے۔ مثلاً اختلاف لیل و نہار کے اسباب کو خدا نے پوشیدہ رکھا ہے ہزاروں برس تک عقلائے زمانہ یہ سمجھتے رہے کہ آفتاب زمین کے گرد گھومتا ہے اور اب سیکڑوں برس سے یہ خیال ہے کہ زمین گھومتی ہے آفتاب ساکن ہے۔ اتنا تو لوگ سمجھے کہ زمین آفتاب سے روشنی حاصل کرتی ہے اور یہ بھی سمجھے کہ ماہتاب بھی آفتاب کی وجہ سے روشن دکھائی دیتا ہے لیکن یہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ آفتاب کیوں روشن ہے اور ممکن ہے کہ کل یہ رائے قائم ہو کہ چاند میں جو روشنی آتی ہے وہ سورج کی فیاضی کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا سبب کچھ اور ہے۔ غرض کہ اسباب مخفیہ پر سوال کرنا انسانی طبیعت کا مقتضا ہے اور اس پر کچھ نہ کچھ رائے قائم کر لینا اس کا خاصہ ہے اور یہ بھی اس کا خاصہ ہے کہ جب تک اس کی رائے میں تبدیلی نہیں ہوتی وہ اپنی رائے کو یقین کے درجے تک سمجھتا ہے۔

پیغمبر خدا ضرور اپنے وقت کے حکیم تھے اور ہمارا تو یہ عقیدہ ہے کہ ان سے زیادہ عقل



والا آج تک کوئی دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ لوگ ان اسباب مخفیہ کی بابت پیغمبر خدا سے سوالات کیا کرتے تھے اور آنحضرت اس کے جواب میں اختصار کو کام میں لاتے تھے اس اختصار کے دو وجوہ تھے اول یہ کہ آنحضرت کو تمدن اور معاشرت کی اصلاح منظور تھی وہ لا طائل باتوں کی طرف توجہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ آنحضرت جانتے تھے کہ جب تک انسان اس عالم ناسوتی میں ہے وہ عالم ملکوتی کی باتیں نہیں سمجھ سکتا۔ اپنے خیال کے مطابق وہ ہمیشہ نئے طور پر غور کرتا رہتا ہے اور اس کے متعلق نئی باتیں پیدا کرتا ہے لیکن حقیقت تک نہ وہ پہنچتا اور نہ پہنچ سکتا ہے۔ پیغمبر خدا کے منہ سے کسی بات کا نکلنا مذہب کو ہا زہیچہ طفلان بنا دیتا۔ یہ بھی واضح رہے کہ جن باتوں کے بیان کرنے سے قرآن میں اٹھائیں کیا گیا آج تک کسی شخص نے اس کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں کہی جو ہر زمانے کے عقلا کی تشفی کا سبب ہو۔ پیغمبر خدا سے لوگوں نے چاند کی حقیقت اور اس کا گھٹنا بڑھنا پوچھا۔ اور ایک طور پر گویا تمام علم ہیئت کا سبق پڑھنا چاہا۔ پیغمبر خدا اگر علم ہیئت قدیمہ کے مطابق اس کیلئے اظہارِ قابلیت کرنا چاہتے تو اس زمانے میں انکی رائے باطل سمجھی جاتی اور اگر علم جدید کے مطابق ارشاد فرماتے تو اس وقت کے علماء ایمان نہ لاتے۔ اس لئے پیغمبر نے کہا۔ تمہیں ان جھگڑوں سے کیا مطلب۔ اتنا سمجھ لو کہ یہ معاملات اور عبادات کے لئے وقت بنایا گیا ہے سورہ بقرہ کے رکوع ۲۲ میں ہے۔

”پیغمبر لوگ تم سے چاند کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ تم کہدو کہ چاند سے لوگوں کے معاملات اور عبادات مثلاً حج کے اوقات معلوم ہوتے ہیں۔“ حکمت کی کئی قسمیں ہیں۔ حسن تمدن اور حسن معاشرت بھی ایک حکمت ہے عقل سلیم اور رائے صائب سے بڑی حکمت ہے۔

سورہ بقرہ کے رکوع ۲ میں خدا فرماتا ہے۔

”خدا جس کو چاہتا ہے حکمت رہات کی سمجھ (عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت یعنی بات کی سمجھ دی گئی اس نے بڑی ہی دولت پائی۔“

لے لیونک عن الابلتہ قل ہی مواقبت للناس والرج۔

کہ یوتی الحکمت من یشار ومن یوت الحکمت فقد اوتی خیراً کثیراً۔



دنیا ایک لفظ ہے جس کا ہم معنی لفظ مختلف زبانوں میں ہے اور زبان زدِ خلاق ہے۔ لیکن کہیں اسکی ٹھیک تعریف نہیں پائی جاتی۔

ہندوؤں میں اس کو 'مایا' یا 'مایا روپی' سے تعبیر کیا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے اچھا لفظ مل نہیں سکتا۔ لیکن ہمارے نزدیک قرآن میں جو لفظ اس کے لئے آیا ہے وہ اس سے بھی اچھا ہے۔

سورہ آل عمران رکوع ۱۹ میں ہے:-

'دنیا کی زندگی صرف دھوکے کی پونجی ہے'۔ دھوکے کی پونجی مطاع غرور کا ترجمہ ہے۔ لیکن مطاع غرور میں جو لطف ہے وہ ترجمہ میں ادا نہیں ہوا۔ جس طرح 'مایا روپی' کا لفظ ہندی زبان کے اعتبار سے بہت اچھا سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح عربی زبان کے اعتبار سے 'مطاع غرور' کا لفظ نہایت ہی مناسب ہے اور اس میں بے ثباتی دنیا کا جو مفہوم ادا ہوتا ہے وہ 'مایا روپی' میں ادا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ قرآن میں جو لفظ مطاع غرور کا دنیا کے لئے استعمال کیا گیا ہے وہ بالکل انوکھا ہے انگریزی میں ایک لفظ ورلڈ فالی WORLD FALLY ہے۔ قرآن میں 'مطاع غرور' ہے وہ 'مایا روپی' یا 'ورلڈ فالی دونوں پر حاوی ہے۔

اس کے قریب قریب سورہ توبہ رکوع ۴۴ میں نصیحت کے پیرائے میں مذکور ہے۔

'کیا تم آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی پر قناعت کر کے بیٹھے ہو۔ دنیا

کی زندگی کے فائدے آخرت کے مقابلہ میں محض بے حقیقت ہیں'

قوم کا عروج اور زوال بھی دنیا کا ایک تماشا ہے۔ جب دن اچھے آتے ہیں تو

غیب سے سامان ہو جاتا ہے اور جب زوال آتا ہے تو پھر کسی طرح کسی کے روکے نہیں

رکتا۔ خدا تو ہر قوم کا پیدا کرنے والا ہے وہ ہر قوم کو باری باری سے گھٹاتا ہے۔

لے وما الحیوة الدنیا الا متاع العرور۔

لے ارضیتکم بالیحیوة الدنیا من الآخرة فمتاع الحیوة الدنیا فی الآخرة الا قلیل۔



”تمام قوموں کے لئے مننے کا ایک وقت ہے۔ جب وہ وقت آ گیا تو پھر نہ وہ ایک ساعت پیچھے رہ سکتی ہے اور نہ ایک ساعت آگے بڑھ سکتی ہے۔“

اسلام نے یہ تعلیم کی کہ اچھے اعمال کی جزا اچھی ملے گی اور برے اعمال کی جزا بری ملے گی اب سوال یہ ہوا کہ یہ جزا بعد مرنے کے کیوں فکر ملے گی۔ اس کا جواب صاف یہ ہے کہ روح کو جزائے اعمال پہنچانا ہوگی جو لوگ کہ ذی فہم ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ روح جس عالم غیر مادی میں ہوگی اسی کے موافق غیر مادی جزا اور سزا بھی ہوگی۔ لیکن سب تو حکمت و فلسفہ پڑھے ہوئے نہیں ہیں اس لئے مضمون کو عام فہم کرنے کیلئے لسان تمثیلی کی ضرورت ہوئی۔ لوگ اس پر استعجاب کرنے لگے تو یہ آیت اتری۔

لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم گل سڑ کر ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو ہم از سر نو پیدا کئے جائیں گے اور اٹھائے جائیں گے۔ پیغمبر تو ان سے کہو۔ تم پتھر لوہا یا اپنے خیال کے مطابق اور بڑی چیز بن جاؤ گے جب بھی زندہ کئے جاؤ گے۔ اس پر لوگ پوچھیں گے کہ کون ہم کو زندہ کرے گا تو کہنا وہی جس نے اول بار تم کو پیدا کیا تھا۔ اس پر یہ لوگ تمہارے آگے سر جھکانے لگیں گے اور پوچھیں گے کہ کیا ایسا ہی ہوگا تو کہنا عجب نہیں کہ قریب ہی ایسا ہو۔ سورہ بنی اسرائیل رکوع ۵۔

دنیا میں سب سے بڑا اہم مسئلہ روح کا ہے۔ اس کے متعلق بیسیوں اقوال ہیں اور ہر ایک دوسرے سے الگ ہر مذہب اور ہر فرقے اور ہر ملک میں کچھ نہ کچھ رائیں اس کے متعلق ضرور ظاہر کی گئی ہیں۔ لیکن سب اپنی رایوں کی نسبت ہی کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ اس کے خلاف ہو کوئی شخص اگر وہ مقلد نہیں ہے محض رائے زن ہے کسی طرح اپنی رائے پر یقین نہیں رکھتا اور حقیقی یہ ہے کہ اس عالم میں جب تک ہم ہیں کسی طرح یہ نہیں سمجھ سکتے کہ روح کیا چیز ہے۔ اور کیونکر بنی۔ کہاں تھی۔ کہاں نہ ہتی ہے۔ کہاں سے اور کیونکر آئی۔ کیوں آئی۔ کہاں گئی۔ کیسے گئی اور اگر وہ کوئی چیز نہیں ہے تو یہ کیا کہ اس کی وجہ سے سب کچھ تھا اور اس کے جانے سے سب کچھ جاتا رہا۔ یہی سوال پیغمبر خدا سے کیا گیا۔ جواب اتنا عمدہ ملا کہ ایسا جواب اس عالم ناسوتی میں ہو نہیں سکتا۔ سورہ بنی اسرائیل رکوع ۱۷۔

یہ ہے پیغمبر تم سے روح کی حقیقت دریافت کرتے ہیں تو کہو روح میرے پروردگار کا ایک حکم ہے اور تم کو تھوڑا ہی علم دیا گیا ہے۔ یعنی تمہاری معلومات ایسی نہیں ہیں کہ تم سے روح کی حقیقت

لے وقالوا اذا كنا عظاما ورفاتا انا لمبعوثون خلقا جديدا قل كذوالاحرارۃ احدثوا خلقا سوا يكبر في صدوركم فيقولون من ليدنا قل الذي نظرتم اول مرة فينصنصنون اليك رؤسهم وليقولون مني هو قل عسى ان يكون قريبا۔

لے وليولئك من الروح قل الروح من امر ربي وما اوتيتم من العلم الا قليلا۔



بیان کی جائے اور تم سمجھ سکو۔

افلاطون اس جزا و سزا کی نسبت لکھتا ہے کہ روح نے اگر اچھے اعمال کئے ہیں تو اسے مرنے پر خوشی ہوگی اور اگر برے اعمال کئے ہیں تو افسوس اور رنج ہوگا۔ اگر یہی خوشی اور رنج فلاسفہ کے سمجھانے کے لئے جنت اور دوزخ سے تعبیر کیا جائے تو ایمان میں فرق نہیں آتا بشرطیکہ خوشی تمام نعمائے دنیا سے بڑھ کر ہو اور رنج اس تکلیف سے بڑھ کر مانا جائے جو دنیا میں آگ سے جل کر محسوس ہوتی ہے۔

دنیا میں غیب کا علم کسی کو نہیں ہو سکتا۔ اور آیا تو قیاس ہو کہ پانی برسے گا۔ ذرا اور معلومات بڑھیں تو تار کے ذریعہ سے معلوم ہو کہ خلیج بنگالہ سے ابر باراں چل چکے ہیں۔ قیاس سے کہا گیا کہ آسمان دس روزہ میں ممالک مغربی و شمالی میں بھی بارش ہوگی۔ تب دق درجہ سوم پر پہنچ گئی تو طبیب نے کہا کہ اب مریض نہ بچے گا۔ ان تمام قیاسات میں غیب کا علم نہیں ہے اور جو قطعی طور پر حکم لگاتے ہیں کہ خواہ مخواہ فلاں بات فلاں دن ہوگی اور خود کو گویا عالم الغیب کہتے ہیں وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ رمل۔ جفر۔ علم نجوم۔ علم قیامت تمام علم کوئی قطعی حکم نہیں دے سکتے یہ وسائل اور ذرائع ہیں قیاسات قائم کرنے کے۔ لیکن قیامت تجربہ سے ہر حالت میں صحیح نہیں پائے جاتے۔ اسلام نے ان باتوں پر پورا یقین کرنا منع کر دیا ہے کیونکہ انسان کو اس طرح دھوکہ ہوتا ہے۔ اس نے اس طرح کے علوم سیکھنے کو بیکار دے سود ٹھہرایا ہے اور اس پر یقین کرنے کو معصیت قرار دیا ہے۔ یعنی یوں کہنا کہ خواہ مخواہ یوں ہی ہوگا کہ منجم نے ایسا ہی بتایا ہے داخل کفر ہے اور یہ خیال کرنا کہ منجم نے یوں کہا ہے ممکن ہے ایسا ہی ہو بے عقلی ہے عرب میں غیب کی خبر دینے والے کاہن کے نام سے مشہور تھے جیسا کہ یہاں رذیل قوموں میں سوکھے دغیب کی باتیں کرنے والے دغیب داں کہلاتے ہیں وہ اپنی قوت نفس سے کچھ باتیں بتایا کرتے تھے اور ان میں کچھ باتیں صحیح ہوتی تھیں اور کچھ باتیں غلط ہوتی تھیں ان اوہام باطلہ سے انسان کو نجات دلانے کے لئے سورہ لقن رکوع ۴ میں محکوم ہوا۔

بے شک اللہ ہی کو قیامت کا علم ہے۔ وہی مینہ برساتا ہے۔ وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹ میں کیا ہے۔ کوئی دوسرا نہیں جانتا کہ وہ خود کس زمین میں مرے گا۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ خود کھل کب کھے گا۔ ان سب باتوں کا علم اور خبر اللہ ہی کو ہے۔

انسان جس طرح بتدریج بڑھتا ہے اسی طرح وہ بتدریج گھٹتا ہے اگر کوئی شخص عمر طبعی تک پہنچ کر گھل گھل کر مرے تو اسکی کیفیت مثل نوزائیدہ بچے کے ہو جائیگی بڑیاں تو چھوٹی نہ ہوں گی مگر

لے ان اللہ عنده علم الساعة ونیزل الغیاث و علم ما فی الارحام و ماتدری نفس ما ذاتکب غدا و ماتدری نفس باسی ارض ثموت ان اللہ علیم خیر۔



تخلہ ہاتھیں بچوں کی سی ہو جائیں گی۔ دانت گر جائیں گے سوائے کراہنے کے اور کوئی بات منہ سے نہ نکلے گی۔ بال کم ہو جائیں گے۔ سولے دودھ کے دوسری غذا ہضم نہ ہوگی اور نہ بغیر دوسرے کے سہارے کے وہ کمرٹ بدل سکے گا۔ یہی حالت سورہ یسین کے رکوع پنجم میں ہے۔

• جسکی عمر ہم زیادہ کرتے ہیں اسے بناوٹ میں الٹا گھٹاتے جاتے ہیں۔

پہلے تو کفار عرب سوا کھانے پینے اور سونے کے کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ مار پیٹ لڑائی جھگڑے سے کام تھا وہ کسی سے ڈرتے نہ تھے اگر ڈرتے تھے تو صرف بتوں سے لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ کیوں۔ اسلام نے ان کو بتایا کہ بتوں کے اختیارات کچھ بھی نہیں ہیں یہ ادنیٰ قسم کی مخلوق جمادات سے ہیں۔ اعلیٰ مخلوق عالم یعنی نوع انسانی سے بھی بڑھ کر ذات باری تعالیٰ ہے جس نے انسان کو اور دوسری تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے۔ اس کے بعد جو عربوں کی آنکھیں کھلیں تو دلوں میں سوالات بھی پیدا ہوئے اور سوالات ایسے کہ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے آج تک کسی عالم نے قابل تشریح جواب نہ دیا اور کوئی جواب دے بھی نہیں سکتا۔ اور نہ مخاطب کو سمجھا سکتا ہے جب تک مشکل اور مخاطب دونوں علم ناسوتی سے الگ نہ ہو جائیں یا انکی ارواح میں اتنی صفائی نہ آجائے کہ اس عالم میں رہ کر دوسرے عالم کی باتیں سمجھ سکیں تب تک اس قسم کے مسائل کے مبادیات پر گفتگو بھی عبث ہے۔ قرآن میں اس کا جواب دیا گیا ہے لیکن نہایت ہی مختصر اور اتنا اچھا کہ اس سے اچھا جواب ہو نہیں سکتا۔ سورہ مومن میں ساتویں رکوع میں ہے۔

• وہی جلات ہے وہی مارتا ہے۔ جب وہ کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو۔ اور وہ ہو جاتا ہے۔

”کہتا ہے“ کے معنی ارادہ کرتا ہے۔ سمجھو تو مطلب صاف ہے۔

خلقت زمین و آسمان کے متعلق سورہ حم کے رکوع ۲ میں ہے۔

• پیغمبر! لوگوں سے تم کہو۔ کیا تم اس (اللہ) سے انکار کرتے ہو۔ جس نے دُور دن میں زمین پیدا

کی اور اس کا ہمسر تم دوسرے کو ٹھہراتے ہو۔ وہی سارے جہان کا پروردگار ہے اور اسی نے زمین

میں ادھر سے پہاڑ گاڑ دیئے ہیں اور اس میں برکت دی ہے اور اسی میں ایک اندازہ مناسب کے

لے ومن لہمہ تنکسہ فی الخلق۔

لہ ہوالذمی یچی ویبیت فادقطنی امرافانما یقول لکن فیکون۔



ساتھ اس کے باشندوں کے کھانے پینے کا بندوبست کر دیا ہے۔ سب کچھ چاروں میں سب مانگنے والوں کے لئے برابر۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت کھڑکی طرح کا تھا تو اس کھڑکی کو اوپر زمین کو حکم دیا کہ تم خوشی سے آؤ تو آؤ اور ذرا زبردستی آؤ تو آؤ۔ دونوں نے عرض کیا کہ ہم خوشی سے حاضر ہیں۔ اس کے بعد دونوں میں اس نے اس کھڑکی کے ساتھ آسمان بنائے اور ہر ایک آسمان میں انتظام کر دیا نیچے کے آسمان کو ہم نے قندیلوں سے سجایا اور حفاظت کے لئے بھی ایسا کیا۔ یہ اندازے اس کے باندھے ہوئے ہیں جو زبردست اور دانا ہے۔“

یہ آیت ہدایت افلاک ظاہر کرنے کے لئے نہیں اتری ہے بلکہ خدا اپنی آفرینش یاد دلا کر کہتا ہے کہ جس طرح ہم نے یہ سب کچھ بنایا اسی طرح نافرمانوں کو ہم تباہ بھی کرتے ہیں اس کے بعد آیت یوں ہے۔

• اگر اس پر بھی کفار سرتابی کریں تو ان سے کہہ دو کہ جیسی کڑک عمارتوں پر ہوتی تھی اسی طرح کی کڑک سے میں تم کو بھی ڈراتا ہوں۔“

جب مقصود سمجھانا تھا تو مناسب یہی تھا کہ مخاطب کی سمجھ کے مطابق گفتگو کی جاتی اور اسی لئے خلقت ارض و سما کے متعلق یہودیوں میں جو باتیں مشہور تھیں وہی تحریر کی گئیں۔ لیکن یہ بھی واضح رہے کہ یہ تحریر فلسفہ قدیم یا فلسفہ جدید کے مخالف نہیں ہے۔ مفعول بیان اس کا ”آفرینش ارض و سما“ فصل ۵۰ میں دیکھو۔

رزق کوشش پر رکھا گیا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ باوجود کوشش کے رزق حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ رزق کسی قوم سے ناپید ہو جائے۔ رزق اگر موشیوں کی طرح انسان کو ملتا ہے یعنی نباتات ارض سے انسانی خوراک بھی مہیا ہو جاتی تو انتظام عالم جہاں تک نوع انسانی سے تعلق ہے قائم نہ رہتا اسی مضمون کو خدا سورہ شوریٰ رکوع ۳ میں سمجھاتا ہے۔

لے قل انکم لتکفر وبالذمی خلق الارض فی یومین وتجعلون لہ انداد اذ الک رب العالمین وجعل فیہا ردا سی من قوتہا وبرک فیہا و قدر فیہا قوتہا فی اربعۃ ایام سواہر للساہلین ثم استواء الی السما و وہی دخان فقال لہا وللارض انقیاطو عاوا کر ہا قاتا اتینا طالعین فقضین سبع سموات فی یومین وادعی فی کل سماء امرہاہ زینا السماء الدنیا بمصابیح وحفظا ذالک تقدیر العزیز العظیم۔

لے فان اعرضوا نقل انذرتکم صعقۃ مثل صعقۃ عاد وثمود۔



اگر خدا اپنے بندوں کی روزی فراخ کر دے تو وہ ضرور ملک میں سرکشی کرنے لگیں۔ مگر خدا اپنے

بندوں سے خبردار ہے اور ان کانگراں ہے۔ جتنی روزی چاہتا ہے بقدر مناسب دیتا ہے۔“

قرآن میں آنحضرتؐ کا معجزہ ایک بھی نہیں لکھا گیا ہے۔ بلکہ بار بار یہ لکھا گیا ہے کہ لوگ پیغمبرؐ سے یہ فرمائش کرتے تھے کہ کوئی بات خرق عادت کی دکھاؤ تو ہم تم کو سچا سمجھیں۔ اور پیغمبرؐ کہتے تھے کہ اور پیغمبروں کی امت نے معجزہ کا کیا اعتد کیا تھا کہ میں تم کو دکھاؤں لیکن کتب سیرت و حدیث میں چند باتیں ضرور از قسم خرق عادات آنحضرتؐ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں جن میں واقع شق القمر بھی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ لوگوں نے آنحضرتؐ سے اصرار کیا کہ چاند کو دو ٹکڑے کر دو تو تم تم کو سچا پیغمبرؐ سمجھیں۔ آنحضرتؐ نے جناب باری میں دعا کی اور چاند دو ٹکڑے نظر آیا۔ بعض کہتے ہیں کہ نہ پیغمبرؐ میں چاند کو دو ٹکڑے کرنے کی طاقت تھی اور نہ خدا کو چاند کے تقسیم کرنے کی ضرورت تھی۔ خدا کو اتنا ہی اہتمام کرنا تھا تو بجائے قمر و نیم کرنے وہ کفار کا دل ہی نہ پھیر دیتا۔ خدا کو اسلام کا اسباب دنیا کے ساتھ جاری کرنا مقصود تھا۔ اسباب دنیا سے قطع کر کے اسلام کا جاری کرنا اس کو مقصود ہوتا تو تاریخی حالات اسلام کے وہ نہ ہوتے جو ہوئے۔ لیکن معجزہ شق القمر صحیح ہو تو اس میں کوئی استحالہ نہیں ہے۔ جب پیغمبرؐ کو لوگوں نے بہت مجبور کیا تو انہوں نے اپنی قوت نفس کا اثر جو بلحاظ شان پیغمبری سب سے اعلیٰ درجہ پر آنحضرتؐ میں بھی تھا ان کفار پر بھی ڈالا اور ان کفار کو چاند دو ٹکڑے نظر آیا۔ جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کا عصا فرعونوں کو سانپ نظر آیا تھا۔ دیکھو سحر (جادو) فصل ۱۵ میں لیکن جن مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ صرف چاند دو ٹکڑے دن میں نظر نہیں آیا بلکہ فی الواقع چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہے کیونکہ ایسا خیال رکھنے والے یہ نہیں کہتے کہ پیغمبرؐ نے دو ٹکڑے کئے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ خدا نے دو ٹکڑے کئے اور خدا کے لئے دو ٹکڑے کیا دو ٹکڑے کرنے بھی آسان تھے۔ شق قمر کا واقعہ جن کے نزدیک صحیح ہے۔ وہ

مفصلہ ذیل آیت قرآن کو اسی واقعہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

”قیامت قریب آگئی اور چاند شق ہو گیا یہ لوگ کچھ ہی دیکھیں لیکن روگردانی کریں گے اور کہیں گے کہ یہ سحر ہے اور ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔“ سورہ قمر کو ع اول۔

معجزہ شق قمر کے نہ ماننے والے کہتے ہیں کہ یہ آیت قیامت کی علامات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اس مضمون کو زائد وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے مضمون فصل ۱۵ دیکھئے۔

لَعَلَّ دَلُو بِيضُ اللّٰهِ الرِّزْقُ لِعِبَادٍ لِّبَغْوَانِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ نِيْزِلُ بِقَدْرِ مَا يَشَاءُ اِنَّهٗ لِعِبَادٍ خَبِيْرٌ لَّيْسُ

لَهُ اَقْرَبُتِ السَّاعَةُ وَالشَّقُّ الْقَمْرُ وَاِنَّ يَوْمَئِذٍ لَّيُرْءَاوُا اٰتِیَةً یُّعْرَضُ عَلٰیہِمْ لَوْ لَوْ اَسْحَرُ مَسْتَمِرٌّ۔



## فصل نمبر ۲۹

### اسلام اور فلسفہ

دنیا کے پچھلے حالات پر غور کیجئے تو عجائبات سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسلام یا عیسائیت کے ساتھ پچھلے زمانے کے قصص کو بھی تعلق ہے۔ چند قصے قرآن میں بھی مذکور ہیں ان سے یہود اور نصاریٰ کے پرانے قصص کی تائید ہوتی ہے اس لئے ہم کو اس کہنے کی جرات ہو سکتی ہے کہ اہل اسلام جو پرانے قصے بیان کرتے ہیں وہ سب سے زیادہ صحیح سمجھے جاتے ہیں۔ یہودی، عیسائی اور اہل اسلام یہ تینوں مل کر یقیناً دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ پورا کرتے ہیں۔ شروع سے چلیے۔ حضرت آدم کی پیدائش، شیطان کا حسد اور پھر اس کا راندہ درگاہ ہونا۔ آدم کا دنیا میں آنا۔ حوا کا ملنا نوح کے زمانے کے حالات۔ دنیا کا گویا پھر سے بسنا۔ ابراہیم کا آگ میں گر کر نہ جلنا۔ موسیٰ کا عصا اور پھر اس کے واقعات۔ عیسیٰ کا بے باپ کے پیدا ہونا۔ پیغمبر آخر الزماں کے وقت کے بعض معجزات۔ ہم نے تو بہت مختصر کہا۔ غور کیجئے تو کسی پیغمبر کا زمانہ ان معجزات سے خالی نہیں ہے۔ حضرت سلیمان کو دیکھئے کہ ہوا ان کے زیر فرمان تھی۔ ویوا اور پری خادم تھے حیوانات کی بولی وہ سمجھتے تھے اگر ان باتوں کو جھوٹا سمجھیے تو پھر قصہ ہی ختم ہے اور اگر سچ سمجھیے تو پھر ہندو جو ہندوستان کے پچھلے حالات بیان کرتے ہیں ان کو بھی غیر ممکن یا محال ٹھہرانا آسان نہیں ہے۔ اگر ان عجوبہ باتوں کا تعلق پیغمبروں سے مختص سمجھا جائے جب بھی یہ کہنا کہ ہندوستان کی سرزمین پیغمبروں سے خالی رہی بہت بڑی زیادتی ہے اور فیضان الہی کو ارض روم کے ساتھ مختص سمجھ لینا بڑی بے امتیازی ہے کرشن جی کے حالات یا رام



چند جی کے کوائف جو ہندو بیان کرتے ہیں مانا کہ ان کی نسبت مبالغہ کا احتمال ہے مگر شروع سے ان کو غلط یا غیر ممکن سمجھ لینا زیادتی ہے اور گویا درپردہ یہ کہنا ہے کہ ہنود برائے مانو ہم اپنی کتابوں کے قصوں کو بھی تو ایسا ہی لہجہ سمجھتے ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا کے کسی واقعے کو بے سمجھ ہوئے آسانی سے غلط یا غیر ممکن مان لینا صریح خدا کے قادر مطلق ہونے سے انکار کرنا ہے۔

مذہبی خیال کو الگ کیجئے جب بھی تاریخی واقعات بتاتے ہیں کہ ابتدائے زمانہ میں بہت سی باتیں ایسی تھیں جو اس وقت عجاہبات میں شمار کی جاتی ہیں اور چونکہ مختلف ملکوں کی تاریخیں انکی تائید کرتی ہیں اس لئے ان سے انکار کرنے کو ہرگز جی نہیں چاہتا۔ مثلاً جس وقت حالت پاکینیت کو دیو پری سے یہود و نصاریٰ اہل اسلام تعبیر کرتے ہیں اس سے ایرانی تاریخ بھی تو تکلیف ہے۔ تاریخ ایران میں بادشاہوں کا دیووں سے جدال کرنا صاف درج ہے ہندوؤں کی کتابوں میں بھی ایسے عجیب الخلق لوگوں کے تذکرے پائے جاتے ہیں کہ ان کو دیو سمجھیں تو بے جا نہیں ہے بہر حال یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ انتظام عالم کی جو کیفیت اب ہے پہلے اس کے خلاف تھی اور بارہا انقلاب نے ترقی اور تنزل کی حالتیں دکھلا دی ہیں۔ چیزوں کے نام بدل گئے تھمر کے نام بدل گئے جو قوتیں اور صنعتیں معدوم ہو گئیں ان کے بیانات اور تشریحات کے ذرائع بھی تو مفقود ہو گئے۔ پہلے کچھ تھا اور نقل ہوتے ہوتے کچھ رہ گیا کوئی راز جب کہد یا گیا راز نہیں رہتا کوئی صنعت جب ایام گذر گئے صنعت کی مد میں شمار نہیں کی جاتی ایک شے کو ہم بہت عظیم سمجھتے ہیں لیکن اس سے واقف ہو گئے تو دل سے اسکی عظمت جاتی رہی۔ یہاں ہم بیٹھے ہوئے نیویارک کے باشندے سے تار کے ذریعہ سے گفتگو کر رہے ہیں۔ دن چھپنے کے بعد ہم بانکی پور میں سوئے اور دن نکلنے سے پہلے ہم کلکتہ میں داخل ہو گئے۔ زمانہ پلٹ جائے تارا اور ریل معدوم ہو جائیں تو ان ہاتوں کو کتاب میں پڑھ کر لوگ کس طرح سمجھ سکیں گے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ کھلی باتیں انہیں دو جملوں پر تیا س کر لی جائیں لیکن یہ ضرور کہیں گے کہ سوچنے کے لئے یہ بھی ایک پہلو ہے۔ ہاں خوب یاد آیا ابھی حال ہی میں افریقہ جنوبی کے وحشیوں کو انگریزوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ جہالت کا اقتضابے نخوت۔ یہ وحشی (متابلی کہلاتے ہیں) تلوار لے کر توپ اور بندوق کے مورچے پر ٹوٹ پڑے۔ چلے تو تھے یہ سمجھ کر کہ انگریزوں کا خاتمہ کر دیں گے اور انگریزوں کے پاس بھی نری تلوا ریں ہوتیں تو شاید ہوتا بھی ایسا ہی۔ لیکن یہاں تو بندوق اور توپ تھی۔ ہاڑھ جو داہنی سب راستے ہی میں ختم ہو گئے انگریزی سپاہیوں کی صورتیں بھی ان بے چاروں کو دیکھنی نصیب نہ ہوئیں ان میں سے دو چار بچے



کر اپنی قوم کے پاس گئے تو کہنے لگے کہ انگریز بڑے جادوگر ہیں سحر سے یہ مار ڈالتے ہیں لڑائی کی نوبت  
 آنے نہیں پاتی۔ یہ ایک ایسا طریقہ ہے کہ بہت سی مذہبی باتیں اس طور پر بھی سمجھائی جاسکتی ہیں۔  
 فلسفہ کی تعلیم اسباب پر غور کرنے کی عادت پیدا کر دیتی ہے اور پھر یہ بھی سکھاتی ہے کہ  
 باپ دادا سے سنی سنائی باتوں پر بے سمجھے عمل کرنا دانشمندی نہیں ہے بس انہیں دو باتوں نے  
 فلسفہ کو مذہب کے حق میں برا ثابت کر رکھا ہے۔ اب بعض تو فلسفہ پڑھنا ہی ناروا ٹھہراتے ہیں  
 اور بعض یہ کوشش کرتے ہیں کہ فلسفہ پڑھایا جائے اور مذہبی امور میں تاویلیں کرنی جائیں تاکہ  
 مذہبی باتیں کھیل نہ معلوم ہوں۔ یہ دونوں اپنے اپنے طور پر مذہب کے حیر خواہ ہیں۔ فلسفہ عقل کو  
 بڑھانے کے لئے پڑھا جاتا ہے۔ اور مذہب اخلاق سکھانے کو۔ مذہب کو تو یہ دونوں مقدم سمجھے لیکن  
 فرق اتنا رہا کہ ایک ایسی عقل کے بڑھنے سے باز آیا جس سے اخلاق بگڑ جائیں اور دوسرے نے یہ کوشش  
 کی کہ عقل بھی بڑھتی رہے اور مذہبی اخلاق بھی قائم رہے لیکن ہمارے نزدیک ایک تیسری صورت  
 بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ سمجھنا کہ فلسفہ سے مذہب کو نقصان پہنچے گا۔ بیجا ہے۔ فلسفہ ہرگز مذہب  
 کا دشمن نہیں ہے۔ لیکن فلسفہ کیا ہے؟ یہی سمجھنے کی بات ہے۔ آگ کیونکر پیدا ہوئی۔ پانی کس طرح  
 ہوا بن گیا۔ بخارات سے کس طرح بارش ہوتی ہے اور ایسے ہی انتظام عالم کے متعلق دوچار باتوں کا  
 سمجھ لینا لوگ فلسفہ پڑھنا سمجھ لیتے ہیں۔ اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فلسفہ کی اصل ماہیت سے بہت  
 سے طلبا ناواقف ہیں اور یہی ناواقفیت تھوڑی استمداد والوں کو جاب بھر کی طرح ابھرنے پر مجبور  
 کرتی ہے۔ خلقت عالم کی ماہیت سے پورے طور پر تو آج تک کوئی واقف نہیں ہوا اور ناواقف  
 ہو سکتا ہے۔ اتنا ہی سمجھ سکتے ہیں کہ عالم کی خلقت جس کی طرف منسوب ہوتی ہے یا سلسلہ اسباب  
 جہاں جا کر ختم ہو سکتا ہے اسی قوت کا نام خالق عالم ہے اور عالم کے حالات پر مختلف طور سے  
 سوچنے کا نام فلسفہ ہے۔ جب یہ معلوم ہو چکا کہ ماہیت عالم سے واقفیت حاصل کرنا عملی طور  
 پر غیر ممکن ہے تو اب بجز فکر کرنے کے جس کو معرفت کہہ دگا کہہ سکتے ہیں۔ فلسفی کو یہ حق کہاں سے  
 پیدا ہوا کہ وہ کسی شے کو ممکن الوقوع یا کسی شے کو غیر ممکن الوقوع قطعی طور پر مان لیں۔ ظاہر  
 ہے کہ جب اصل شے یعنی خلقت عالم پر قطعی رائے دینے سے معذوری ہے تو اس کے نزوات  
 کے متعلق کیونکر کوئی رائے مستحکم قائم ہو سکتی ہے۔ جس طرح خود بخود خالق مطلق کی خواہش سے عالم کا  
 موجود ہونا مان لیا جاتا ہے ویسے ہی یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ دنیا کی تمام باتیں ہر وقت اور ہر لحاظ  
 ازہر تو پیدا ہو سکتی ہیں۔ آگ ٹھنڈی ہو سکتی ہے۔ پانی پتھر ہو سکتا ہے مردہ زندہ ہو سکتا ہے



حیوانات انسان کی بولی بول سکتے ہیں۔ اب اس کو غیر ممکن تو وہ کہے جو پہلے یہ بتائے کہ آگ گرم کیونکر ہوئی۔ پانی سیال کیوں ہوا۔ انسان کی پیدائش میں کیا کیا اسرار ہیں۔ مر کے جینا عملی طور پر کیوں ہوا ہے۔ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ اول انسان کس طرح پیدا ہوا۔ اجلے کے بعد اندھیرا ہوا یا اندھیرے کے بعد اجالا۔ پہلے دنیا میں سردی آئی یا گرمی یا خود دنیا ہی کو کوئی بتائے کہ یہ کیا چیز ہے یہ عجب خیال ہے کہ جس نئی بات کو ہم آنکھ سے دیکھ لیں اس کے لئے تو ایک نہ ایک تاویل پیدا کئے بغیر نہ رہیں گے اور جسے آنکھ سے نہ دیکھیں کان سے سنیں اس پر بے تکلف اپنی رائے فنی میں قائم کر لیں اور رائے بھی ایسی کہ اپنی عقل کو کم سمجھنے میں ہمیں ہزار دقتیں پیش آئیں اور قادر مطلق کے اختیارات کے متنازع کر لینے میں ہمیں ذرا بھی تامل نہ رہے۔

اگر فلسفہ کا یہ مطلب ہے کہ خالق عالم نے تخلیق عالم کے بعد اپنے ہاتھ کٹا ڈالے دنیا کا گورنر رکھ دینا بنا کر وہ وجود محفل بن بیٹھا تو فلسفہ جہل مرکب ہے۔ اور اگر فلسفہ کا یہ مطلب ہے کہ خالق عالم نے دنیا کو دارالاسباب بنا یا ہے اور عموماً ہر بات کے لئے اس نے سبب قرار دے رکھے ہیں۔ ان اسباب کا خواہ مخواہ سمجھ جانا گو ہماری قدرت سے باہر ہے لیکن ان پر غور کرنا ایک قسم کی عبادت ہے تو ہم نہایت خوشی سے کہیں گے کہ فلسفہ بہت کھٹیک ہے اور ہر سچے مذہب کا اپنی دستور ہونا چاہیے۔

مفصلہ بالا تحریر میں جو مختلف خیالات کی توضیح کی گئی ہے اسے ایک دوسرے طوعہ پر یوں سمجھنا چاہیے۔ مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ پر یاں تخت پر بٹھا کر ہوا میں آدمیوں کو اڑا سکتی ہیں تو موجودہ تجربہ کے یہ خلاف ہو گا۔ مگر اس سے مذہب اسلام میں کچھ فرق نہ آئے گا اور اگر کوئی کہے کہ نہیں پر یوں ہیں ایسی قوت نہیں ہے اور نہ پر یوں کا وجود ہے جب بھی اس سے اسلام میں فرق نہ آئے گا لیکن جو یہ سمجھے گا کہ پر یاں خدا کے حکم سے باہر مطلق العنان قوتیں ہیں اور جو چاہتی ہیں کرتی ہیں تو بیشک وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ یہ خوب واضح رہے کہ مذہب اسلام فلسفہ سکھانے نہیں آیا تھا وہ صرف یہ بتانے آیا تھا کہ بجز ایک ذات باری تعالیٰ کے اور کسی کو قادر مطلق نہ مانو کیونکہ حسن معاشرت سکھانے کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ ہنود کہتے ہیں کہ ان کا مذہب عین فلسفہ ہے ہے ممکن ہے کہ ایسا ہو۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا عین فلسفہ ہونا کوئی وصف نہیں ہے۔ مذہب کا کام ہے حسن معاشرت کا سکھانا۔ عقلی تکیے لگانے سے مذہب کا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ مذہب اسلام فلسفہ کے خلاف ہے یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ عین



فلسفہ ہونا اور فلسفہ کے خلاف نہ ہونا ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اسلام ہرگز فلسفہ کے مخالف نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یقینی ہے کہ اسلام نے فلسفہ کی پرواہ نہیں کی۔ اگر کوئی خاص فلسفہ مذہب اسلام اختیار کرتا۔ تو مذہب کی اصلی . . . . .  
 عرض حسن معاشرت کے نظر انداز ہونے کے علاوہ یہ نقص بھی پیدا ہوتا کہ یہ مذہب تمام دنیا کا مذہب اور ہر زمانے کا مذہب نہ رہتا۔ فلسفہ گویا نتیجہ فکر کی ایک قسم ہے اور فکر انسانی ہمیشہ بدلتی رہتی ہے اگر اسلام کوئی فلسفہ خاص اختیار کرتا تو ایک زمانے میں وہ جو سمجھا جاتا اور دوسرے زمانے میں سچا سمجھا جاتا یا ایک ہی زمانے میں بعضوں کے نزدیک صحیح اور بعضوں کے نزدیک غلط ہوتا۔ اسلام کی خاص حکمت ہے کہ وہ ہر زمانے کے فلسفہ کے مطابق ہے۔ اہل سے جاہل قوم کی بھی تشریح کر سکتا ہے اور بڑے سے بڑے عقلائے زمانہ کو بھی وہ سمجھا سکتا ہے۔ اس مضمون کو وضاحت سے سمجھنے کے لئے حکمت اور فلسفہ کے متعلق آیات قرآنی "فصل ۲۸ - اور قصص قرآنی فصل ۵۳ - شیطان اور جن" فصل ۵۴ "سحر جادو" فصل ۵۱ - آفرینش ارض و سما فصل ۵۰ پڑھنا چاہیے۔

خلاصہ یہ ہے کہ فلسفہ مذہب اسلام کے خلاف نہیں ہے اور نہ اس کے پڑھنے سے آدمی گمراہ ہو جاتا ہے۔ قرآن کو جو کوئی محدود حالت میں مانتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ فلسفہ سے اسلام جاتا رہے گا وہ اسلام کی اعلیٰ عظمت سے واقف نہیں ہے۔ اس باب پنجم میں زیادہ تر مضامین اسی قسم کے لکھے جائیں گے جن سے فلسفہ جدید پڑھنے والوں پر یہ ثابت کیا جائے کہ قرآن صرف بہت بڑی ہدایت کے لئے نہیں ہے بلکہ عقلا کی ہدایت کے لئے بھی ہے اور ان کا بھی تشریح کرنے والا ہے۔

بعض مسلمانوں نے مجھ سے کہا کہ فلسفہ پڑھنے سے ان کے ایمان میں فرق آ گیا ہے اور اب خدا کو وہ دیکھ نہیں سمجھتے جیسا کہ پہلے سمجھتے تھے۔ میں نے اس کے جواب میں کہا کہ بچے اور بڑے خدا کی نسبت یکساں خیال نہیں رکھ سکتے اور نہ علماء اور جہلا ایک سا خیال رکھ سکتے ہیں۔ جو چیز دیکھنے کی نہیں ہے وہ تصور کرنے کی ہے اس کی حالت تصور کے ساتھ بدلتی رہے گی مگر یہ تبدیلی ایمان میں کچھ فرق نہ ڈالے گی۔ حضرت موسیٰ اور گڈریے کا قصہ منجوسی مولانا روم میں یوں مذکور ہے کہ گڈریا خدا سے ملنے کی تمنا ظاہر کرتا تھا اور کہتا تھا کہ خدا ملتا تو وہ اسے بھر کا دور پلاتا اور بڑی خاطر کرتا۔ حضرت موسیٰ نے اسے ڈانٹا لیکن اس کے ساتھ ہی آپ کے دل میں یہ خیال گزرا کہ گڈریا اپنے پندار کے مطابق خدا کا خیال رکھے گا اور حضرت موسیٰ اپنی دانش کے مطابق



خدا کا تصور کریں گے نوعیت میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔ لیکن اصل میں دونوں متحد ہیں۔ اصل ایمان ہے۔ صرف ایک ہی ذات کو خدا سمجھنا اور اس کو سب پر بالا جاننا اور اس میں دونوں متفق ہیں ایک سرگزشت میں اپنے متعلق بیان کرنا باعث دلچسپی سمجھتا ہوں۔ مجھے صغریٰ سننی میں عبادت کا بڑا شوق تھا اور خدا سے بے حد محبت تھی۔ خدا کا وجود میں جب بھی مانتا تھا اور اب بھی مانتا ہوں۔ لیکن نوعیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ خدا کے ہاتھ آدمی کے ہاتھ کی طرح ہیں اور وہ اپنے ہاتھوں سے چیزوں کو اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھتا ہے۔ گجرات کا سفر مجھے پیش آیا اور میرا اونٹ مال اور اسباب لے کر بھاگ گیا۔ قصہ بہت طول طویل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مجھے اس بے گانی جگہ جب بھوک نے ستایا تو میں نے مسجد میں جا کر نماز پڑھی اور سرسجدہ میں رکھ دیا اور خدا سے درخواست کی کہ اے رزاق مطلق فلاں طاق پر کوئی چیز کھانے کی رکھ دے۔ تین مرتبہ میں نے سجدہ سے سر اٹھا کر طاق کو دیکھا کوئی چیز نظر نہ آئی مجھے و توفیق کامل تھا کہ کوئی چیز ضرور مل جائے گی۔ گھنٹہ بھر میں اسی حالت میں مبتلا رہا۔ اب جب کبھی میں یاد کرتا ہوں تو اپنی حرکت پر مجھے بے اختیار ہنسی آتی ہے یہ نہایت ہی صغریٰ سننی کا واقعہ ہے اس کے بعد جب ذرا اور میں سن شعور کو پہنچا تو میرا یہ خیال ہوا کہ اپنے ہاتھوں سے چیزوں کا رکھنا اٹھانا خدائی کام نہیں ہے بلکہ اپنے کلام میں اس نے تاثیر دے رکھی ہے۔ دعا مانگنے کے بعد اپنے موقع اور محل سے وہ کام خود ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد چند آیات قرآنی ایک دعا کی کتاب سے میں نے یاد کر لیں۔ اور جب کبھی ضرورت ہوتی تو میں پڑھتا تھا اور وہ کام ہو جاتا تھا۔ سات آٹھ مرتبہ کامیاب رہ کر میں نے یہ خیال کیا کہ یہ دعا تیر بہدف ہے اس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک مرتبہ نہایت ہی اہم کام کے لئے میں نے چلہ کیا لیکن میرا وہ کام نہ بنا۔ مجھ کو نہایت بے دلی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی خدا کی طرف سے میرے دل میں ناامیدی (نوذبالہ من ذلک) پیدا ہوئی اور یہ خیال گزرا کہ میں نے التجا سے مانگا وہ کیسا خدا ہے کہ اس نے دینے میں بخل سے کام لیا۔ اب میری عمر قریب بلوغ کے تھی وہ صغریٰ سننی کی حالت نہ تھی کہ اتنی بڑی مایوسی کے بعد مجھ کو طلال نہ ہوتا۔ اس ناکامی پر مجھے سخت رنج ہوا۔ کچھ عرصہ بعد جب میری معلومات بڑھیں تو میں اپنے خیال پر بہت نادم ہوا اور نئے سرے سے گویا مسلمان ہوا۔

اب میرے خیالات یہ ہیں کہ خدا مسبب الاسباب ہے۔ اسباب ظاہری میں اس نے اپنے بندوں کو اپنے فعل کا مختار بنا دیا ہے اور رہنمائی کے لئے عقل دے دی ہے لیکن اسباب خفیہ



کو نہ کوئی جانتا ہے اور نہ کسی کو سوائے ذات باری تعالیٰ کے اس میں دخل ہے خدا جو کچھ کرتا ہے اچھا کرتا ہے اور وہی اپنے افعال کی مصلحت کو جانتا ہے۔ بندہ لاکھ چاہے لیکن خدا ہی کرتا ہے جو اس کے نزدیک مناسب ہے اس کے افعال جو اسباب خفیہ کے ذریعہ سے ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ محرکات الثانی سے باہر ہیں۔ ان پر غور کرنا عبادت ہے لیکن اس کے پیچھے پڑنا گمراہی ہے۔ اب میں سوچتا ہوں تو اپنے اسلام کو بہ نسبت سابق کے کہیں اچھا پاتا ہوں۔ اسی کو شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔

کہ بے علم نتوان خدا را شناخت



## فصل نمبر ۵

### آفرینش ارض و سما

خلقت ارض و سما کے متعلق گو کوئی قطعی رائے قائم نہیں ہوئی ہے لیکن لوگوں کا خیال ہے اور تورات موجودہ سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے کہ پہلے پانی ہی پانی تھا۔ خدا نے اپنی قدرت کا ملکہ سے اس میں حرارت پیدا کی تو پانی پر جھاگ آگیا اور بخارات اڑے۔ جھاگ سخت ہو کر زمین بن گئی اور بخارات سے آسمان بنے۔ آسمان کیا ہیں اور کیونکر بنے اس کی توضیح آئندہ کی جائے گی اس وقت صرف یہ کہنا ہے کہ اگر خلقت ارض و سما کی یہی صورت مانی جائے تو قرآن سے اس کی نفی نہیں ہوتی بلکہ کچھ تائید ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے۔

”پھر آسمان بنایا اور وہ کھرتھا۔“ سورہ حم رکوع ۲

اور دوسری جگہ ہے۔

”اسی نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو چھ دن میں اور تھا اس کا تخت زمین پر“ سورہ ہود رکوع ۹۔

”چھ دن“ کا لفظ اس وقت موضوع بحث نہیں ہے اور ”تخت“ کا لفظ مجازاً آگیا ہے خدا

لے تم استوی الی السماء وہی دخان۔

تہ وہوالذی خلق السموات والارض ستة الایام وكان عرشه علی الماء۔



کے لئے کسی مکان کا مختص ہونا تمام مسلمانوں میں مسلم ہے اور باقی آیت کے معنی صاف ہیں۔ پھر یہ تو اہم مسئلہ نہیں ہے۔ اس کے متعلق کوئی رائے یقینی کسی نے قائم نہیں کی اور نہ مذہب نے کوئی صاف بات بتائی اس لئے اس کو جس طرح چاہیں فرض کر سکتے ہیں بشرطیکہ احکام قرآن سے مخالفت نہ ہو۔ لیکن بحث طلب صرف یہ امر ہے کہ علم ہیت کے متعلق جو کچھ قرآن میں بیان کیا گیا ہے اس کا کیا مطلب ہے۔ جب تک یونانی زبان کے علوم عربی میں ترجمہ نہیں ہوئے تھے اس کی طرف مسلمانوں کو توجہ نہیں ہوئی اور اگر کچھ توجہ ہوئی تھی تو جو ہیت یہودیوں کے نزدیک آسمان اور زمین کی تھی اسی کے مطابق لوگ آیات قرآنی سمجھتے رہے۔ بعد ازاں جب یونانی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں تو علمائے اسلام نے قرآن کی تفسیر میں یونانی علم ہیت کی جو یہودیوں کی معلومات سے زائد تر مغاثر نہ تھی اتباع کی۔ مثلاً قرآن میں سبع سماوات (سات آسمان) مذکور ہے اور یونانیوں نے آسمان نو قرار دیئے تھے علمائے اسلام نے "کرسیا السموات والارض" اور "وہورب العرش العظیم" پر لحاظ کر کے سات آسمان کے ساتھ کرسی اور عرش شامل کر دیئے اور اس طرح نو آسمانوں کو قرآن سے ثابت کر دیا اور قرآن کے اس معجزے کو کہ وہ ہر طبقہ کے انسان کا تشفی کرنے والا ہے سچا ثابت کر دکھایا۔ مرد زمانہ نے ادھر ہیت سے تفسیریں قرآن کی پیدا کیں اور ہر ایک میں ہیت یونانی کی تقلید کی گئی اور قرآن کو اس ہیت سے الگ کر کے سمجھنا گویا جمہور مفسرین سے اختلاف کرنا سمجھا جاتا ہے۔ اب وقت یہ آپڑی کہ ایسویں صدی میں نظام شمسی کے ماننے والے اتنے بڑھے کہ ہیت یونانی ایک دم سے باطل ہو گئی۔ اب اگر قرآن ہیت یونانی کا تابع سمجھا جائے تو قرآن کا بھی بطلان لازم آتا ہے۔ ہم قرآن کے اس معجزے کو سچا سمجھتے ہیں کہ وہ ہر ایک شخص کی تسکین کرتا ہے اور اسلام کے اس دعوے کو بھی ہم سچا سمجھتے ہیں کہ وہ ہر حالت اور ہر موقع کے مناسب ہے اس لئے ہم کو جرات ہوئی اس امر کی طرف کہ اگر تحقیقات جدیدہ کو ہم باطل نہیں کر سکتے تو یہ ضرور ثابت کر سکیں گے کہ قرآن موجودہ علم ہیت کے منافی نہیں ہے۔

ایک صورت یہ بھی ہے کہ ہم تحقیقات قدیمہ کو صحیح اور تحقیقات جدیدہ کو غلط کہیں اور اس لئے موجودہ تفاسیر سے ہم کو اختلاف نہ کرنا پڑے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ تحقیقات جدیدہ میں بہت سی باتیں ایسی پائی گئی ہیں جو بدیہات میں داخل ہو جاتی ہیں۔ دور بین نے بہت سی چیزیں ہمیں آنکھوں سے دکھادی ہیں۔ اگر ہم آگ کے روشن ہونے سے انکار نہیں کر سکتے تو تحقیقات جدیدہ کے صحیح ہونے سے بھی انکار نہیں کر سکتے مسلمانوں کا یہ کوشش



کرنا کہ تحقیقات جدیدہ غلط ہیں ان پر ایک دوسرا الزام جہالت کا عائد کرے گا۔ علوم کے تمام باریک مسائل کا لکھنا اس کتاب کے موضوع سے الگ ہو جاتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس طرح مضمون عام فہم نہ رہے۔ اس لئے چند موٹی موٹی باتیں ہم درج کرتے ہیں۔ جن کو تھوڑے سے علم ہیئت جاننے والے بھی سمجھ سکیں۔ اور جو حضرات اس قدر بھی نہیں سمجھ سکتے ان کے لئے موجودہ تفسیر قرآن کی کافی ہے۔ کیونکہ نہ ان کے دل میں کبھی خدشات پیدا ہوں گے اور نہ مخالفین ان سے کبھی مباحثہ کریں گے۔

۱۱۔ یونانیوں نے صرف سات سیارے دریافت کئے تھے اور اس لئے ان کے لئے سات آسمانوں کی ضرورت تھی۔ اب دور بین سے زمین چھوڑ کر دس سیارے ثابت ہوئے ہیں۔ پہلے مسلمانوں نے سب سے سماوات کا ترجمہ سات آسمان کیا۔ اب اس کا ترجمہ گیارہ سماوات ہونا چاہیے لیکن ممکن ہے کہ کوئی اور تیز دربین نکلے اور چند سیارے اور نظر آئیں اس لئے سب سے کہ معنی متعدد ہوں تو اچھا ہے۔ ہم آگے دکھائیں گے کہ "سب سے" کے معنی "متعدد" ہیں اور یہ معنی اس وقت کہے گئے تھے جب سات آسمانوں سے زیادہ دریافت نہیں ہوئے تھے۔

۱۲۔ آسمان کو پیا ز کے چھلکے کی طرح تہ بہ تہ یونانیوں نے اجسام مانے ہیں اور مفسرین نے بھی اس کا تتبع کیا ہے۔ اب یہ وقت ہے کہ دور بین سے بعض سیاروں کے گرد قمر نظر آتے ہیں۔ مثلاً مشتری کے گرد چار قمر ہیں۔ اگر سیاروں کا مدار خلا میں یا کسی لطیف جسم میں نہ ہو اجسام میں ہو تو ان قمروں کی گردش متعذر ہو جائے یا یہ اجسام کو چکنا چور کر ڈالیں۔

۱۳۔ اگلے زمانے میں یونانی حکماء مدار ستاروں کو سمجھتے تھے کہ آسمان اور زمین کے بیچ میں پیدا ہوتے ہیں اور فنا ہو جاتے ہیں۔ اب دور بین سے معلوم ہوا کہ یہ ستارے ہیں اور تمام سیاروں کے اوپر نکل جاتے ہیں۔ یونانیوں نے جس طرح کا جسم آسمان کا مانا ہے وہی ہوتا تو وہ مدار ستاروں کو روکتا یا مدار ستاروں کی وجہ سے تمام آسمان شیشہ کی طرح چکنا چور ہو جاتے۔

۱۴۔ حکماء یونانی شمس کو زمین کے گرد گھومنے والا مانتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے ساتھ دور بین ہوتی اور وہ

زہرہ وغیرہ سیاروں کا بدرو ہلال ہونا دیکھتے تو سمجھتے کہ آفتاب کے گھومنے سے یہ بات پیدا نہیں ہو سکتی۔ بلکہ زمین مع تمام سیاروں کے آفتاب کے گرد گھومے جب ہی پیدا ہو سکتی ہے۔

۱۵۔ دور بین سے کبھی عطارد و زہرہ آفتاب سے نیچے دکھائی دیتے ہیں اور کبھی آفتاب کے اوپر اگر یونانیوں کی طرح فلک اول پر زہرہ۔ دوم پر عطارد۔ سوم پر شمس مانا جائے تو یہ صورت پیدا نہیں ہو سکتی یہ صورت جب ہی پیدا ہو سکتی ہے کہ شمس کے گرد عطارد۔ عطارد کے بعد زہرہ کے بعد



زمین چکر لگائے۔

غرض کہ یونانیوں کا یہ قول کہ آسمان شیشہ کا سا ایک جسم ہے اور پیاز کے پھلکے کی طرح تہ بہ تہ جما ہوا ہے اور اس میں سیارے جن میں شمس بھی داخل ہے جڑبے ہوئے ہیں۔ آسمان زمین کے گرد گھومتے ہیں اور ان کے ساتھ سیارے بھی گھومتے ہیں اتنا غلط ثابت ہوا کہ بدیہات میں داخل ہو گیا ہے۔ نظام بطلیموسی (یونانی) کے صحیح ماننے میں ایک یہ بھی برائی ہے کہ خدا کی قدرت محدود ہو جاتی ہے اور نظام شمسی ماننے میں خدا کی قدرت کاملہ جو مثل اس کے بے انتہا ہے۔ غیر محدود معلوم ہوتی ہے ہمارے اس مقولے کو وہ بخوبی سمجھ سکتا ہے جو نظام شمسی کو پورے طور پر جانتا ہے۔

ہم اپنے مضمون کے سمجھانے میں اگر تمام آیتوں سے بحث کریں تو مضمون بے وجہ طول ہو جائیگا لیکن ان تمام اہم آیتوں سے ہم ضرور بحث کرنا چاہتے ہیں جنکے سمجھنے کے بعد پھر تمام قرآن کا نظام شمسی کے مخالف نہ ہونا بخوبی سمجھ میں آجائے گا۔

قرآن میں سماء کا لفظ عموماً بولا گیا ہے۔ سماء کے معنی لغوی پیدے سمجھنا چاہیے۔ قاموس میں لکھا ہے کہ "السماء معروف" یعنی آسمان وہی ہے جسے سب جانتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ سب کسے آسمان جانتے ہیں۔ ہندوستان میں جسے لوگ آسمان سمجھتے ہیں اسی کو عرب بھی جنکی زبان میں قرآن اتراتا تھا آسمان سمجھتے ہیں اور اسی کو تمام دنیا کے لوگ اپنے دل میں آسمان سمجھتے ہیں۔ یعنی زمین کے گرد نیلی یا سبز چیر جو چاروں طرف سے زمین کو گھیرے ہوئے ہے وہی سماء ہے اور یہ علم ہدیت کے آسمان سے الگ ہے۔ نظام بطلیموسی کی رو سے بھی یہ وہ شیشہ والا آسمان نہیں ہے جس میں کو اکب جڑے ہوئے ہیں یا تیر رہے ہیں اور نہ نظام شمسی والا یہ خلائے محض ہے جس پر سیاروں کا مدار ہے بلکہ یہ ایک دوسری شے ہے۔ تمام حکماء قائل ہیں کہ زمین کے اوپر طبقہ ہوائی ہے۔ اس طبقہ ہوائی میں آفتاب کی کرنیں منعکس ہو کر یہ رنگ پیدا کرتی ہیں جو سب کو نظر آتا ہے۔ تو گویا یہ آسمان جو ہم کو دکھائی دیتا ہے اسی زمین کا ایک جزو ہے اور ممکن ہے کہ اور سیاروں میں بھی ایسے ہی آسمان ہوں۔ سورہ حم میں اس آسمان کو "سماء دنیا" لکھا ہے۔ کتنا پر معنی لفظ ہے۔ غرض کہ اصلی معنی آسمان کے ہیں یہی نیلی پخت جو اوپر نظر آتی ہے۔ لیکن مجازاً اس کو ہر چیز پر بول سکتے ہیں جو اوپر ہے۔

اسی لحاظ سے سماء کا لفظ قرآن میں چار معنی میں بولا گیا ہے۔



۱۱- کہیں اس نیلی چیز پر بولا گیا ہے جو دکھائی دیتی ہے۔

۱۲- کبھی صرف فضا ئے محیط پر بولا گیا ہے۔

۱۳- ابر اور بادل کے معنی میں بھی بولا گیا ہے۔

۱۴- ستاروں کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔

قسم اول یعنی نیلی چھت کے معنی میں جہاں سما کا لفظ استعمال کیا گیا ہے وہاں زائد مخاطب کا لحاظ کیا گیا ہے۔ یعنی عرب کے لوگ اس نیلی چھت کو جس طرح کی سمجھتے تھے کہیں کہیں انھیں کے پندار کے موافق ان سے گفتگو کی گئی ہے۔ قرآن میں جہاں آیا ہے کہ آسمان کو دیکھو۔ وہاں اکثر آسمان سے نیلی چھت مراد ہے۔ کیونکہ وہی دیکھنے کی چیز ہے۔ ان تمام آیتوں کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے جس میں کسی قسم کی بحث پیدا نہیں ہوتی لیکن وہ آیتیں جن میں شہادت پیدا ہو سکتے ہیں ضرور قابل تذکرہ ہیں۔

، اگر ہم کھول دیں ان پر دروازے آسمان کے اور وہ ایسے ہو جائیں کہ وہ تمام دن اس میں چڑھتے رہیں جب بھی کہیں گے کہ ہماری ڈھیٹھ بندھی ہوئی ہے۔ یا ہم پر جادو ہوا ہے۔

اس میں جو لفظ دروازہ کا آیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آسمان میں دروازے ہیں بلکہ ایک غیر ممکن بات فرض کر کے کہی جاتی ہے کہ آسمان میں دروازے ہو جائیں اور کفار چڑھنے لگیں جب بھی وہ ایمان نہ لائیں گے اور کہیں گے کہ ہم پر جادو کیا گیا ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر ایسی ہی غیر ممکن بات کو مثلاً بیان کر کے اس معنی کی اور توحید کی گئی ہے۔ ہمارے نشانیاں جنہوں نے جھٹلائیں اور اظہار تکبر کیا ان کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھلیں گے (یعنی ان کے حق میں خیر و برکت نہ ہوگی) اور نہ وہ بہشت میں جائیں گے۔ جب تک سوئی کے ناکے میں اونٹ نہ گھسے۔

یعنی اونٹ کا سوئی کے ناکے میں گھسنا جس طرح محال ہے اسی طرح ان کا بہشت میں جانا محال ہے۔ اسی طرح سورہ اول کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ جس طرح آسمان میں دروازوں کا ہونا محال ہے اسی طرح یہ بھی محال ہے کہ جن کے لئے ایمان لانا بدارہیں ہے وہ ایمان لائیں۔ اسی مقام

لہ ولو فتحنا علیہم بابا السماء فظلموا فنیہ لیرجون لقا لو انما سکت الہمارنا بل نحن قوم مسکور  
لے ان الذین کذبوا بآیاتنا واستکبروا عنہا لا تفتح لہم ابواب السماء ولا یدخلون الجنة حتی یلج الجمل فی سم الخياط۔



پر تفسیر کبیر میں جو کچھ لکھا ہے اس کے ایک جزو کا ہم ترجمہ کرتے ہیں۔

ماحصل یہ ہے کہ جب اہل عرب نے رسول اللہ پر ایمان لانا آسمان سے فرشتوں کے اترنے پر مشروط کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتایا کہ اگر بر تقدیر ایسا ہو جب بھی منکرین کہیں گے کہ یہ جادو ہے اور جو چیزیں ہم کو دکھائی دیتی ہیں فی الواقع ہم ان کو نہیں دیکھتے۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ جب آسمان میں فرشتوں کے اترنے اور کافروں کے چڑھنے کے لئے دروازہ رکھا گیا ہے تو آسمان کو ٹھوس ہونا چاہیے نہ کہ ہوائی۔ تو ہم کہیں گے کہ بیشک جن لوگوں سے گفتگو کی گئی تھی وہ آسمان کو ٹھوس ہی سمجھتے تھے اور انہیں کے خیال کے مطابق ان سے گفتگو کی گئی۔ اس سے یہ نہیں نکلتا کہ خدا نے اس نیلی چھت کو اینٹ پتھر شیشہ یا کسی اور ٹھوس چیز کی بنی ہوئی بتائی ہے۔ محض بندوں کے خیالی جسم پر بندوں کے محاورے کے موافق دروازہ کھولنے کا اطلاق ہوا ہے نہ کہ بطور اصل حقیقت کے۔

ایک جگہ ہے۔

۱۔ آسمان کو ہم نے محفوظ چھت بنائی۔

اور دوسری جگہ ہے۔

۲۔ قسم ہے اوپنی چھت کی۔

ان دونوں مقاموں پر سقف محفوظ (محفوظ چھت) اور سقف مرفوع (اوپنی چھت)

میں سقف دچھت سے یہی نیلی چیز مراد ہے۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ آسمان کو چھت

اس لئے کہا کہ وہ زمین کے لئے ایسا ہی ہے جیسے کہ گھر کے لئے چھت۔ اس میں جو لفظ مرفوع

آیا ہے۔ وہ بھی کچھ بے موقع نہیں ہے۔ بے شک یہ نیلی چھت مرفوع نظر آتی ہے۔ لیکن

مرفوع ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ڈاٹ لگا کر گنبد بنا یا گیا ہے۔

۳۔ کیا وہ اپنے آگے پیچھے آسمان وزمین نہیں دیکھتے۔ اگر ہم چاہیں تو ان کو زمین میں دھنسا

دیں یا چاہیں تو ان پر آسمان سے کوئی ٹکڑا ڈالیں۔

۱۔ وجعلنا السماء سقفاً محفوظاً۔ الانبیا آیت ۳۳۔ ۲۔ والسقف المرفوع۔ الطور آیت ۵۔

۳۔ افلم یروا الی ما بین ایدہم۔ وما خلفہم من السماء والارض ان نشار نحف بہم الارض ونسقط

علیہم کفامن السماء۔ سبا آج ۹۔



کفار کہا کرتے تھے کہ اگر ہم خدا کا کہنا نہیں مانتے تو خدا ہم پر آسمان کیوں نہیں گرا دیتا کہ ہم رب کو مر جائیں کفار اپنی پندار میں سمجھتے تھے کہ نیلی چھت ایسی سٹھوس ہے کہ اس کے گرنے سے لوگ دب جائیں گے۔ ان کفار کے پندار کے موافق آیت اتری کہ زمین و آسمان سب ہی خدا کا بنایا ہوا ہے جیسا کہ کفار دیکھتے ہیں۔ پھر خدا کے لئے کیا مشکل ہے کہ وہ زمین میں کفار کو دھنسا دے یا آسمان کا ٹکڑا کفار پر گرا دے۔ یہاں ٹکڑا ازیر بحث نہیں ہے بلکہ خدا کی قدرت زیر بحث تھی۔ مخاطب عرب تھے اس لئے انھیں کی سمجھ کے موافق اور انھیں کے محاورات کے مطابق ٹکڑے کا لفظ بولا گیا۔ یہ معنی زیادہ تر صاف ہو جاتے ہیں۔ دوسری آیت کے پڑھنے سے کافروں نے پیغمبر سے کہا: "تو سچا ہے تو ہم پر آسمان کا ٹکڑا گرا دے" پھر اس کے جواب میں اگر کہا جائے کہ خدا ٹکڑا گرانے پر قادر ہے تو بلحاظ مخاطب کے خیال کے کیا بیجا ہوگا اور ممکن ہے کہ سمار سے بادل مراد ہو جیسا کہ آگے بیان کیا جائے گا۔ تو پھر مطلب اور بھی صاف ہو جاتا ہے کہ زمین اور بادل انسان کے لئے مفید ہیں مگر ان کو خدا اس طرح مضر کر سکتا ہے کہ زمین کو دھنسا دے اور بتدریج پانی برسنے کے عیوض ایک دم سے ابر کو گرا دے کہ شدت بارش باعث ہلاکت ہو۔ اسی کے قریب قریب امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں: "خدا نے اس سے کافروں کی تہدید کی ہے کہ ہم چاہیں تو زمین کو دھنسا دیں یا آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ جو چیز تمہارے فائدہ کی ہے اسے مضر کر دیں دھنسا کر یا ٹکڑے ٹکڑے کر کے"۔

"جس دن ہم لپیٹ لیں گے آسمان جیسے لپٹے میں طومار میں کاغذ" آثار قیامت اور قدرت خدا کا ذکر ہے کہ جس طرح خدا نے آسمان پیدا کیا اسی طرح اس کو نیست بھی کر دیگا یعنی جس طرح پھیلا یا اسی طرح سمیٹ بھی لے گا۔ اس سے آسمان کا سٹھوس ہونا معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی نفی ہوتی ہے۔ اگر وہ سٹھوس ہوتا تو کاغذ کی طرح لپٹا کیونکر۔ لیکن واضح رہے کہ اس سے کاغذ کی طرح ہونا بھی نہیں پایا جاتا۔ یہ بھی ایک طرز ہے بیان کا اس سے مقصود سرف معدوم کرنے کا بیان کرنا ہے۔ جیسا کہ مابعد عبارت سے ظاہر ہے "جیسا کہ ہم نے پہلے پہل پیدا کیا تھا ویسا ہی پھر کریں گے" (لما بدأنا اول خلق نجدہ) اس کا مطلب یہ ہے

۱۔ فاسقط علینا کسفاً من السمار ان کنت من الصادقین۔ الشرح آیت ۱۸۷۔

۲۔ یوم لظوی السمار کظی السجیل لکتب۔ انبیاء آیت ۱۰۴۔



کہ زمین و آسمان کو نیت کر کے پھر ہم پیدا کریں گے۔ قرآن میں ایک دوسری جگہ پر ہے کہ۔  
 "آسمان اللہ کے دلہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہیں" (والسماوات مطویاتٌ بيمينہ)  
 صاحب کشف نے اس موقع پر لکھا ہے کہ "مٹھی سے ملک خدا مراد ہے اور دائیں ہاتھ سے اسکی  
 قدرت مراد ہے اور اس کے دلہنے ہاتھ میں لپٹنے سے مراد ہے فنا ہونے والا۔"

عرب سمجھتے تھے کہ مثل زمین کے آسمان ایک ٹھوس چیز ہے اور وہ زمین کے اوپر اس طرح سے  
 ہے جس طرح رکابی کے اوپر سرپوش رکھا جاتا ہے۔ خدا نے عربوں کی سمجھ کے مطابق اگر یہ کہا کہ  
 یہ گنبد چرخ اتنا پرانا ہے۔ لیکن ہنوز قائم ہے زمین پر گرنے نہیں پاتا تو آخر کسی قوت نے اسکو  
 سنبھال رکھا ہے اور وہی خدا ہے۔ وہی تھام رکھتا ہے آسمان کو زمین پر گرنے سے۔ تو اس  
 سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن میں یہ نیلا آسمان ٹھوس مانا گیا ہے اور اگر آسمان سے کو اکب مراد  
 لئے جائیں۔ جیسا کہ آگے بیان کیا جائے گا تو تاویل کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن صحیح یہ ہے  
 کہ عرب جسے آسمان سمجھتے تھے اور جسے وہ ٹھوس سمجھتے تھے اسی کا بیان ہے۔ اور انھیں کی  
 سمجھ کے موافق الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

جب آسمان پھٹے گا تو گلابی تیلیاں ہو جائے گی۔ اسی طرح اور بھی چند آیتیں جن میں  
 آسمان کا پھٹنا۔ چرنا۔ کھلنا۔ ٹکڑے ٹکڑے ہونا بیان کیا گیا ہے اور زیادہ تر آثار قیامت کے متعلق  
 یہ بیانات ہیں۔ مقصود ان سب سے آسمان کا فنا ہونا ہے۔ عربوں کے خیال کے مطابق فنا  
 ہونے کی صورت بیان کی گئی ہے تاکہ ان کو سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ سکھانا تھا اخلاق اور سکھایا جاتا  
 علم ہدیت تو مطلب فوت ہوتا۔ اس لئے انکے پندار کے موافق الفاظ اختیار کئے گئے اسی  
 مضمون کو شاہ ولی اللہ صاحب نے فوز البکیر میں لکھا ہے "پس اگر برضلات طور ایشان ،  
 (عرب اول) گفته شود بجزرت در مانند و چیزے نا آشنا بگوش ایشان رسد و فهم ایشان را مشوش سازد"  
 اب اگر یہ کہا جائے کہ قرآن تو صرف عربوں کے لئے نہ تھا۔ تمام جہان کے لئے تھا دوسرے کیونکہ  
 سمجھیں تو کہا جاسکتا ہے کہ اول مقصود عرب کو سمجھانا تھا اور اس لئے صرف عربی زبان میں قرآن  
 اترا۔ دنیا کی سب زبانوں میں نہیں اترا۔ اور عربوں کے ذریعہ سے پھر تمام دنیا میں پھیلانا مقصود تھا  
 اب جہاں قرآن جائے گا وہاں کے لوگ سمجھ جائیں گے کہ قرآن میں بہت سی باتیں مخاطب یعنی

لہ دینک السماء ان تقع علی الارض۔ انجم آیت ۶۴۔

لہ فاذا انتقلت السماء فکانت درة کالدہان۔ رحمن ۷۳۔



عربوں کے پندار کے موافق کہی گئی ہیں۔ اگر کسی کی متعدد بیویاں ہوں اور اس سے کہا جائے کہ تم بیویوں کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہو یہ عیب ہے تو جتنے سننے والے ہیں سبق حاصل کریں گے اور سمجھیں گے کہ بیوی کی بدسلوکی بری شے ہے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ نصیحت صرف اس کے لئے تھی جسکی متعدد بیویاں ہوں میرے تو صرف ایک بیوی ہے میرے لئے بدسلوکی بری نہیں۔

قرآن کی سورہ نازعات میں ”انتم اشد خلقاً ام السماوات“ تم خلقت میں زیادہ مضبوط ہو یا آسمان۔ مضبوط ہونے سے ٹھوس ہونا مراد نہیں ہے۔ بلکہ کمال قدرت کا اظہار مراد ہے۔ خدا کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی تمام سرسبزی آسمان سے متعلق ہے۔ دھوپ نہ ہو۔ مینہ نہ برسے تو دنیا کا خاتمہ ہو جائے اور یہ دونوں چیزیں آسمان سے آتی ہیں یعنی نیلی چھت کی طرف سے۔ تو جس خدا نے آسمان بنا ڈالا پھر اسے انسان کا بنانا اس کا مارنا اور پھر بنانا عذاب و ثواب دینے کے لئے کیا مشکل ہے۔

سورہ بقرہ کی آیت ۲۰ ہے ”الذی جعل لکم الارض فراشاً و السماوات بناؤاً“ اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھوڑنا اور آسمان کو محل بنایا۔ آسمان بمقابلہ زمین کے ضرور محل کی صورت میں ہے۔ گنبد نیلیوں معلوم ہوتا ہے۔ آفتاب ماہتاب ستارے قندیلوں کی طرح لٹکے ہوئے ہیں محل سے یہ مراد لینا کہ وہ کسی سخت چیز سے ڈاٹ لگا کر جوڑا گیا ہے۔ اینٹ پتھر یا ستیشہ کا بنا ہوا ہے قرآن کا مفہوم نہیں ہے۔

دوسرے معنی سما کے فضائے محیط کے ہیں اور جو آیتیں اس قسم کی ہیں ان میں زائد بحثیں نہیں ہیں۔

فصلت ۱۱۰-۱۲ میں ہے ”پیدا کیا بلندی کو اور وہ دھواں دھار یعنی تاریک تھی اور کہا اس کو اور زمین کو حکم مانو خوشی سے یا ناخوشی سے دونوں نے کہا ہم نے حکم مانا خوشی سے پھر کر دیئے سات یا متعدد آسمان دو دن میں اور ڈال دیا ہر آسمان میں ان کا کام“  
دخان کا ترجمہ کسی نے کہا کیا ہے۔ کسی نے دھواں دھار کیا ہے اور کسی نے تاریک کیا ہے اور یہ سب معنی علمائے حال کے بھی خیالات کے موافق ہیں۔ فضائے محیط میں کواکب

لے ثم استوی الی السما و ہی دخان فقال لها وللارض امیاطوعا و کرہا قالنا اتینا طالمعین فقضین  
سبع سموات فی یومین و ادحی فی کل سمار امر یا۔



کی روشنی کے قبل تاریکی تھی۔ اس فضا نے محیط میں سیارے گھومتے ہیں۔ ان کے گھومنے کی حدیں مقرر ہیں۔ ہر ایک حد کو ایک جدا گانہ آسمانِ علیٰ قاعدہ سے کہہ سکتے ہیں۔ خدا نے کوکب بنا کر گردش دی اور ہر ایک کے مقام گردش کو ایک جدا آسمان قرار دیا۔ یہ علمائے حال کی رائیں ہیں اور قرآن اس کے خلاف معلوم نہیں ہوتا۔ فضا نے محیط کا خلائے محض ہونا یا اجزائے لطیف سے پر ہونا علماء میں متنازعہ فیہ ہے۔ لیکن مذہب اسلام کو اس سے بحث نہیں ہے کہ وہ خلائے محض ہے یا وہاں کوئی شے ہے لیکن ایسی لطیف کہ گردش کوکب میں مزاحم نہیں ہوتی۔ ہم کو صرف یہ دکھانا ہے کہ ایک ٹھوس جسم میں کوکب کا جڑا ہونا اور مع کوکب کے اس کا گھومنا جیسا کہ یونانی کہتے تھے اور جواب تحقیقات جدید سے باطل ثابت ہوا ہے قرآن میں مذکور نہیں ہے اس آیت میں استویٰ کے معنی ہم نے لکھے ہیں پیدا کیا اور اکثر مفسرین یہی معنی لیتے ہیں۔ ایک اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے خلائے ایک شے معدوم ہے تو اس سے خدا نے خطاب کیونکر کیا۔ لیکن یہ محض لفظی تکرار ہے۔ جو شے مقام گردش کوکب ہے اسے معدوم کس طرح کہہ سکتے ہیں وہ ضرور موجود مانا جائے گی۔ چاہے وہ خالی ہو یا بھری ہوئی ہو۔ اس قسم کی آیات میں بروج کا لفظ بھی آیا ہے۔ مثلاً۔

”بڑی برکت ہے اسکی جس نے آسمان میں بروج بناے اور اس میں چراغ اور چاند روشن کئے۔“

بروج کے معنی بعضوں نے کوکب کہے ہیں اور بروج والے آسمان کو لکھا ہے کوکب والا آسمان۔ اور بعضوں نے بروج سے منازل ثمر اور منازل سیارات مراد لے لی ہیں۔ اسی کے قریب قریب معنوں میں بارہ برج اہل تنجیم میں مشہور ہیں۔ بروج سے منارے اور طاق کسی طرح مراد نہیں ہو سکتے۔ اس قسم کی آیات میں کہیں کہیں آسمان کے دروازے بھی مذکور ہوئے ہیں۔ مثلاً۔

”نہ کھلیں گے ان پر دروازے آسمان کے۔“

یہاں دروازے سے مراد برکت آسمانی تفسیر کبیر میں لکھا ہوا ہے ان پر دروازے نہ کھلنے



کے یہ معنی ہیں کہ ان پر یعنی کافروں پر خیر و برکت نازل نہ ہوگی۔

تیسرے قسم کی وہ آیتیں ہیں جن میں آسمان ابر کے معنی میں بولا گیا ہے۔ مثلاً  
 • بھیجا ہم نے بادل کو دھڑلے سے برستا ہوا۔

اس قسم کی آیتوں میں کوئی آیت قابل بحث نہیں ہے۔ صرف ایک جگہ در و السماوات  
 الرجح ہے جس کا ترجمہ آسمان صاحب رجعت کر کے شاید آسمان کے گھومنے کا خیال بعضوں  
 نے پیدا کیا ہے اور یونانیوں کا آسمان سمجھا ہے۔ لیکن اس بارے میں مفسرین بہت صاف  
 ہیں۔ تفسیر کبیر میں رجح کے معنی مینحہ کے ہیں اور اس لئے عبارت مذکورہ بالا کا ترجمہ یہ ہوگا  
 • مینحہ والا بادل • علاوہ اس کے اور کئی معنی مفسروں نے لکھے ہیں لیکن یونانیوں کا آسمان  
 کسی معنی سے ثابت نہیں ہوتا۔

چوتھی قسم کی وہ آیتیں ہیں۔ جن میں سمار کی جمع سماوات مستعمل ہوئی ہے اس کے معنی کو ابر  
 کے ہیں۔ عرب کے محاورے میں ظرف سے منظروف مراد لینا بہت عام ہے۔ فضائے محیط ہیں  
 کو اکب پھرتے ہیں اس لئے فضائے محیط آسمان یا سمار بول کر اس سے کو اکب مراد لئے جا سکتے  
 ہیں۔ ان آیتوں سے ہم کو یہ دکھانا ہے کہ قرینہ بھی ایسے ہی امکان کا مقتضی ہے۔  
 سورہ ملک آیت ۳ میں ہے: الذی خلق سبع سموات طباقاً • ترجمہ • جس نے پیدا کیا  
 سات یا متعدد آسمانوں کو یا کو اکب کو تلے اوپر • اس میں ہر ایک لفظ بحث طلب ہے۔ آسمانوں  
 سے مراد کیا ہے۔ سات سے مراد کیا ہے اور تلے اوپر سے کیا مراد ہے۔ پہلے ہم یہ طے کرنا چاہتے  
 ہیں کہ آسمانوں سے کو اکب مراد ہیں کیونکہ اس کے بعد کی آیتیں اسی معنی کی موید ہیں۔ اس  
 کے بعد مذکور ہے۔

• خدا پیدا کرنے میں تو تفاوت نہیں دیکھے گا۔

پھر خدا کہتا ہے۔

• پھر اپنی نگاہیں کہیں کچھ خرابی تجھے دکھائی دیتی ہے۔

۱۔ درسلنا السمار علیہم مدرا را۔ النعام ۶۔

۲۔ ما تری فی خلق الرحمن من تفاوت۔

۳۔ فارجح البصر بل تری من فطور۔



پھر خدا کہتا ہے۔

”پھر پھیر اپنی نگاہ دوبارہ تیری نگاہ عاجز ہو کر اور تھک کر الٹ آئے گی۔“

ان آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ جن آسمانوں کا ذکر خدا نے پہلی آیت میں کیا ہے وہ انسان کے دیکھنے کی چیز ہے اور انسان کو صرف کو اکب نظر آتے ہیں اور کو اکب کے گھومنے کی جگہیں وہ شیشہ کی سی ہوں یا ہوا اور پانی کی سی ہوں یا خلائے محض ہوں کسی حالت میں انسان کے دیکھنے کی چیزیں نہیں۔ اس آیت میں تلے اوپر کا لفظ بھی زیر بحث ہے بعض اس کے معنی یونانی آسمان کی رعایت سے پیاز کے جھلکے کی طرح تہہ بہ تہہ سمجھتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ طباقاً یعنی اوپر تلے سے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ چھٹے ہوئے ہوں بلکہ یہ مطلب ہے کہ باہم متوازی ہوں۔ یعنی حالت حرکت میں ایک دوسرے سے ٹکرانہ جائیں۔ اب لفظ ”سات“ کا رہا۔ دیکھنے میں صرف سات ہی سیارے نظر آتے ہیں اور یہی زیادہ اہم بھی ہیں۔ اس لئے انھیں سات کا ذکر کیا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سات سے زائد نہیں ہیں۔ اور محاورہ کے مطابق لفظ سبعة جس کا ترجمہ سات ہے بمعنی متعدد بھی آتا ہے اگر اس آیت میں یہی ترجمہ اختیار کیا جائے تو پھر کوئی بحث پیدا نہیں ہوتی۔

سورہ بنی اسرائیل آیت ۱۰۱ میں ہے۔

”کیا نہیں دیکھا تم نے کہ جس اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا ہے وہ طاقت رکھتا ہے کہ ایسے ہی اور پیدا کرے۔“

اور دوسری جگہ سورہ نعبان آیت ۹ میں ہے۔

”پیدا کیا اللہ نے آسمانوں کو بغیر ستون کے کہ تم دیکھو ان کو۔“

ان میں تو صریح دیکھنے کا لفظ آسمانوں کے ساتھ ہے اور سوائے کو اکب کے جو

دکھائی دیتے ہیں دوسرے معنی ہو ہی نہیں سکتے اور اگر یہ کہا جائے کہ نیلی چھت جو دکھائی دیتی ہے اس کی طرف اشارہ ہے جب بھی ہمارا مقصد حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ مقصود

۱۔ ثم ارجع البصر کر تین تیقلب الیک البصر فاسأء و ہوجیر۔

۲۔ اولم یروا ان اللہ الذی خلق السموات والارض قادر علی ان یخلق مثلہم۔

۳۔ خلق السموات بغیر عمد تر و نہا۔



تو ہمارا صرف یہ ہے کہ یونانیوں کا آسمان خواہ مخواہ قرآن سے ثابت نہیں ہوتا۔  
سورہ نوح آیت ۱۵-۱۶ میں تو گویا صاف طور پر آسمان کے معنی کو اکب کے بتائے  
گئے۔

خدا کہتا ہے کہ ۱۔

تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے سات یا متعدد آسمانوں کو کس طرح تلے اور پیدا کیا ہے اور  
ان میں سے چاند کو لوزر اور سورج کو چراغ روشن بنایا ہے؟

ان میں سے ۲۔ صریح ظاہر ہے کہ چاند اور سورج بھی سموات میں داخل ہیں جس طرح دوسرے  
مقام پر خدا حضرت ابراہیم کی دعا کا ذکر کرتا ہے۔

۳۔ اے ہمارے پروردگار اٹھان میں ایک رسول اکھیں ہیں سے۔

یعنی ان ہی کی قوم میں سے ایک کو رسول بنا۔

واضح رہے کہ کہیں کہیں قرآن میں سموات صیغہ جمع کو مفرد کے معنی میں بھی بولتے ہیں  
انفخش کا قول ہے کہ سموات جنس ہے اور معنی مفرد بھی مستعمل ہوتا ہے۔ آیہ کریمہ "اولم يرالذي  
كفروا ان السموات والارض كانتا رتقا ففتقنهما" انبیا آیت ۳۔ کا ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحب نے  
یوں کیا ہے

• آیا نہ دیدند کافران کہ آسمانہا وزمین بستہ بودند پس واکردیم اینہارا  
اور حاشیہ پر لکھا ہے۔

• واکردن آسمانہا نازل کردن مطراست و واکردن زمین رویانیدن گیاه از دے  
اور شاہ عبد القادر نے اس کا ترجمہ یہ لکھا ہے۔

• کیا نہیں دیکھا ان منکروں نے کہ آسمان وزمین منہ بند تھے۔ پھر ہم نے ان کو کھولا  
اور حاشیہ پر لکھا ہے۔

• منہ بند تھے یعنی ایک چیز تھی۔ زمین سے کانیں اور نہریں اور سبزے بھانت بھانت  
نکلنے آسمان سے کئی ستارے ہر ایک کا گھر جدا اور مجال جدی۔

۱۔ الم ترکیف خلق اللہ سبع سموات طباقا و جعل القمر فیہن لوزا و جعل الشمس سراجا۔  
۲۔ ربنا و البعث فیہم رسولا منہم۔



اس سے ظاہر ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے آسمانوں کو بہ صیغہ واحد لیا اور اس کے معنی میں کے قرار دیئے اور مولوی عبدالقادر نے جمع کے معنی میں رکھے اور ان سے تارے مراد لئے۔ جمع کے معنی لینے میں بھی بادل کے معنی پیدا ہو سکتے ہیں کیونکہ بادل مختلف اقسام کے ہوتے ہیں اور ان کے ٹکڑے بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ بہر حال ابر کے معنی زیادہ چسپاں ہیں کہ زمین کی روئیدگی اور آسمان کی بارش کا ساتھ ہے اور اسی پر دنیا کے تمام کارخانے مبنی ہیں خدا انھیں کو دکھا کر اپنی قدرت یا دلاتا ہے۔ اس آیت میں بند رہنے اور کھولنے یعنی رتق و شق کا جو لفظ آیا ہے اس سے آسمان کا ٹھوس ہونا کسی طرح ضروری نہیں معلوم ہوتا۔



## فصل نمبر ۱۵

سحر (جادو)

ایک یورپین جج کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں ایک رزیل قوم کے دو شخص باہم لڑتے تھے۔ ایک کو دوسرے سے یہ شکایت تھی کہ اس نے اپنے گھر کا بھوت اس کے یہاں بھیج دیا ہے۔ جج نے پوچھا کہ بھوت کس ذریعہ سے گیا ہے۔ کہا گیا کہ ارد کے دانے پر جادو کے ذریعے سے بھوت مسلط کیا گیا اور وہ دانہ بھیجا گیا۔ ارد کا دانہ بھی پیش کیا گیا تھا۔ جج وہ دانہ منہ میں رکھ کر نگل گیا اور کہنے لگا تم لوگ جاؤ۔ بھوت کو ہم نگل گئے۔ پھر دونوں مخاصمین مطمئن ہو کر چلے گئے۔

یہ حکایت ہم نے اپنے ایک بوڑھے دوست سے سنی اور سننے کے بعد صرف اتنی ترمیم ذہن میں آئی کہ جج نے وہ دانہ فی الواقع کھایا نہ ہوگا۔ مخاصمین کو اپنا نگل جانا ہا در کر دیا ہوگا اور نظر بچا کر دانہ کو پھینک دیا ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی معاہدہ خیال گزرا کہ کیا ایسے اداہام باطل مسلمانوں کے یہاں مانے جاسکتے ہیں؟ ایک طرف تو یہ خیال تھا کہ جو قوم اعلیٰ درجہ کی ہندسہ کے ساتھ تمام عالم پر صدیوں تک حکمران رہ چکی ہے اس کے خیالات ایسے بودے ہرگز نہ ہوں گے۔ اور دوسری طرف یہ خیال کہ مسلمانوں میں جادو کا برحق ہونا مشہور ہے اور قرآن میں بھی سحر کا لفظ جا بجا آیا ہے یہ کیا راز ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی خیال گزرا کہ اگر خدا نے جادو گروں کو سب کچھ قدرت دے دی ہے تو پھر وہ قادر مطلق کہاں رہا۔ ان خیالات



نے مجھے تحقیق حق کی طرف مائل کیا اور بعد تحقیق کے جو کچھ میری سمجھ میں آیا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے سحر کے معنی کی ہیں نے تحقیق کی۔ عام طور پر جو کچھ اس کا مفہوم عوام میں سمجھا جاتا ہے۔ میں نے اس پر غور کیا اور اس کے علاوہ جتنی صورتیں قیاسات سے پیدا ہو سکتی ہیں سب پر نظر کی تو آٹھ صورتوں سے زیادہ پیدا نہیں ہوئیں ان میں سے بعض کا مانا جانا کچھ مضائقہ نہیں رکھتا اور بعض کا ماننا دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کا حکم رکھتا ہے۔

اول خود قوت نفس انسانی کبھی کبھی عجائبات دکھاتی ہے اور لوگ اسے جادو سمجھتے

ہیں۔ !

نفس انسانی کی قوت کو مشق اور مجاہدات سے بڑھا لینا ہر مذہب اور ہر قوم میں پایا جاتا ہے۔ اس قوت کے ذریعہ سے ایک شخص دوسرے پر اپنا اثر ڈال سکتا ہے اور دوسرے کے واہمہ کی مغلوبی اس اثر کو اس طرح قبول کرتی ہے کہ غیر موجودہ شے اسے موجود معلوم ہوتی ہے اس قسم کے اثر سے صحیح آدمی بیمار ہو جاتا ہے اور بیمار آدمی صحیح ہو جاتا ہے خواب مقناطیسی جس کو مسمریزم کہتے ہیں اور آجکل بہت دکھایا جاتا ہے اس کی شاخ ہے حکماء یونان کا علم اشراق بھی اسی قبیل سے تھا۔

دوم۔ جس یا نظر کی غلطی عجائبات روزگار : سامنے پیش کی جاتی ہے۔

اس قسم کی غلطیاں بہت ہو جاتی ہیں۔ رات کو ایک چیز دیو نظر آئی۔ آنکھ کان اور ناک دکھائی دیئے بڑے بڑے دانت کھولے ہوئے وہ شے ہم پر پھپٹی اور ہم سہم گئے۔ لیکن جب قریب سے ٹولا تو دو ہاتھ کی لکڑی کو نے میں کھڑی ہوئی نظر آئی۔ کبھی کبھی دن کو بھی ایک چیز ہمارے واہمہ میں گزری لیکن فی الواقع وہ کوئی شے نہ تھی پہلے ہی نظر کی غلطی تھی۔ علم مناظر میں آنکھ کا غلطی کرنا بہت اچھی طرح سے عالموں نے بیان کیا ہے اسی نظر کی غلطی سے فائدہ اٹھانے کے لئے بھانمتی کا تماشا کرنے والے گولیاں اڑاتے ہیں کوئی سے ایک بٹہ میں رکھی اور دوسرے بٹے سے نکال دی اور جب کبھی وہ قوت نفس بھی صرف کر سکے اور اس دوسری قسم کے ساتھ پہلی قسم بھی مل گئی تو نہایت کامیابی سے ان کا تماشا ہوتا ہے۔

سوم۔ علم و فن کی کاریگریاں بھی نادائقوں کے لئے جادو ہوتی ہیں۔

علم و فن کے ذریعہ سے ہر قرن میں کچھ نہ کچھ باتیں ایجاد ہوئی ہیں اور ایک ایجاد نادائقوں



کے لئے شروع شروع جادو ضرور تھی۔ جن لوگوں نے یورپ کی صنایعیاں نہیں دیکھیں اگر وہ جنوبی امریکہ یا وسط افریقہ سے لاکر لندن کے بازار میں کھڑے کر دیئے جائیں تو گھڑی کا بجنا۔ خود بخود برقی روشنی کا ہو جانا۔ دیا سلائی سے سگرٹ جلانا۔ ہائیکل پر لوگوں کا بھاگتے ہوئے چلے جانا۔ بھاپ سے زمین کے اندر ہی اندر ریل کا دوڑنا یہ سب باتیں ان کے نزدیک اسی طرح جادو سمجھی جائیں گی جس طرح رابنسن کر و سو کا بندوق سے شکار کرنا فرائد نے جادو سے مارنا سمجھا تھا۔ آجکل یورپ میں لڑکوں کے کھلونے اکثر ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ وحشی انسانوں میں اچانک رکھ دیئے جائیں تو وہ ان کو جادو کا پتلا سمجھیں گے۔

چہارم۔ خاصیت اشیا کی ناواقفیت سے بھی بہت سی چیزیں جادو معلوم ہوتی ہیں۔ خاصیت اشیا جاننے سے بھی بہت سے عجائبات معلوم ہوتے ہیں اور یہ ایک طور پر چوتھی قسم میں بھی داخل ہو سکتا ہے کیونکہ خاصیت اشیا کا جاننا علم پر موقوف ہے مثلاً اگر دو قسم کی ہوائیں، الگ الگ بوتلوں میں بھر کر ان بوتلوں کے منہ ملا دیئے جائیں تو اس زمانے کے بڑے بڑے ہوشیار شخص جو کیمسٹری نہیں جانتے ان بوتلوں سے پانی گرنے کو جادو سمجھیں گے۔

پنجم زبان میں بھی جادو ہے۔

جھوٹ سچ ادھر کی ادھر لگا دی۔ دو شخصوں میں لڑائی ہونے لگی۔ جن کو اس میں مشاقی ہے ان کے نزدیک زن و شو میں لڑائی کر دینا۔ بھائیوں میں نفاق ڈال دینا باپ بیٹوں میں دشمنی کر دینا کوئی بات نہیں ہے۔

ششم۔ ستاروں کی تسخیر کا عمل جاننا۔

بعضوں کا خیال ہے کہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں وہ ستاروں کے اثر سے قائم ہیں ان میں سے کوئی ستاروں کو واجب الوجود جانتا ہے اور کوئی زمین اور واجب الوجود کے درمیان میں ستاروں کو واسطہ سمجھتا ہے اور کسی کا یہ خیال ہے کہ مثل انسان کے اخلاک بھی خود مختار جانداری ہیں اور دنیا پر ان کو پورا قابو ہے ان تینوں قسم کے عقیدے والے کو اکب کی تسخیر کے عمل پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں اور وہ نہیں تو ان کے معتقدین ضرور سمجھتے ہیں کہ جب انھوں نے کسی طرف اشارہ کر کے مثلاً "اقتل یا مریخ" کہا تو مریخ اسے ضرور قتل کر ڈالے گا۔

ہفتم ارواح کا قابو میں رکھنا۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ دنیا میں ابھی اور بری روحیں پھرا کرتی ہیں اور کبھی کبھی



مرنے ہوئے انسانوں کی روہیں بھی ان میں شامل ہو جاتی ہیں۔ جن، پری، بھوت، چڑیل، پریت سب ان میں شامل ہیں۔ اور لوگ سمجھتے ہیں کہ ان روہوں کو مختلف اشکال کے قبول کرنے کی قوت ہے اور ان روہوں کو پڑھنت کے ذریعہ سے قابو میں کر لینا ایک قسم کی جادوگری ہے۔ مشہور ہے کہ ان روہوں کو علوی یا سفلی عملوں کے ذریعہ تابع کرنے والے ان سے اپنی مرضی کے موافق اچھے برے کام لے سکتے ہیں۔

ہشتم۔ تاثیر اسما۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اسما پر موکل مقرر ہیں۔ اسما کا عمل جاننے والے موکلوں پر قابو پالیتے ہیں اور پھر تمام مشکل باتیں ان کے لئے آسان ہو جاتی ہیں۔ اسما کچھ اچھے ہیں اور کچھ برے ہیں اور ان کے جاننے والے بھی علوی یا سفلی عالموں کی طرح گروہوں پر منقسم ہیں یہ آٹھ قسمیں جادو کی ہوئیں۔ ان میں سے اول پانچ کے برحق ہونے کا عقیدہ ہر سمجھ دار آدمی کو رکھنا چاہیے۔ باقی رہیں تین قسمیں یعنی کواکب، ارواح یا اسما کی تسخیر سے عجائبات کا کرشمہ دکھانا یہ کسی ذی علم اور مہذب قوم کے نزدیک کبھی صحیح نہیں سمجھا گیا اور نہ اب سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کے تذکرے تمام دنیا میں ہیں۔ ہر قوم میں زمانہ نامعلوم سے اس کا چرچا چلا آتا ہے اور اب بھی اس کا وجود ہے لیکن ہمیشہ جہلا میں یہ باتیں زیادہ تر مقبول ہوئی ہیں۔ اور قوم منکوب میں زیادہ تر اس کا چرچا سنا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں بھی مثل دیگر اقوام کے اب اس کا چرچا ہے۔ لیکن ابتدائے اسلام میں ہرگز یہ اعتقادات مسلمانوں میں نہ تھے اور نہ زمانہ مابعد کے مستند علما کی کتابوں میں کہیں اس کا پتہ چلتا ہے۔

اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ قرآن میں ان تینوں اقسام کے جادو کی نسبت کیا ہے۔ تمام قرآن کی آیتوں پر بغور نظر ڈالنے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن میں اگر کوئی جادو صحیح مانا گیا ہے تو وہ پہلی قسم کے جادو سے تعلق رکھتا ہے اور اس لئے قرآن کی آیتوں سے بحث کرنے سے قبل پہلے قسم کے جادو کی مزید توضیح ضروری ہے۔

نفس انسانی میں ایک ایسی قوت برقی اور مقناطیسی موجود ہے جو خود اس پر اور اسکے خیال پر اور نیردوسروں کے خیال پر اثر کرتی ہے۔ یہ اثر بہت معمولی ہے۔ کسی کو رنج پہنچا دہ پڑ مردہ ہو گیا۔ بیمار ہو گیا یا مر گیا یا کوئی خوش ہوا امر واقعی کی وجہ سے ہو یا غیر واقعی کی وجہ سے ہو تو فوراً بشاش ہو گیا اور بدن میں توانائی آگئی۔ یہ قوت نفس ہی کا اثر ہے کہ خود اپنا اثر اپنے



اپنے اوپر پڑتا ہے اور جاگنے ہی میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ سونے میں اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے جب نیند نے قوائے جسمانی کو کمزور کیا تو قوت نفس کا اثر اور زیادہ ہو گیا اچھے اور برے خواب نظر آنے لگے۔ اچھے خواب سے آدمی خوش ہوتا ہے اور برے خواب سے رنجیدہ ہوتا ہے۔ خواب میں آدمی عجائبات کی سیر کرتا ہے۔ روتا ہے۔ ہنستا ہے کبھی کبھی خواب میں سمجھتا ہے کہ اس پر برسین گزر گئیں اور حالانکہ وہ گھنٹہ بھر بھی نہیں سویا۔ خواب میں سفر کرتا ہے لڑائی لڑتا ہے۔ پانی میں تیرتا ہے چار پائی پر پڑا ہوا منہ سے چادر لپیٹے ہوئے یہ سب کچھ کراتا ہے۔ یہ سب نتیجہ ہے اس کا کہ قوت نفس خود اپنے آپ پر اثر ڈالتی ہے اور اسی وجہ سے کبھی کبھی انسان سچے خواب بھی دیکھتا ہے اور خود میں جتنی ہی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے اتنے ہی زیادہ سچے خواب نظر آتے ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک کی قوت نفس کا دوسرے پر اثر پڑتا ہے۔ ایسا بھی بہت ہوتا ہے۔ کسی کو تیور بدل کر دیکھو تو وہ رنجیدہ ہو جائے گا۔ ادب سے اس کے سامنے کھڑے ہو کر اظہارِ تعظیم کرو تو وہ خوش ہو جائے گا کسی کی طرف لکڑی اٹھا کر دوڑو تو وہ ڈر کر بھاگ جائے گا یا غصہ سے اس کا منہ سرخ ہو جائے گا۔ چکارنے سے بچے خوش ہو کر دوڑے ہوئے چلے آتے ہیں۔ ڈانٹنے سے بھاگ جاتے ہیں حتیٰ کہ جانوروں پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے کوئی اپنے کتے کے سامنے سیٹی بجائے تو کتا دم اٹھا کر کودنے لگتا ہے یہ سب مثالیں ہیں ایک قوت نفس کی دوسرے پر اثر کرنے کی۔

علاوہ ان معمولی باتوں کے چند غیر معمولی صورتیں بھی قوت نفس کی ہیں جب کسی میں قوت نفس خلقتاً زیادہ مخلوق ہوتی ہے یا مجاہدات اور ریاضت سے بڑھ جاتی ہے تو غیر معمولی باتیں اس سے ظہور میں آتی ہیں اور لوگوں کو تعجب میں ڈالتی ہیں۔ مشہور ہے کہ یونان کے اشرافین ایک جگہ بیٹھے ہوئے دور دور کا حال معلوم کر لیتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو اور خود انکی قوت نفس ان پر اثر ڈالتی ہو۔ صوفیان کرام کا مراقبہ بھی اس کے قریب قریب ہوتا ہے ممکن کا لفظ ہم اس لئے کہتے ہیں کہ نہ ہمیں یہ کمال ہے اور نہ قرآن میں اس کے باور کرنے کی ہدایت ہوئی ہے۔ لیکن برابر ایسا سنا جاتا ہے اور عقل کے خلاف معلوم نہیں ہوتا۔ . . . آج کل مسمریزم کا چرچا بہت ہے معمول پر اپنی قوت نفس کا اثر عامل ڈال دیتا ہے اور معمول تمام باتیں جو عامل چاہتا ہے بولتا چلا جاتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جو عامل کہتا ہی وہی



معمول کو نظر آتا ہے۔ خود اپنے آپ پر اپنی قوت نفس کا اثر ہونا حالت شوق یا خوف میں بار بار دیکھا گیا ہے جب کسی شے کے انتظار میں کھڑے ہوتے ہیں تو بار بار اس شے کی صورت سامنے آ جاتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔ عید کا چاند دیکھنے والوں کو اس کا تجربہ بہت دفعہ ہو چکا ہوگا۔ رات کو اور کبھی کبھی دن کو بھی اس جگہ پر جو ارواح خبیثہ کا مسکن سمجھا جاتا ہے ڈراوٹی صورتیں صنیعت الاعتقادوں کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں جس کو وہ سمجھتے پریت سمجھتے ہیں۔ لیکن علماء کے نزدیک وہ نظر کے دھوکے سے زیادہ اور کوئی شے نہیں ہے اور نظر کا دھوکہ ان حالتوں میں ایک شاخ ہے خود اپنے آپ پر قوت نفس کا اثر ہونے کی۔

قرآن میں دو مقام پر سحر کا ذکر آیا ہے ایک تو وہاں جہاں فرعون کے ساحروں سے حضرت موسیٰ کا مقابلہ ہوا۔ اور دوسری جگہ ہاروت و ماروت کے سحر کا ذکر ہے اور تیسرا موقع یہ ہے کہ کفار جب پیغمبروں سے کوئی بات عجیب دیکھتے تھے تو پیغمبروں کو کہا کرتے تھے کہ یہ ساحر ہیں۔ یہ تیسری صورت بہت صاف ہے۔ پیغمبروں کو کفار ساحر اور مسحور کہتے تھے۔ مسلمان ایسا نہیں کہتے تھے اور نہ خدا کہتا ہے۔ ساحر سے کفار مراد لیتے تھے نظر بند کرنے والے جس طرح یہاں مداری تماشاکرتے ہیں اور ایک شے کی گولی دوسرے میں دکھاتے ہیں عوام میں انکی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ محض وہ تماشہ گر سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح مصر اور شام میں بہت سے لوگ پہلے سے تھے۔ پیغمبر کی عمدہ باتوں کے سمجھنے کی تو کفار میں شروع شروع قابلیت نہیں ہوتی تھی یا ہوتی تھی تو وہ دھیان نہیں کرتے تھے اور جب کبھی کوئی عجیب بات دیکھنے میں آتی تو کہتے تھے کہ یہ جادو گر ہے۔ مثلاً سورہ اسراء میں ہے: "کافر آپس میں کہتے ہیں کہ تم محمد کی پیروی کرتے ہو جو جادو کیا ہوا آدمی ہے" اور دوسری جگہ اسی سورہ میں ہے: "فرعون نے موسیٰ سے کہا کہ موسیٰ میں پوچھتا ہوں کہ تم پر جادو کیا گیا ہے۔ زیادہ وضاحت کے لئے قصص قرآنی فصل ۵۳ پڑھیے۔"

اب حضرت موسیٰ اور فرعون کے معرکوں میں جو لفظ سحر جادو کا استعمال کیا گیا ہے اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ فرعون کے ساحروں سے حضرت موسیٰ کا مقابلہ کئی جگہ بیان کیا گیا ہے۔ سورہ طہ میں بیان ہے کہ حضرت موسیٰ جب آگ کے پاس گئے تو وہ پکارے گئے اور ایک خدائے واحد کی عبادت کا ان کو حکم ملا اور وحی سے القا ہوا کہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے۔ موسیٰ نے کہا کہ میری لاشھی ہے جو کوٹیک لیتا ہوں اور بیہڑوں کو بھی اس سے ہنکاتا ہوں اور دوسرے کاموں میں بھی لاتا ہوں۔ پھر وہی سے القا ہوا کہ موسیٰ اس کو سچینک دے۔ پھر موسیٰ نے اسے



پھینک دیا تو وہ دفعتاً چلتا ہوا سانپ تھا پھر وہی سے القا ہوا اسے پکڑنے نہ ڈر ہم پھر اسے پہلے ہی سا کر دیں گے۔

سورہ نمل میں مذکور ہے کہ جب موسیٰ آگ کے پاس پہنچے تو ان سے کہا گیا کہ جو کچھ آگ میں اور آگ کے گرد ہے ہم نے اس کو برکت دی ہے۔ اللہ پاک تمام عالموں کا پروردگار ہے اتے موسیٰ بے شک میں خدا ہوں سب پر غالب حکمت والا اس کے بعد وحی سے موسیٰ کو القا ہوا کہ اپنی لاکھی پھینک دے۔ پھر اسخوں نے دیکھا کہ وہ سانپ کی طرح ہلتی ہے تو پیٹھ پھیر کر پیچھے پلٹے اور پھر پلٹ کر رخ نہ کیا۔ القا ہوا۔ موسیٰ نہ ڈر میرے پاس پیغمبر نہیں ڈرتے۔

ان آیتوں پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہے کہ لاکھی سانپ نہیں ہو گئی تھی۔ بلکہ وہ سانپ دکھائی دی تھی۔ ان آیات میں پھر پہلے سا کر دیں گے (سعد ہا سیر تھا لادلی) اور سانپ کی طرح سے۔ (کا نہا جان) ظاہر کرتا ہے کہ لکڑی کی ماہیت نہیں بدلی تھی بلکہ لکڑی اپنی اصلی حالت پر تھی اور اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ حضرت موسیٰ پر جو کیفیت طاری ہوئی وہ اسی قوت نفس انسانی کا اثر تھا جس کا اثر خود اپنر ہوا۔

اس کے بعد کے حالات میں دکھایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ کی قوت نفس کا اثر دوسروں پر پڑا حضرت موسیٰ اپنی لاکھی لئے ہوئے فرعون کے پاس آئے اور فرعون کو حضرت موسیٰ کی لاکھی، سانپ معلوم ہوئی۔ لیکن فرعون کے دل میں کچھ عظمت حضرت موسیٰ کی قائم نہیں ہوئی وہ حضرت موسیٰ کو ساحر سمجھا اور دوسرے ساحروں کو جن کو ہم اپنے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ ڈھٹ بند تھے اس نے طلب کیا۔ ان ساحروں نے جب اپنی قوت نفس کا اثر ڈالا تو انکی لاکھیاں اور ریاں سب کو سانپ نظر آئیں۔ پھر حضرت موسیٰ نے جو اپنی لاکھی ڈالی تو لوگوں کو ایسا معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ کی لاکھی اثر دھا بن کر ان سانپوں کو کھا گئی اس پر بھی فرعون ایمان نہ لایا بلکہ اس نے حضرت موسیٰ کو تمام جادو گروں کا استاد یعنی ایک بڑا جادو گر قرار دیا۔ قرآن میں جا بجا ان واقعات کے بیان کرنے کا صرف یہ مطلب ہے کہ لوگ معجزات کی فرمائش آنحضرت سے نہ کریں بلکہ آنحضرت کے اقوال اور افعال کی خوبیاں سمجھ کر ایمان لائیں۔ لوگ آنحضرت سے معجزات کی فرمائش کرتے تھے اس کے جواب میں یہ ارشاد ہوتا تھا کہ گذشتہ پیغمبروں کے معجزے دیکھ کر کب انکی امتیں ان کو رسول خدا سمجھی تھیں کہ آنحضرت محمد انکی تقلید کریں۔

حضرت موسیٰ اور ساحران فرعون کا ذکر سورہ یونس میں ہے۔



جب فرعون کے ساحر آگئے تو حضرت موسیٰ نے ان سے کہا کہ ڈالو تم کیا ڈالتے ہو تب انہوں نے ڈال دیا۔ تب موسیٰ نے کہا جو کچھ تم نے کیا جا دو ہے اللہ ابھی اس کو جھوٹ کر دے گا اللہ مفسدوں کا کام درست نہیں رکھتا۔

پھر سورہ شعرا میں مذکور ہے۔

موسیٰ نے فرعون کے ساحروں سے کہا کہ ڈالو تم کیا ڈالتے ہو پھر انہوں نے اپنی رسیاں اور لاشیاں ڈال دیں اور پکارا اٹھے کہ فرعون کی جے ہم ہی موسیٰ پر غالب ہوں گے پھر حضرت موسیٰ نے اپنی لاشی ڈالی تو وہ یکایک ان سب کو نکلنے لگی جن کو فرعون کے ساحروں نے دھوکا بنایا تھا۔

سورہ اعراف میں یوں مذکور ہے۔

فرعون کے ساحروں نے کہا کہ موسیٰ تم ڈالو یا ہم ڈالیں۔ موسیٰ نے کہا کہ تم ڈالو پھر جب انہوں نے ڈالا تو جا دو کر دیا انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر اور ڈرا دیا لوگوں کو اور بڑا جا دو کیا۔ القا کیا ہم نے موسیٰ کو کہا کہ تو بھی ڈال دے اپنی لاشی پھر یکایک وہ نکلنے لگی اس دھوکے کو جو انہوں نے بنایا تھا۔

سورہ طہ میں یوں مذکور ہے۔

فرعون کے ساحروں نے کہا کہ موسیٰ تم ڈالو نہیں تو ہم ڈالتے ہیں۔ موسیٰ نے کہا کہ وہاں تم ڈالو۔ پھر یکایک ان کی رسیوں اور انکی لاشیوں کی طرف موسیٰ نے خیال کیا کہ ان کے جا دو کے سبب سے چلتی ہیں پھر موسیٰ کے جی میں ڈر سا ہوا تو ہم نے القا کیا کہ مت ڈر تو ہی ان پر غالب ہے اور ڈال دے جو تیرے داہنے ہاتھ میں ہے تاکہ نکل جاوے جو کچھ

لہ فلما جار السحرة قال لهم موسى القوا ما انتم ملقون فلما القوا قال موسى اما جتم به السحر ان اللہ سبیدالہ ان اللہ لا یصلح عمل المفسدین۔

لہ قال لهم موسى القوا ما انتم ملقون فالتوا جا لهم وعصیہم وقالوا لفرعون انا نحن الغالبون فالتقى موسى عصاه فاذا ہی تلقف ما یافکون۔

لہ قالوا یا موسى امان ان تلقی واما ان تکون نحن الملقین قال القوا فلما القوا سحر ولا عین الناس واستر بہم وجاؤ بسحر عظیم وادجنالی موسى ان الق عصک فاذا ہی تلقف ما یافکون۔



کہ انھوں نے بنایا ہے کہ وہ جادوگروں کا مکر ہے اور جادوگر کو فلاح نہیں ہے جہاں جاوے۔  
 سورہ اعراف میں جو عبارت ہے، جادوگر دیا لوگوں کی آنکھوں پر، وہ ترجمہ ہے: سحر و اعراف  
 الناس کا: اس کا ترجمہ بجائے آنکھوں پر جادو کرنے کے ڈھٹ بند کرنا کیا جائے تو محاذ و اور  
 صورت واقعہ کے بالکل موافق ہوگا اور اسی ایک لفظ سے وہ تمام باتیں سمجھ میں آجائیں گی جن کو  
 ہم شروع سے کہتے چلے آتے ہیں اسی سے یہ بھی قریب ہے کہ حضرت موسیٰ کی لاکھی بھی دوسروں  
 کو سانپ معلوم ہوئی تھی وہ فی الواقع سانپ نہیں ہو جاتی تھی کیونکہ جب وہ لاکھی اٹھالی جاتی  
 تھی تو پھر لاکھی کی لاکھی رہ جاتی تھی۔ جب تک کسی کی تمام قوتیں غیر معمولی طور پر درجہ کمال کو نہ پہنچیں  
 وہ پیغمبر نہیں ہو سکتا اس لئے حضرت موسیٰ کی قوت نفس ساحروں کی قوت نفس سے بہت  
 زیادہ قوی تھی اور جب حضرت موسیٰ نے اس سے کام لیا تو ساحروں کی قوت نفس ہوا ہو گئی۔  
 دوسرا قصہ جس میں ہاروت و ماروت کے سحر کا بیان ہے وہ سورہ بقرہ میں ہے خدا تعالیٰ  
 یہودیوں کی بے اعتقادیوں اور فحشیاں بیان کرنے کے اُسے ذیل میں فرماتا ہے۔

جب ان کے پاس خدا کی طرف سے رسول آیا اور اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے تصدیق  
 بھی کرتا ہے تو اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے خدا کی کتاب تو راقہ اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دی ہے  
 کہ گویا وہ اسے جانتے ہی نہیں اور ان ڈھکوسلوں کے پیچھے پڑ گئے ہیں جنکو شیطان یعنی کفار حضرت  
 سلیمان کے وقت میں پھنسا پڑھا کرتے تھے۔ حالانکہ سلیمان سے کفر کی حرکت سرزد نہیں ہوئی شیطان  
 یعنی کافروں نے کفر کیا تھا کہ لوگوں کو سحر سکھاتے تھے اور اسی گروہ نے اس چیز کی پیروی کی جسکو  
 وہ اپنے زعم میں سمجھتے تھے کہ وہ دو فرشتوں پر جن کا نام ہاروت اور ماروت ہے اتاری گئی  
 ہے بابل میں۔ اور وہ فرشتے کسی کو کچھ بتاتے نہ تھے جب تک کہ اس سے یہ نہ کہہ لیتے تھے کہ  
 ہم تو فتنہ ہیں تم کہیں کافر نہ ہو جانا۔ اس پر بھی ان سے لوگ ایسی باتیں سیکھتے تھے جن کی وجہ سے  
 میاں بیوی میں جدائی کرادیں۔ حالانکہ بے حکم خدا کے وہ ان باتوں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا  
 سکتے تھے غرض کہ یہ لوگ ان سے ایسی باتیں سیکھتے تھے جن سے خود انھیں کو نقصان پہنچتا تھا اور  
 کسی طرح فائدہ نہیں پہنچتا تھا۔

لما جاءہم رسول من عند اللہ صدق ما معہم نبذ فریق من الذین ادتوا الکتب کتب اللہ ورا ظہورہم کاہنم لا  
 یعلمون وابتغوا ما تلو الشیطن علی ملک سلیم و ما کفر سلیم و لکن الشیطن کفر و العیون الناس السحر و ما انزل علی  
 الملکین بابل ہاروت و ماروت و ما یعلمن من احد حتی یقولوا انما نحن فتنۃ فلا تکفروا باقی صفحہ ۱۸۶ پر



اس آیت میں بے شک بقیہ تین اقسام کے جادو کا ذکر ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو اس کے معتقد ہونے سے ممانعت کی گئی ہے۔ اس آیت کا مطلب بیان کرنے سے قبل ہم شان نزول اور حالت ملک بیان کرتے ہیں۔ ایک زمانہ بنی اسرائیل کا ایسا تھا کہ تمام دنیا میں وہ علم و فضل اور قوت کے اعتبار سے بڑے سمجھے جاتے تھے اور اسی زمانے میں حضرت سلیمان پیغمبر مبعوث ہوئے جو پیغمبر بھی تھے اور بادشاہ بھی تھے۔ اس کے بعد بنی اسرائیل گتے گئے اور بالآخر پیغمبر خدا محمد کے زمانے میں انکی وہی حالت تھی جو ہندوستان میں مسلمانوں کی تیرہ صدی میں تھی اور اب بھی ہے کہ ان میں اچھی باتیں بہت کم ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی طرح بعثت رسول کے زمانے کے یہودی فالنامے، تعبیر نامے، تعویذ، گنڈے، فلیتے، نقش، عملیات اور حاضرات کے ناجائز ڈھکوسلے بہت سے کرتے تھے۔ جب کسی قوم میں عروج کے بعد زوال آتا ہے تو انکی حالت آخری ایسی ہی ہوتی ہے جس طرح ہندوستان کے مسلمان قرآن کے احکام کی پیروی نہیں کرتے اور لغویات میں بہت جی لگاتے ہیں۔ اسی طرح یہودیوں نے توراہ کو کپڑے میں باندھ کر کنارے رکھ دی تھی اور لغویات میں پھنسے تھے اور ان لغویات کو کہتے تھے کہ حضرت سلیمان نے لوگوں کو تعلیم کیا ہے۔ جیسا کہ اس زمانے میں لوگ بہت سے عملیات کو صحابہؓ اور پیغمبرؐ خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ بعد حضرت سلیمان کے جب قوم پر نکتہ آئی اور تمام ملک میں نکتہ پھیلی اس زمانے میں دو شخص ہاروت و ماروت غالباً عراق عجم کی طرف ایسے ہوئے جیسے ہندوستان میں آجکل پیر جی جا بجا پھرتے ہیں لوگ ان کو باعتبار انکی کم سمجھنی اور تواضع اور انکسار کے فرشتہ خصلت کہتے تھے۔ دعا۔ تعویذ۔ فالنامہ پر ان کا گزر ہوتا ہے نیکی کی وجہ سے وہ مرجع خلایق ہوتے ہیں اور ان بزرگوں کی یہ کیفیت ہے کہ باوجود اس ظاہری زہد و تقویٰ کے چور کو چوری کے لئے بھی ساعت اچھی بنا دیتے ہیں۔ اس وقت بڑے سے بڑے بزرگ کے پاس جائیے اور دو روپے سامنے رکھ کر ہاتھ جوڑیے اور کہیے شاہ جی حب کا تعویذ لکھ دیجئے تو وہ فوراً قلم اور دوات اٹھا کر لکھ دیں گے اور ذرا تاخیر نہ کریں گے اگر تاخیر کریں گے تو روپے کے ساتھ مرغ کا گوشت بھی کھانا چاہیں گے اور کہیں گے کہ مرغ کا خون ہوتا تو اسکی تخریر زیادہ موثر

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) قیتعلمون منہا ما یفرقون بہ بین المرود و وجہ ماہم بضاریر بہ من اجلالا باذن اللہ و یعلمون ما یفرقون  
ولای نفعہم۔



ہوتی۔ اب شاہ صاحب مذہبی تقدس سے کچھ کہیں گے تو دبی زبان سے صرف یہی کہیں گے کہ بھائی عذاب و ثواب تمہاری گردن پر ہے میں لکھے دیتا ہوں۔ مگر کھل کر کبھی انکار نہ کریں گے اور نہ ڈانٹ کر یہ کہیں گے کہ "دوسروں کی بہو بیٹی نکلوانے کے لئے میں کٹنا نہیں ہوں کہ تعویذ لکھوں۔ جادو ہو"۔ ممکن ہے کہ اسی قسم کے دو مشہور پیر زادے ہاروت اور ماروت اگلے زمانے میں گزرے ہوں اور یہودی اپنے افعال کی سند میں حضرت سلیمان ہاروت و ماروت کا نام لیتے ہوں۔ جب یہودیوں نے پیغمبر خدا کا کہنا نہیں سنا اور پیغمبر خدا نے تورات کا حوالہ دیا تو اسپر بھی دھیان نہیں کیا اور اپنے دکھوسلوں کے سامنے اس کو بھی بے وقعت قرار دیا۔ اس وقت یہ آیت اتری۔ اب آیت کے معنی بہت صاف سمجھ میں آ جائیں گے۔ یعنی جب ان یہودیوں کی طرف خدا کے رسول آنحضرت محمدؐ آئے جو تورات کی بھی تہد لق کرتے ہیں تو بعض اہل کتاب نے تورات سے آنکھیں بند کر کے قرآن کی تکذیب کی۔ اگر وہ تورات کو دیکھتے تو جانتے کہ قرآن میں وہی باتیں نصیحت اور نہی کی ہیں جو تورات میں ہیں۔ لیکن وہ تو بجائے تورات دیکھنے کے وہ چیز دیکھتے ہیں جو کفار دیکھتے تھے یعنی عملیات اور حضرات وغیرہ اور کہتے ہیں کہ سلیمان نے یہ چیزیں بنائی ہیں۔ حالانکہ سلیمان کو ان چیزوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ سلیمان کے وقت کے کفار البتہ ان لغویات کے عامل تھے اور لوگوں کو یہ لغویات سکھاتے تھے اور یہود کہتے ہیں کہ یہ عملیات تو ہاروت ماروت جیسے فرشتہ خصمت انسانوں کے بھی زیر عمل تھی اس میں شبہ نہیں کہ ہاروت و ماروت ایسا کرتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہہ دیا کرتے تھے کہ یہ برا کام ہے اور ہم برا کرتے ہیں بے شک لوگ ان دونوں سے یہ برائیاں سیکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ برائیاں کچھ کارآمد ہیں یعنی اگر چاہیں گے تو میاں بیوی میں اس کے ذریعے سے لڑائی کرادیں گے یا اور خرابیاں اپنی خواہش کے مطابق پیدا کر سکیں گے لیکن وہ بھی خرابی پیدا نہیں کر سکتے تھے اگر کچھ ہو جاتا تھا تو خدا کے حکم سے ہوتا تھا۔ اگر کوئی عمل کیا جائے تو خواہ مخواہ عمل کرنے والے کے موافق ہو گا یا مخالف ہو گا وہی صورتیں ہیں اگر موافق ہو تو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس عمل کی تاثیر سے ہوا بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ عمل نہ پڑھا جاتا جب بھی ایسا ہی ہوتا۔ اب ناظرین خود سمجھ لیں کہ قرآن میں سحر کی تکذیب کی گئی ہے یا تائید کی گئی ہے۔

اس میں چند باتیں غور طلب ہیں ایک یہ کہ قرآن میں لفظ شیاطین کا ہے جس کے معنی بعضوں نے شیطان کو بمعنی شیطان لیا ہے اور یہ معنی سمجھتے ہیں کہ جنات شیطان۔ دیو۔ پری جلاو



کے سکھانے والے ہیں۔ جس طرح پیغمبر تو خید سکھاتے پھرتے ہیں ویسے ہی شیطان آدمی کا بھیس بدل کر جادو سکھاتے پھرتے ہیں۔ ان معنوں میں ذرا سا فرق ہے اگر یہ معنی لیں کہ انسان شیطانی حرکات اختیار کر کے جادو سکھاتے ہیں تو ٹھیک ہے اور اسی رعایت سے ہم نے شیاطین کا ترجمہ کفار کیا ہے۔ دوسرا لفظ ملکین کا قرآن میں ہے جن کے معنی ہیں دو فرشتے اور ہم نے اس مراد لئے ہیں دو فرشتہ خصدت انسان اور فرشتہ خصدت بھی واقعی طور پر نہیں بلکہ اس وقت کے لوگوں کے خیال کے مطابق یہ معنی اچھے معلوم ہوتے ہیں ورنہ ہمارا مطلب یوں بھی حاصل ہو سکتا ہے کہ لام کو زیر کے ساتھ پڑھیں (ملکین) اور اس وقت اس کے معنی ہو جائیں گے دو بادشاہ بہت سے قرار ایسا ہی پڑھتے ہیں اور اس قرت پر بہت سے مفکرین نے ہاروت و ماروت کو دو بادشاہ مانا ہے۔ واللہ عالم بالصواب۔

قرآن میں سورہ نلق میں ہے "گر ہوں میں پھونکنے والی عورتوں کی برائی سے" دمن شر النساء فی العقول یہاں گر ہوں میں پھونکنے والی عورتیں ان کچھلے اقسام میں داخل نہیں ہیں جن کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ ایسے بااقتدار لوگوں کا وجود قرآن سے ثابت نہیں ہوتا۔ جس طرح انسان میں ایسی عورتیں ہیں جنکی نظریں بد ہیں۔ میلی کھیلی کثیف حالت میں رہتی ہیں اور کبھی کبھی وہ اس امر کا بھی غلط دعویٰ کرتی ہیں کہ ان کے پھونکنے یا پڑھنے سے کسود کار ہوتا ہے۔ یا بھلائی برائی وقوع میں آجاتی ہے۔ ان کے پیچھے پیچھے جاہل عورتوں کا غول ہوتا ہے سب سمجھتی ہیں کہ تمام زمین و آسمان کے اختیارات اسی کے ہاتھ میں ہیں اور اس لئے اس کے اقتدار بڑھنے سے طرح طرح کے فسادات پیدا ہوتے ہیں۔ خدا نے کہا کہ ان کے شر سے خدا کی پناہ مانگو یعنی ان کو قابل نفرت سمجھو۔ اسلام پھیلنے پر ایام جہالت کی یہ تمام لخواہیات قابل لحاظ نہیں رہیں۔



## فصل نمبر ۵۲

مسئلہ جبر و اختیار (قضا و قدر)

جب انسان عالم کی خلقت پر غور کرتا ہے تو وہ ایک کو دوسرے کا سبب پاتا ہے۔ اور اخیر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ عالم کی ترکیب چھوٹے چھوٹے ذروں سے ہے جس کو ہیولا، یا مادہ کہتے ہیں۔ لیکن یہ معلوم کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے کہ وہ مادہ از خود موجود تھا یا کسی موجود نے اس کو پیدا کیا تھا اور مختلف اجناس اور انواع و اقسام اشکال میں ان مادوں کے مرکب ہونے کا کیا سبب ہے۔ یہ خاصیتیں اور قوتیں خود ان میں موجود تھیں یا کسی موجود کی ودیعت کی گئی تھیں۔ موجودات میں موجود و محسوس کے سوا انسان کو کچھ نظر نہیں آتا۔ یعنی انسانی قوتی میں عالم مادیات سے آگے متجاوز ہونے کی قوت نہیں ہے ایسا یہیں سے فلاسفہ طبیعی اور فلاسفہ الیہین جدا ہوتے ہیں فلاسفہ طبیعی تو یہیں تک پہنچ کر رہ جاتے ہیں اور نیچر کا لقب پاتے ہیں۔ کیونکہ نیچر کو ہی وہ خالق کائنات مانتے ہیں مگر فلاسفہ الیہین یقین کرتے ہیں کہ اس کا پیدا کرنے والا وہی خالق ازلی ابدی ہے۔ جسکو یہاں کے لوگ خدا اور عرب کے لوگ اللہ اور یورپ کے لوگ گاڈ اور فلاسفہ الیہین علتہ العلیٰ کہتے ہیں۔ خلاصہ اس تقریر کا یہ ہے کہ خدا دنیا کے پیدا کرنے کا سبب ہے۔ جو طریقہ آفرینش کا اس نے پیدا کر دیا ہے اسی پر لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ کھار کے آنوے سے مختلف رنگ اور مختلف وضع کے برتن نکلتے ہیں کوئی ٹیڑھا ہو گیا کوئی سیاہ ہو گیا۔ کھار کی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ کسی کو ٹیڑھا یا سیاہ



بنائے لیکن سب کا بنانے والا کہا رہی سمجھا جاتا ہے اور اسی طرح خدا کی قائم کی ہوئی فطرت سے مختلف شکل، مختلف صورت مختلف قد اور مختلف رنگ کے انسان پیدا ہوتے ہیں۔ فطرت انسانی خدا کی بنائی ہوئی ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ اچھے اور برے نیک اور بد ہر طرح کے انسان خدا نے پیدا کئے ہیں۔ علتہ العلل ہونے کی حیثیت سے خدا کو قادر مطلق مانتے ہیں۔ لیکن انسان اپنے فعل کا پورا مختار ہے اس لئے اچھے اور برے افعال کا مرتکب خود اسی کو قرار دیتے ہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ خدا چور کو چوری کرنے کے لئے اٹھاتا ہے اور پھر کو تو ال شہر کو خبر دار کر دیتا ہے کہ چور کو پکڑے اور سزا دے۔

ایران کے زرتشتوں کا یہ مسک تھا کہ خالق خیر و بد ہے اور خالق شر اہرمن ہے۔ عیسائیوں کے تین خدا تو فرضی ہیں۔ لیکن زرتشتوں نے واقعی طور پر الوہیت کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا تھا عرب کے ریگستان میں بھی یہی خیالات پھیلے ہوئے تھے۔ اسلام کا بڑا کام جہالت کا رفع کرنا ہے اس لئے قرآن میں جا بجا یہ فرمایا گیا ہے کہ علتہ العلل ہونے کی حیثیت سے شر اور غیر دونوں کی نسبت ایک ہی ذات کی طرف کی جاسکتی ہے۔ اور وہ ذات واحد ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ وہ قادر مطلق ہے۔ یعنی اس کی قدرت کامل ہے اور ادھوری نہیں ہے قرآن عام فہم لفظوں میں ہے اس میں نتیجہ سے اور تمثیلی زبان سے بحث کی گئی ہے تاکہ چھوٹی سمجھ والے اور بڑی سمجھ والے دونوں اس کو سمجھ سکیں علتہ العلل کا ساموٹا لفظ اس میں رکھا جاتا تو اس وقت کے عرب عموماً سمجھنے سے قاصر رہتے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ترقی علوم کے بعد اب بھی اسی طرح سمجھیں جس طرح ریگستان کے بدو سمجھتے تھے۔

یہ عالم ناسوتی ہے۔ بیان کے جتنے ذریعے ہیں وہ سب اس عالم ناسوتی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں کوئی بیان عالم غیر مادی یا معاد کا عام فہم استعارات یا تشبیہات سے خالی ہو تو عوام اس کو نہیں سمجھ سکتے۔ تمثیلی زبان سے کتب سماوی میں بہت سی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ جن لوگوں میں روحانی قوتیں خلقتاً یا بذریعہ اکتساب کے زیادہ ہیں وہ عالم مادی اور غیر مادی کے تعلقات کو زیادہ تر سمجھتے ہیں اور اسی لئے کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کی حقیقت صوفیائے کرام عمدہ طور پر سمجھتے ہیں۔ بشرطیکہ ٹھکنے کے لئے صوفی نہ بنے ہوں۔ لیکن جو لوگ صوفی نہیں ہیں اور علوم جدیدہ یا قدیمہ کی تحصیل سے قانون فطرت پر غور کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ ان کو بے شک یہ حق ہے کہ کتب سماوی کے سمجھنے میں ان کا مذاق جداگانہ ہو اور اس سے انکار کرنا بڑی غلطی ہے۔



کلام الہی یعنی قرآن اور فعل الہی یعنی موجودات عالم میں فرق نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان کے سمجھنے کا جو طریقہ اختیار کیا جائے وہ البتہ غلط ہو سکتا ہے۔ خدا نے جس عالم میں ہم کو پیدا کیا اور جس عالم کی مناسبت سے ہم کو قوی دیئے اس عالم کی پوری ماہیت دریافت کرنے کے بعد کلام الہی کو اس سے منطبق کرنا یہ ہمارے اختیار کی بات ہے اور اسی طریقہ سے موجودات عالم کے ماہر کلام الہی پر پورا یقین بھی کر سکتے ہیں اور یہ غلطی ہے کہ کلام الہی کے سمجھنے کا جو ذریعہ ہے اس کو ہم کلام الہی میں ڈھونڈیں۔

الحاصل جب خدا جمیع کائنات کا علتہ العلیل ہے تو تمام حوادث، واقعات اور افعال مخلوقاً اس کی طرف منسوب ہو سکتے ہیں اور وہ علتہ العلیل (یعنی ذات باری) اپنی مخلوقات کا علم واقعی رکھتی ہے اور علم باری ہی کا نام اگر تقدیر رکھا جائے تو زیادہ تر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انسان سے اچھے اور برے افعال زیادہ تر اس کے اعصاب کی ترکیب سے سرزد ہوتے ہیں یعنی جس طرح ایک ہی اسٹیم (بجھاپ) مشین کے مختلف پرنسپلز میں پینچ کر مختلف کام کرتی ہے اسی طرح نفوس انسانی مختلف قسم کے دل و دماغ اور اعضا میں مختلف کام دیتے ہیں۔ اس لئے جسم کی فطرتی بناوٹ اور خلق کے لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ اچھے یا برے انسان ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں حال کی تحقیقات بھی بالکل اسی خیال کے موید ہے اور انسانی تجربہ بھی یہی کہتا ہے۔ آثار میں یہی سائنس تیرہ سو برس پہلے یوں بیان کی گئی ہے۔

السید من سعدنی بطن امہ

والشقی من شقی فی بطن امہ

نیک ماں کے پیٹ سے نیک پیدا ہوتا ہے اور بد ماں کے پیٹ سے بد پیدا ہوتا ہے۔ انسان کو اس اعتبار سے کہ اچھا یا برا وہ پیدا ہوتا ہے غیر مکلف ہونا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی عقل بھی لگی رہتی ہے جو اچھے اور برے میں اسے تمیز سکھاتی ہے اس لئے اسے مکلف کہتے ہیں۔ جب صریح دیکھتے ہیں کہ وہ متحرک بالارادہ ہے کچھ کرنا چاہتا ہے تو کسی کے روکنے سے بھی نہیں مانتا اور جب نہیں کرنا چاہتا تو مارنے پر بھی نہیں کرتا تو پھر کیونکر اسے غیر ذی اختیار سمجھیں غرض کہ انسان کو پورا اختیار اچھے یا برے افعال کے ارتکاب کا دیا گیا ہے جسم کی بناوٹ سے جو فطرتی میلان طبع کا ہوتا ہے اس کی اصلاح تعقل۔ رسم و رواج یا مذہب سے ہو سکتی ہے۔ انسان کا کام ہے کہ عقل سے ہر وقت سوچا رہے۔ سوسائٹی کے اچھے برے رسم و



روح میں امتیاز کرے اور یہی قوت امتیاز یہ تحرک بالارادہ کے ساتھ مل کر انسان کو مکلف بناتی ہے۔  
خیر یہ سمجھنا تو مشکل نہیں ہے کہ انسان اپنے فعل کا مختار ہے اور علتہ العلیل ہونے کی حیثیت  
سے اللہ قادر مطلق ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا کلام اللہ سے اور بزرگان دین کے اقوال سے بھی  
اسکی تائید ہوتی ہے یا نہیں۔

یہیں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ علم الہی کا نام بعضوں کے نزدیک تقدیر ہے مثلاً کوئی نجومی  
کسی کی نسبت یہ بیان کرے کہ وہ آگ میں جل کر مرے گا تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ مرنے والے کی موت  
کا علم اس نجومی کو تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ نجومی نے اس کو آگ میں  
کو دپڑنے پر مجبور کیا تھا۔ علتہ العلیل ہونے کی حیثیت سے خدا کو علم ہے کہ کون بندہ کیونکر  
دنیا میں گزران کرے گا اور اس طرح ہر شخص کی آئندہ زندگی کی حالت جو خدا کے علم میں ہے  
وہ تقدیر کہی جائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ نہیں کہا جائے گا کہ خدا نے اپنے کسی بندے  
کو کسی خاص فعل یا ترک فعل کے لئے مجبور کیا۔ پہلے چند باتیں بطور مقدمہ کے سمجھ لینا چاہیے  
تاکہ کلام اللہ کی آیتوں کا سمجھنا آسان ہو جائے۔

۱۔ تمام موجودات عالم کو اور تمام انسانوں کو مع اس کے تمام قوی کے اس نے پیدا کیا  
جسکو ہم خدا یا علتہ العلیل کہتے ہیں۔

۲۔ اس نے تمام انسانوں اور حیوانوں کو اپنی مشیت سے ایک فطرت پر پیدا کیا اور اس  
فطرت میں وہ تغیر و تبدل نہیں کرتا۔ اسی فطرت کے مطابق انسان سے فعال صادر ہوتے  
ہیں اختیاری ہوں یا اضطراری دونوں حالتوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مشیت الہی سے وہ  
افعال صادر ہوتے ہیں۔

۳۔ انسان میں دو متضاد قوتیں موجود ہیں ایک کسی کام کے کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور دوسری  
اسے کام کرنے سے روکتی ہے۔

۴۔ انسان ان تمام قوی کو جو اس میں ودیعت رکھے گئے ہیں اپنی فطرت کی حد تک کام میں  
لانے کا مختار ہے۔

۵۔ انسان اپنے فعل کا مختار ہے اس لئے مکلف ہے۔

۶۔ موجودات عالم کے حالات و افعال کا علم اس علتہ العلیل کو ہے جس نے اس عالم کو بنایا  
یا پیدا کیا ہے۔



۷۔ تمام افعال جو انسان سے صادر ہوتے ہیں انکی نسبت تمام وسایط کو حذف کر کے کہہ سکتے ہیں کہ علتہ العلل سے صادر ہوئے۔

۸۔ انسان اپنے تمام افعال کو علتہ العلل یعنی خدا کی طرف منسوب کر سکتے ہیں کیونکہ وہی ان قوتوں کا خالق ہے جس سے وہ افعال ظاہر ہوئے۔

۹۔ امور شرعیہ کے بجا لانے میں قوت فعل کو کام میں لانا اور منہیات شرعیہ سے بچنے میں قوت ترک فعل کو کام میں لانا اس علتہ العلل کی مرضی کے موافق ہے اور باعث درجات ہے۔

۱۰۔ برخلاف اس کے منہیات شرعیہ میں قوت فعل کو کام میں لانا اور قوت ترک فعل کو کام میں نہ لانا اس علتہ العلل کی مرضی کے موافق نہیں ہے اور باعث درجات ہے۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بغیر مشیت الہی نہ کچھ ہوا ہے اور نہ ہو گا۔ لیکن مشیت الہی کیا چیز ہے اسی کا سمجھنا اصل امر ہے۔ مشیت الہی کا ظہور اس فطرت میں ہوتا ہے جس پر انسان اور کل مخلوقات پیدا کئے گئے ہیں۔ آگ کی فطرت میں جلانے کی قوت رکھی گئی ہے جب کوئی چیز جلنے کے لائق اس میں ڈالی جائے گی تو ضرور جل جائے گی۔ یہ کہا جائے گا کہ مشیت الہی یہ ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ آگ میں جلانے کی قوت خدا نے پیدا نہیں کی ہے۔ جب کوئی جلنے والی چیز اس میں پڑتی ہے خدا عادتاً اس میں قوت احتراق پیدا کر دیتا ہے تو یہ صحیح نہیں ہے۔

اب ان اصول عشرہ کے مطابق ہم ان آیتوں کی تفسیر بیان کریں گے کہ ان آیتوں سے انسان ان قوتوں کے کام میں لانے سے مجبور نہیں ہے جو اس کو عطا ہوئے ہیں اور اسی لئے وہ مکلف ہے۔ جنکو بعض مفسروں نے بیان کیا ہے۔

مثلاً خدا نے فرمایا کہ: تم میں سے جو سیدھی راہ پر چلتا ہے اس کے لئے قرآن نصیحت ہے۔ اس میں تو انسان کا مختار ہونا ظاہر ہے۔ دوسری جگہ ہے: تم کچھ نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ پروردگار عالم چاہے: مقدمہ دوم کا اصول یہاں متعلق کیجئے۔ سلب اختیار انسان جبکہ وہ فطرت ذمی اختیار پر پیدا کیا گیا ہے اس سے لازم نہیں آتا۔

خدا گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت کرتا ہے جس کو چاہتا ہے: وہ علتہ العلل ہے اس لئے بندوں کے تمام افعال کو وسایط درمیانی حذف کر کے اپنی طرف منسوب کر سکتا ہے (دیکھو مقدمہ ہفتم) انسان جو فطرتاً ذمی اختیار پیدا کیا گیا ہے اس کی برأت لازم نہیں آتی۔

اگر تیرا پروردگار چاہتا تو ایمان لاتے وہ سب جو زمین پر ہیں: یعنی وہ چاہتا تو انسان



کو فطرتاً ذی اختیار پیدا نہ کرتا۔

ممکن نہیں کہ کوئی شخص بے اذن خدا کے ایمان لائے۔ اذن خدا کیا ہے؟ ذی اختیار ہونے کی فطرت یا خدا کا علم اذن ہے۔ تو معنی یہ ہوئے کہ کوئی شخص اپنی فطرت کے خلاف ایمان نہیں لاسکتا یا یہ معنی ہوئے کہ جو ایمان لائے گا اس کا علم خدا کو ہے (دیکھو مقدمہ ششم) قرآن میں اذن خدا اور مشیت خدا کا لفظ بطور استثناء کے بولا گیا ہے مثلاً: "کوئی شفاعت نہیں کر سکتا جب تک کہ خدا کا اذن نہ ہو" اور: "تم نہیں چاہ سکتے مگر یہ کہ خدا چاہے" لیکن ان دونوں مقامات پر کسی امر استثناء کا واقع ہونا مراد نہیں ہے بلکہ خدا کو اپنی عظمت جبروت اور قدرت کاملہ کا اظہار مقصود ہے یا حمد ماقبل کی توثیق مراد ہے۔

"ہم ان کو چھوڑ دیں گے انکی گمراہی میں بھٹکتے ہوئے۔ وہ ایمان نہیں لانے کے مگر جب خدا چاہے" گمراہی میں چھوڑ دینے کے معنی یہ ہیں کہ جس فطرت پر وہ پیدا کئے گئے۔ اسی فطرت پر وہ رہیں گے (دیکھو مقدمہ دوم) خدا کا یہ کہنا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے اصول ششم پر متفرع ہے یعنی خدا کو اپنے علم سے معلوم تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہوں گے۔

قرآن کے سمجھنے سے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں اور ان کے کالوں کو پہرا کر دیا ہے۔ یعنی گو خدا نے ان کو فطرتاً مختار پیدا کیا تھا لیکن خدا کے علم میں یہ تھا کہ وہ راستے پر نہ آئیں گے۔ اصول ہفتم پر بہ سبب علت العلل ہونے کے افعال عباد کو خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، لیکن وہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔ یہ جملہ اسی علم الہی پر مبنی ہے جس کا ذکر مقدمہ ششم میں کیا گیا اور پھر مقدمہ ہفتم کے اعتبار پر اپنی ذات کی طرف تمام وسایط کو حذف کر کے منسوب کیا ہے: اگر خدا چاہتا تو خدا کی نشانیاں نازل ہونے کے بعد وہ آپس میں نہ لڑتے لیکن اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ خدا جس شخص کو فتنہ میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے تو تو خدا سے اسکو ہرگز بچا نہیں سکتا۔ بالکل سچ ہے خدا کا ارادہ قانون فطرت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جس فطرت ذی اختیار پر خدا نے جس کو پیدا کیا ہے اس کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کو خدا نے فتنہ میں پڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ خدا نے ان کے ہاتھوں کو تم سے اور تمہارے ہاتھوں کو ان سے باز رکھا ہے۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے جو فطرتی اسباب غالب اور منسوب ہونے کے یا شکست پانے یا کامیاب ہونے کے بتائے اسی پر تمام حالات یا واقعات موقوف ہیں۔



اسی طرح ان تمام آیتوں کو سمجھنا چاہیے جن سے بادی النظر میں انسان کے مختار ہونے کا شبہ کیا جاسکتا ہے۔ انسان نے مختار ہونے کی جو آیتیں قرآن میں ہیں ان سے بھی ہمارے معنوں کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً فمن شیار فلیومن ومن شار فلیکفر۔ جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔ "ما ظلمہم اللہ و لکن انفسہم یظلمون" اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا تھا۔ بلکہ انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔ ما حصل اس کا یہ ہے کہ خدا نے انسان کو ایک حد تک ذی اختیار پیدا کیا ہے اور اپنے خدا اختیار میں جو فعل انسان کرتا ہے وہ اس کا ذمہ دار اور جوابدہ ہے۔ گو علت الخلل ہونے کے سبب سے وہ خدا کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے۔ لیکن وہ فی الواقع بندہ کا اختیار فعل ہے۔

مفصلہ بالا تحریر ان لوگوں کو تشفی دینے والی ہے جن کے دل میں توہمات پیدا ہو کر اسلام کی طرف ان کو راغب نہیں ہونے دیتے۔ ورنہ اس مضمون کے لکھنے والے کا یہ مذہب نہیں ہے۔ خدا کے ساتھ جو خلوص اور اعتقاد اس کو ہے وہ اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ خدا کے اختیارات کو کسی طرح پر محدود کرے لیکن اس کے ساتھ ہی اپنے تمام برے افعال کا وبال بھی اپنی ہی گردن پر وہ لینے کو تیار ہے۔ خدا سے اس کو یہ عشق ہے اور اس لئے اپنے معشوق کی کسی ادا کا وہ شاک نہیں ہے اور نہ ایسے باریک مسئلہ پر سوچنا یا سمجھنا وہ ضروری سمجھتا ہے اور نہ اس اہم مسئلے کو طے کئے بغیر کہیں سے اس کا ایمان ڈالنا ہوتا ہے۔ اس کا یہ ایمان ہے کہ خدا کے جتنے اسماء و صفات ہیں وہ سب شمع ہیں۔ لیکن اس عالم کے تعلقات سے کیونکر انکو وابستگی ہے اسکی چھان بین کی انسان کو ضرورت نہیں ہے اور چھان بین کی بھی جائے تو جب تک روح اس عالم ناسوتی سے تعلق رکھتی ہے وہ ان باتوں کے ادراک کامل سے یقیناً قاصر ہے۔ وسط سمندر میں کوئی پھینک دیا جائے اور وہ ہاتھ پاؤں مار کر ساحل تک پہنچنے کی کوشش کرے تو فعل عبث ہے۔

دریں درطہ کشتی فرد شد ہزار

کہ پیدا نہ شد تختہ برکنار

انسان کا دائرہ معلومات تنگ اور محدود۔ فکر انسان ہمیشہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی ایسی حالت میں روح معاد یا خلقت عالم پر اپنی عقل سے کوئی رائے قائم کر لینا سب سے بڑی جہالت ہے۔ خدا کی نسبت یہ سمجھنا کہ وہ دنیا کا گورکھ دھند بنا کر خود وجود معطل



ہو گیا بڑی گستاخی ہے۔ لیکن وہ لوگ جو سمجھتی طبیعت رکھتے اور قرآن کو اس لئے غلط سمجھتے ہیں کہ وہ فطرت انسانی کے خلاف ہے اور خدا کو اس لئے عادل نہیں سمجھتے کہ بندہ مجبور ہے اور خدا ہی خیر و شر کا خالق ہے ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ یہ مضمون پڑھیں اور سوچیں کہ اگر فطرت موجودات کا علم ان کا بہت ہی کامل ہے تو کلام اللہ بھی اس کے خلاف نہیں ہے۔ کلام اللہ انسان کی ہدایت کے لئے ہے۔ انسان کے خیالات مختلف ہیں تو قرآن کا بھی یہ اعجاز ہے کہ مختلف پیرائے کے لوگ اس سے مختلف پیرائے میں تشفی حاصل کر سکتے ہیں یعنی قرآن اس طور پر لکھا گیا ہے کہ ہر استعداد اور ہر مذاق کا آدمی اپنے مذاق کے موافق اس سے تسکین حاصل کر سکتا ہے آسمان زمین، دعا، سحر، جن، ملائکہ، قصہ آدم، خلقت عالم، عذاب و ثواب دوزخ و بہشت، یہ تمام چیزیں قرآن میں اس طرح مذکور ہیں کہ عرب کے بددوں کو بھی اس کے پڑھنے سے تشفی ہوئی اور یونانی فلسفہ جب مسلمانوں میں پھیلا تو متکلمین نے بڑے بڑے دہریوں کی تسکین کر دی۔ اور زمانہ حال کی سائنس اور ہیبت سے بھی وہ کلام پورے طور پر مطابق پایا جاتا ہے۔ کیوں نہ ہو یہ کلام ربانی ہے ہر فرقہ ہر قوم اور ہر قرن کے مناسب حال بنایا گیا ہے۔

اکابر اسلام کے بھی چند اقوال نقل کئے جاتے ہیں تاکہ ان کے خیالات اس مسئلہ کے

متعلق معلوم ہوں۔

حضرت علیؓ نے جنگ صفین سے واپس آنے پر ایک شخص کے سوال کے جواب میں فرمایا اس کو امام احمد زبیدی نے لکھا ہے۔ جا بجا سے ان کے فقرے یہاں نقل کئے جاتے ہیں "دانے کے پھوڑنے والے اور جان کے پید کرنے والے کی قسم ہے کہ کسی وادی میں نہ اترے اور نہ کسی ٹیلہ پر چڑھے مگر قضا و قدر کے موافق۔" پھر شیخ نے پوچھا تو کیا ہمارے لئے خدا کے نزدیک کچھ ثواب نہیں ہے۔ کیونکہ قضا و قدر نے ہم کو چلایا اور اسی سے ہمارا سفر ہوا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ، شاید تو اس کو قضا و یقینی اور قدر قطعی خیال کرتا ہے۔ ایسا ہوتا تو عذاب اور ثواب کے وعدے سب بیکار ہو جاتے۔ خدا نے ہم کو مختار بنا کر حکم دیا ہے مجبور بنا کر مکلف نہیں کیا ہے اور ایسا خیال کافروں کا ہے۔"

حضرت امام حسنؓ نے اہل بصرہ کو خط لکھا جس کے چند فقرے یہ ہیں "جو خدا پر اور اس کے قضا و قدر پر ایمان نہیں لایا وہ کافر ہوا۔ اور جس نے اپنے گناہوں کو خدا کی طرف منسوب کیا وہ گنہگار ہوا۔ اگر خدا کی عبادت کریں تو خدا انکے اور ان کے عمل کے درمیان حائل نہیں ہوتا۔ اور اگر گناہ کریں



تو خدا نے کچھ گناہ پر مجبور نہیں کیا ہے۔

حسن بصری نے حجاج کے خط کے جواب میں مسئلہ قدر کی حقیقت یوں بیان کی ہے۔ جہلا کہتے ہیں کہ خدا جس کو چاہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہے راہ دکھاتا ہے اگر وہ آیت کے ماقبل اور مابعد پر نظر ڈالتے تو انکو معلوم ہو جاتا کہ خدا گمراہ نہیں کرتا مگر کفر اور گناہ کے تقدم کی وجہ سے جیسا کہ اس کا قول ہے کہ اللہ ظالموں کو گمراہ کرتا ہے۔

امام احمد بن یحییٰ المرقفی زیدی نے لکھا ہے عبداللہ عمر سے ایک شخص نے کہا اے ابو عبدالرحمن بعض قوموں کے لوگ زنا کرتے ہیں اور شراب پیتے ہیں۔ چوری کرتے ہیں اور لوگوں کو قتل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کے علم میں تھا ہم کو کوئی چارہ نہیں ہے۔ عبداللہ بن عمر غصہ ہوئے اور کہا سبحان اللہ۔ بیشک اللہ کے علم میں تھا کہ وہ لوگ ایسے کام کریں گے۔ مگر خدا کے علم نے ان کو ان کاموں کے کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ مجھ سے میرے باپ عمر بن خطاب نے ذکر کیا کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا کہ علم الہی کی مثال تم میں مثل آسمان کے ہے جس نے تم پر سایہ کر رکھا ہے اور مانند زمین کے ہے جس نے تم کو اٹھا رکھا ہے۔ جس طرح تم آسمان وزمین سے باہر نہیں جا سکتے اسی طرح تم خدا کے علم سے باہر نہیں ہو سکتے اور جس طرح آسمان وزمین تم کو گناہوں پر مائل نہیں کر سکتے اسی طرح خدا کا علم بھی تم کو ان گناہوں پر مجبور نہیں کرتا۔



## فصل نمبر ۵۳

### قصص قرآنی

قرآن میں جہاں امر اور نہی کے احکام ہیں یا اخلاقِ حسنہ کی تعلیم کی گئی ہے وہاں پرانے زمانے کے قصے بھی مجھلا مذکور ہیں جن سے محض اخلاق اور حکمت کا سکھانا مقصود ہے۔ ان میں زائد تر وہی باتیں ہیں جو عرب اور شام میں جزوی اختلاف کے بنا تھو پہلے سے مشہور تھیں۔ ابتدائے اسلام میں مناسب معلوم ہوا کہ ان قصوں کے واقعات یا دلائل خیر کی طرف طبیعتیں متوجہ کی جائیں اور اس پرانے میں عقائد اسلام تعلیم کئے جائیں۔ عبارت قرآنی کی خوبی تو عربی جانے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی رہا طرز بیان وہ بھی زائد تر اسی وقت کے جب حال تھا کہ لوگوں کو باتیں پہلے سے معلوم تھیں پورا قصہ لکھنے کی ضرورت نہ تھی صرف ایک اشارہ کافی اور با اثر ہوتا تھا۔ الکنایۃ ابلغ من الصراحتہ۔

سب کو معلوم ہے کہ قرآن ایک دم سے نازل نہیں ہوا۔ ضرورت کے وقت آیتیں یا صوتیں نازل ہوتی تھیں اس لئے ایسا بھی ہے کہ مختلف اوقات اور مختلف مواقع پر ایک ہی بات بار بار کہی گئی ہے۔ گو طرز بیان ہر جگہ پر جداگانہ ہے اور با اختیار بلاغت کے نہایت ہی دلچسپ ہے لیکن غیر زبان میں ترجمہ ہونے کے بعد اور شان نزول پر نظر نہ ہونے کی حالت میں قصہ کا لطف بہ حیثیت قصہ ہونے کے ضرور کم ہو جاتا ہے مگر وہ باتیں جو ان قصوں سے پیدا ہوتی ہیں بجائے خود نہایت مفید اور بکار آمد ہیں اور ہر وقت اور ہر موقع کے مناسب ہیں۔ ہم اس وقت صرف



انہیں فوائد سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔

قرآن میں جا بجا یہ بتایا گیا ہے کہ جب تک کوئی قوم اپنے کو خراب نہیں کرتی خدا بھی اس کو خراب نہیں کرتا۔ جب کوئی خود کو بھول جاتا ہے تو خدا بھی اس کو بھول جاتا ہے اس کو یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ کسی قوم کو عروج ہوتا ہے تو وہ محنت۔ جانفشانی۔ شکرگزاری وغیرہ سب اسباب ترقی چھوڑ کر خود فراموشی اختیار کرتی ہے جس کا دوسرا نام ہے خدا فراموشی۔ نتیجہ خدا فراموشی کا ہے کثرتِ معاصی اور اس کا نتیجہ لازمی ہے تباہی اور بربادی۔ ایک قوم کے برباد ہونے پر دوسری قوم محنت اور شکرگزاری کے راستہ پر چلتی ہے اور جب اس کو بھی عروج ہو جاتا ہے تو خدا فراموشی کے ساتھ زوال شروع ہو جاتا ہے اور زوال شروع ہونے کے وقت اپنے ناصحوں یعنی پیغمبروں کا کہنا نہ ماننا لازمی ہے۔ جب تک نصیحت سننے کیلئے کان کھلے رہتے ہیں خدا فراموشی نہیں ہوتی اور نہ زوال آتا۔ خدا اسی قومی ترقی و زوال کو کہتا ہے کہ "ملک الایام نداد لہا بین الناس" و لوں کو ہم آدمیوں میں پھرتے رہتے ہیں۔ خدا نے بہت سی امتوں کا عروج و زوال قرآن میں دکھایا ہے۔ زوال کے لئے عذاب کا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ عذاب کی غایت قوموں کی بربادی ہے اور عذابوں کے مختلف طریقے لکھے گئے ہیں اگر لسانِ تمثیلی سمجھی جائے تو مطلب صاف ہے اور اگر فی الواقع طوفان کا آنا زلزلہ کا محسوس ہونا۔ پھر برسنا وغیرہ وغیرہ آفاتِ ارضی و سماوی کا واقع ہونا اصلی معنوں میں سمجھا جائے جب بھی سمجھ داروں کے نزدیک کوئی بات انوکھی پیدا نہیں ہوتی۔

مختلف مقامات پر مختلف پیرائے سے قصے بیان کئے گئے ہیں اور کہیں کہیں مجمل طور پر بہت سے واقعات کی طرف ایک ساتھ اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ عنکبوت رکوع ۱۰ میں قوم نوح۔ قوم لوط۔ سکانِ مدین (یعنی قوم شعیب) قوم عاذر (جس میں حضرت ہود و پیغمبر مبعوث ہوئے)۔ قوم ثمود (جس میں حضرت صالح پیغمبر مبعوث ہوئے تھے)۔ قارون۔ فرعون۔ ہامان کی تباہیوں کا بلا جال ذکر کر کے خدا فرماتا ہے کہ "خدا ان پر ظلم نہ کرتا لیکن یہ تو خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔ کہ اللہ کے سوا دوسروں کو کار ساز سمجھتے تھے۔ ان لوگوں کی مثال مکرہی کی سی تھی کہ وہ بھی ایک گھر بنا لیتی ہے ادا سے اپنے پندار میں بڑا مضبوط جانتی ہے حالانکہ وہ سب کے گھروں سے بوجھ ہے۔ کاش یہ اتنا ہی سمجھتے۔" و ما کان اللہ لیتظلمہم و لکن کانوا انفسہم یظلمون مثل الذین اتخذوا من دون اللہ اولیاء کمثل العنکبوت اتخذت بیتاً وان اویہا البیت البیت العنکبوت



لو کالوا لعلمون -

ہم چاہتے ہیں کہ چند بڑے بڑے قصے جو قرآن میں کسی قدر صراحت کے ساتھ مذکور ہیں یہاں بیان کریں۔ لیکن قصہ شروع کرنے سے قبل یہ کہنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ یہ قصے ناول نہیں ہیں کہ شروع سے اخیر تک ایک بات واقعہ کے مطابق نہ ہو مگر قوم کے موجودہ مزاج سے اس درجہ قریب ہو کہ کسی طرح کذب کا گمان بھی نہ ہو سکے۔ بلکہ یہ قرآن پاک کے قصے ہیں جن میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں ہے۔ مگر واقعات اتنے پرانے ہیں کہ ہماری تاریخی معلومات سے انکی تائید نہیں ہو سکتی بلکہ بعض بعض قصہ تو اس زمانے کے ہیں جب معاشرت انسانی اپنی نوعیت میں موجودہ معاشرت سے بالکل علیحدہ تھی اور اس وقت کے قانون قدرت سمجھنے کے لئے ہماری عقلیں اسی طرح ناکافی ہیں جس طرح اور بہت سے راز فطرت کے سمجھنے سے ہم قاصر ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ لا تبدل فی فطرت اللہ؛ قانون قدرت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی ہو جب بھی ہم کسی امر کو موجودہ حالت پر نظر کر کے مافوق العادۃ نہیں کہہ سکتے۔ وہی آفتاب جو صبح کو اپنی دھیمی حرارت سے لطف بخشتا ہے دوپہر کو اسکی گرمی دماغ پریشان کر دیتی ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کہ بدر خلقت آدم میں بہت سی باتیں فطرًا مطابق عادت ہوں اور اب مافوق العادۃ ہو گئی ہوں اور وجود کے سمجھنے سے ہماری قوت مدد کہ اور متخیلہ اس وقت قاصر ہو۔

حضرت آدمؑ کی پیدائش پر غور کیجئے۔ آج کوئی عالم یا کوئی حکیم علوم جدید یا علوم قدیمہ کی برکت سے ایسا ذی وقوف نہیں ہے جو یقینی طور پر کسی کو یہ سمجھا دے کہ انسانی سلسلہ توالد و تناسل پیدا ہونے کے قبل ایک مرد اور ایک عورت کا جوڑا کیسے بن گیا۔ جب قطعی طور پر کوئی دوسری صورت بیان نہیں کی جاسکتی تو کیوں ہم قصہ قرآنی کو گو وہ کیسا ہی مافوق العادۃ ہو باور نہ کریں۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ تمام آسمانی کتابیں ایسا ہی کہتی چلی آئی ہیں۔ اب جب آدم کی پیدائش کو ہم اپنے موجودہ علم کے ذریعہ سے معلوم نہ کر سکے تو آدم کے زمانے میں یا انکے قریب زمانے کی باتیں جو مافوق العادۃ بیان کی جاتی ہیں ان کو ہم کیوں غلط مانیں۔ مثلاً حضرت سلیمانؑ کی نسبت مذکور ہے کہ وہ جانوروں کی بولی سمجھتے تھے۔ کیا بعید ہے کہ اس وقت انسان میں جانوروں کی بولی سمجھنے کی قوت موجود ہو اور حضرت سلیمانؑ میں وہ قوت نسبتاً زیادہ ہے اور اب بھی تو یہ قوت انسان میں کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ ایک کتے کو دیکھ کر دوسرا کتا بھونکتا ہے یا گھوڑا دانے کے وقت بولتا ہے۔ بلی کھانے کے سامنے بیٹھ کر میاؤں میاؤں کرتی ہے اور



انسان سمجھ جاتا ہے کہ کس غرض سے یہ آواز جانور کے منہ سے نکلی۔ بطور مذاق کے کہا جاسکتا ہے کہ ڈارون تھیوری کے مطابق جب رفتہ رفتہ بندر سے آدمی بنا ہے تو بندر کی خوبو بھی رفتہ رفتہ بدل گئی۔ ممکن ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے وقت تک جانور کی بولی سمجھنے کی قابلیت جو بوجہ ہم جنسی کے شروع شروع انسان میں تھی اس میں زائد تر تغیر نہ آیا ہو۔ بہر حال جتنے قصے قرآن کے ہیں وہ سب سچ ہیں۔ زیادہ آسانی تو اس میں ہے کہ اس وقت کا طرز معاشرت جداگانہ مان لیا جائے یا فطرت کی جانب سے زائد تر دست اندازی اس وقت کی ماند و بود میں ضروری سمجھی جائے یا اگر کسی طرح موجودہ فلسفہ سے الگ ہونا گوارا نہ ہو تو لسان تمثیلی سے مدد لی جائے خدا کو صرف فلاسفہ کے لئے قرآن کا نازل کرنا مقصود نہ تھا۔ کل عالم کے لئے اسکو اترنا تھا جس میں عرب کے بدو ایسے نارتربت یا فتنہ لوگ زائد تر تھے۔ دو قرآن ایک عالم کے لئے اور ایک جاہل کے لئے ہوتا تو غرض فوت ہوتی اس لئے ایک ہی کتاب سے دونوں کو سمجھانا مناسب تھا۔ فلاسفہ کے لئے جو قرآن اترتا اسکو جہلا کبھی نہ سمجھتے۔ لیکن جہلا کے لئے جو اتر اوہ عقلا بھی سمجھ سکتے ہیں اور اس لئے یہ پرداز اختیار کیا گیا جو اب ہے۔ آنکھوں میں بصارت اور کانوں میں سماعت ہو تو ہر زمانہ اور ہر قوم کے لئے قرآن چراغ ہدایت ہو سکتا ہے۔ تربیت یافتہ کی بھی تشفی کرتا ہے اور نارتربت یافتہ بھی اس سے ہدایت پاتے ہیں۔

## ابو البشر آدم

حضرت آدم کا ذکر قرآن میں کئی جگہ پر ہے۔ از قسم انسان سب سے پہلے یہی دنیا میں آئے اور ان کے بعد حوا ان کی بیوی آئیں۔ خلقت انسان انھیں دونوں سے شروع ہوئی۔ تعلیم جو اس قصہ سے کی گئی ہے اپنی نوعیت میں وہ لا جواب ہے۔

۱۔ عزراذیل ایسا مقرب فرشتہ اپنی نخوت کی وجہ سے شیطان ہو کر مارا مارا پھرتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ نخوت کو بری بلا سمجھے۔

۲۔ شیطان موروثی دشمن انسان کا ہے اس کے درغلانے سے برے افعال کرنا بے دانشی ہے۔ نفس امارہ کو دشمن موروثی قرار دینا اور یوں اس سے ڈرنا نہایت اچھا طرز بیان کا ہے۔ بعض ایسے گمراہ حضرات ہیں جو سائنس کی چند جھولی ٹہپی کتاب پڑھ کر اپنی معلومات کو قرآن سے زائد با وقعت سمجھتے ہیں۔ گمراہ کا لفظ ہم نے بہت برے معنوں میں استعمال نہیں کیا ہے ہمارے



نزدیک وہ حضرات گمراہ کہے جانے کے ضرور سزاوار ہیں جو راز فطرت کے دریافت کرنے میں اپنا عزیز وقت ضائع کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے جو اس اس کام کے لئے نہیں بنائے گئے ہیں ہمارے نزدیک تو فطرت الثانی نے جن اسرار کو ہم سے پوشیدہ رکھا ہے انکی نسبت عقلی گھوڑے دوڑانے میں قالون فطرت کے ساتھ بے ادبی لازم آتی ہے۔ خدا کہتا ہے کہ ہم تم سے چھپائیں گے اور تم کہتے ہو کہ ہم خواہ مخواہ دریافت کریں گے آج تک ایک نے بھی قابل اطمینان کامیابی حاصل نہیں کی لیکن سپر بھی تم ضد پر قائم ہو تو یہ کیا حرکت ہے اچھا بے ادبی نہ سہی مایخو لیا تو ضرور ہے مگر اہی نہیں تو گمراہی کا مقدمہ تو ہے۔ حافظ شیرازی نے کیا خوب لکھا ہے۔

حدیث از مطرب و می گو در راز دہر کمتر جو!

کہ کش نکشود و نکشاید بحکمت این سمار

بہر حال ہم کہتے ہیں کہ ان گمراہوں کی تسکین خاطر بھی قرآن سے ہو سکتی ہے اور ہم اس کو بھی قرآن کا ایک سجزہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہر درجہ کے لوگوں کی سمجھ کے مطابق ہیں۔

قصہ جو قرآن میں متعدد مقامات پر درج ہے یوں مسلسل بیان کیا جاتا ہے۔

خدا نے سرطی ہوئی کیچڑ سے جو گویا آگ میں پکی ہوئی کے مثل گرم ہو رہی تھی۔ آدم کو اور اس کی ساتھی جو کو پیدا کیا۔ پھر ان کو اس سعادت موجودہ پر بنایا۔ فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو سب نے سجدہ کیا مگر شیطان نے سرکشی کی خدا کے حکم کو نہ مانا اور سجدہ نہ کیا۔ خدا نے اس سے پوچھا کہ تو نے سجدہ کیوں نہ کیا۔ اس نے کہا کہ میں آدم سے افضل ہوں تو نے مجھے آگ سے بنایا ہے اور آدم کو مٹی سے بنایا ہے۔ خدا نے کہا جا دور ہو تو فرشتوں میں رہنے کے قابل نہیں ہے۔ اس نے کہا مجھے قیامت تک ایسا ہی رہنے دو۔ تمہیں نے مجھے بہکا یا ہے میں بھی انسان کو بہکاتا رہوں گا۔ خدا نے کہا دور ہو اے مردود جو لوگ تیری تبعیت کریں گے میں ان سے دوزخ بھر دوں گا۔ خدا نے آدم کو سمجھایا کہ شیطان تمہارا پکا دشمن ہے اس سے خبردار رہنا۔ پھر ان کو بہشت میں رکھا جہاں کہ ان کو سبھوک تھی نہ پیاس تھی نہ دھوپ لگتی تھی اور نہ کپڑے کی حاجت تھی۔ خدا نے کہا جو کچھ چاہو کھاؤ مگر فلاں درخت کے پاس نہ جانا اگر جاؤ گے تو آپ اپنے لئے برا کرو گے۔ شیطان نے ان کو بہکایا اور کہا کہ میں تم کو ہمیشگی کا اور ہمیشہ رہنے والی بادشاہت کا درخت بتاتا ہوں اور پھر وہی درخت بتایا جس سے خدا نے منع کیا تھا اور کہا کہ اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ تم اس سے اس لئے منع کئے گئے ہو کہ تم فرشتہ اور ہمیشہ



رہنے والے نہ ہو جاؤ۔ شیطان کے بہکانے میں وہ آگے اور درخت ممنوعہ میں سے کچھ کھا لیا اس کے کھانے سے جو نادانی کا پردہ تھا ان پر سے اٹھ گیا۔ عیب و ثواب معلوم ہونے لگا انکی برہنگی ان کو شرمانے لگی اور درخت کے پتوں سے وہ اپنی شرمگاہیں چھپانے لگے۔ خدا نے کہا کہ اس درخت کے کھانے سے میں نے تم کو منع کر دیا تھا اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ شیطان تمہارا پکا دشمن ہے چلو یہاں سے جاؤ۔ تم اب جہاں رہو گے ایک دوسرے کے دشمن ہو کر رہو گے کچھ مدت تک زمین پر رہو گے وہیں مرو گے اور وہیں سے نکلو گے۔ آدم نے خدا کی ہدایت کے موافق اپنے تصور کی معافی اس طرح چاہی کہ: اے ہمارے خدا ہم نے خود پر ظلم کیا اگر تو معاف نہ کرے گا اور رحم نہ کرے گا تو ہم آفت میں رہیں گے: خدا نے معاف کر دیا اور یہ بتایا کہ تمہارے پاس میری ہدایت آئے گی جو کوئی اسے مانے گا وہ بے خوف ہو گا اور جو کوئی نہ مانے گا دوزخ میں جائے گا اور ہمیشہ اسی میں رہے گا۔ خدا نے آدم کو زمین پر اپنا نائب بنایا۔ فرشتوں نے کہا کہ ایسے شخص کو تو نیابت دیتا ہے جو فساد کریں گے اور خون بہائیں گے۔ ہم پاکیزگی کے ساتھ تجھے یاد کرتے ہیں اور تیری تعریف کرتے ہیں۔ خدا نے کہا میں سب کچھ جانتا ہوں۔ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ پھر خدا نے آدم کو سب چیزوں کے نام بتائے اور فرشتوں کے سامنے کیا اور کہا کہ تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ فرشتوں نے کہا کہ ہم تو بتا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے ہم کو بتایا ہے اس سے زیادہ نہیں جانتے پھر خدا نے آدم سے پوچھا۔ آدم نے سب کچھ بتا دیا۔

مزورت سے زیادہ عقل رکھنے والوں کے سمجھانے کے لئے مفصلہ ذیل سطریں لکھی

جاتی ہیں۔

خدا نے اس تمام قصے میں یہ نہیں بتایا ہے کہ سڑی ہوئی گرم کیچڑ سے خدا نے آدم اور حوا کو کیونکر پیدا کیا ایک دم سے پیدا کیا یا بتدریج پیدا کیا اگر بتدریج جاہلہ انسانی میں آنا ڈارون تھیوری کے مطابق مانا جائے تو قرآن سے نہ اسکی تصدیق ہوتی ہے نہ اس کی تردید ہوتی ہے لیکن خدا نے یہ اشارہ کیا ہے کہ ہم نے پیدا کیا پھر صورت بنائی (لقد خلقناکم ثم صورناکم) اس کا یہ منشا رہ سکتا ہے کہ انسان لطف میں نہایت باریک بھنگہ کی مانند پیدا ہوتا ہے پھر اس کی صورت بنتی ہے اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ انسان کا کالبد بھی مثل اور تمام چیزوں کے انھیں چھوٹے چھوٹے ذروں سے بنتا ہے جو دنیا میں پہلے سے پیدا ہیں۔ صوفیان کرام یہ معنی لگاتے



ہیں کہ روح انسانی جو ایک خاص پر توجہ ہے ذات باری کا پہلے سے موجود تھی صورت انسانی میں وہ بعد کو آئی۔

دنیا کی تمام چیزیں ایسی ہیں کہ جب باہم ایک دوسرے سے ملتی ہیں تو ان میں کیمیائی امتزاج ہو کر ایک نیا مزاج پیدا ہوتا ہے انسان میں خدا نے اچھی اور بری دونوں قوتیں پیدا کی ہیں اور یہ قدرت خدا کی ہے کہ انسان ایسے معجون مرکب ہیں۔ دونوں قوتوں کا مزاج الگ الگ قائم ہے ان دونوں قوتوں میں سے قوت خیر کو فرشتہ اور قوت شر کو شیطان کہیں تو خلافت قرآن نہیں ہو سکتا۔ معلوم رہے کہ قرآن لسان تمثیلی میں نازل ہوا ہے تاکہ اس کے مضامین بدوں سے لے کر سقراط اور بقراط کے درجہ والوں تک کی سمجھ میں بخوبی آجائیں ہر علم کی اصطلاحات خاص ہوتی ہیں۔ اصطلاح مذہب میں قوت خیر کو فرشتہ اور قوت شر کو شیطان مان لینے سے معنوں بہت عام فہم ہو جاتا ہے اسی طرح بعض احادیث میں جو بیان ہوا ہے کہ رحم میں فرشتہ انسان کی صورت بناتا ہے تو یہاں فرشتہ سے ایک خاص قسم کی قوت موصوہ مراد ہے۔

فرشتہ یعنی قوت ملکی کا آدم کو سجدہ کرنا اور شیطان یعنی قوت شر کی سرکشی اس سے یہ مطلب ہے کہ قوت ملکوئی جو انسان میں ہے وہ اس کی مطیع ہے اور قوت شیطانی بارہا، اطاعت سے انکار کرتی ہے انسان جب کوئی اچھا کام کرنا چاہتا ہے تو اس کو کوئی دقت نہیں ہوتی۔ اس وقت تمام قوتیں انسان کی انسان کے تابع ہوتی ہیں اور جب وہ اس قوت کو حرکت دینا چاہتا ہے جو نیکی کی مخرج ہے تو فی الفور وہ حرکت میں آتی ہے اور انسان سے نیکی، رحم، محبت، ہمدردی اور حمیت ظہور میں آتی ہے اور اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ تمام قوتیں جو ان چیزوں کی منشا ہیں سجدہ کر رہی ہیں لیکن اس کے برخلاف حالت اس قوت کی ہے جو بدی اور گناہ کی مخرج ہے لوگ ان افعال کو جو اس قوت سے پیدا ہوتے ہیں برا جانتے ہیں اور ان کو نہ کرنے کا ارادہ کرتے ہیں اور پھر کرتے جاتے ہیں۔ لوگ جھوٹ کو برا سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ منہ سے نہ بولیں۔ مگر منہ سے نکل ہی جاتا ہے۔ غصہ کو برا جانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ نہ کریں لیکن وقت پر طبیعت بے قابو ہو جاتی ہے۔ زنا سب سے بری چیز ہے۔ زنا کے بعد لوگ خود پر لعنت کرتے ہیں اور پکارا دہ کرتے ہیں کہ نہ کریں گے اور پھر کرتے ہیں۔ غرض کہ وہ قوت جو تمام بدیوں کی جڑ ہے



نہایت ہی سرکش اور نافرماں بر دار ہے۔

شیطان نے جو خدا سے کہا کہ تو ہی نے مجھے بہکا یا ہے میں بھی انسان کو بہکا تا رہوں گا اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا ہی نے قوت سرکش پیدا کی ہے اور سرکش قوت ہمیشہ سرکشی پر مائل رہے گی۔ یہ جبر و اختیار کا مسئلہ ہے۔ مفصل بیان اس کا "جبر و اختیار" فصل ۵۲ میں ہے بے شک خدا نے دونوں قوتیں پیدا کی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم کو عقل دی ہے کہ قوت سرکش کو ہم دبائیں اور اپنے افعال پر ہم کو طاقت دی ہے کہ جب چاہیں ہم ہاتھ ہلائیں اور جب چاہیں نہ ہلائیں جب چاہیں ہم چلیں اور جب چاہیں نہ چلیں۔ بولنے اور نہ بولنے پر ہم کو قدرت ہے دیکھنے یا نہ دیکھنے پر ہم کو پورا اختیار ہے۔

شیطان جب ایک قوت انسان کا نام ٹھہرا تو وہ فرشتوں میں شامل کیا گیا اور جب اس کا سرکش ہونا بتایا گیا تو وہ ان میں سے علیحدہ کر کے شیطان بتایا گیا یہی اس کا مردود ہونا اور فرشتوں سے علیحدہ کیا جانا ہے۔ رہا آگ سے اس کا مخلوق ہونا اس کا مطلب یہ ہے کہ قوائے انسانی میں حرارت غریزی (مادہ الکترسٹی) ضرور پایا جاتا ہے اس تمام حرارت کا سرچوش قوت سرکش ہے جسے شیطان کہتے ہیں۔ وہ قوت سب سے اوپر ہے اور تمام قوتیں اس سے نیچے ہیں۔ اسی لئے اس کی خلقت آگ سے اور بقیہ قوتوں کی خلقت مٹی سے کی گئی ہے۔

رہا درخت ممنوعہ اس کے معنی بھی تمام مضافا میں پر نظر کرنے سے سمجھ میں آ جاتے ہیں انسان کے ہوش سنبھالنے کو جس طرح زبان حکما میں بالغ ہونا اور زبان شرع میں مکلف ہونا کہتے ہیں اسی طرح انبیاء کی زبان میں شجرہ ممنوعہ کا کھانا یا چکھنا کہتے ہیں۔ اب یہ مضمون کہ جب انسان پیدا ہوا تو وہ بلوغ تک پیچھے گا آدم کو اس درخت کے کھانے سے منع کرنا اور پھر اس کو آدم کا کھانا اور خدا کی نافرمانی کر کے گنہگار ہونا اس کا مطلب ذرا ٹیڑھا ہے۔ جبر و اختیار کا یہ دوسرا مسئلہ ہے اور اس کے متعلق راویوں میں اختلاف ہے۔ بعض خیال کرتے ہیں کہ انسان اپنے افعال میں بالکل مجبور ہے بعض خیال کرتے ہیں کہ وہ بالکل مختار ہے بعض سمجھتے ہیں کہ وہ جزاً مجبور اور جزاً مختار ہے۔ ممکن ہے کہ یہاں یہ بتایا گیا ہو کہ انسان بالکل مجبور ہے اچھا یا برا وہ پیدا ہوتا ہے۔

السید من سعد فی بطن امہ والشیقی من شقی فی بطن امہ



ہنایت سچا قول ہے۔ برا کام کرنا گویا ہے لیکن انسان ضرور اس حد تک وہاں پہنچتا ہے جہاں تک برائی اس کے ساتھ مخلوق ہے اور برائی کرنے سے وہ خدا کی نافرمانی کر کے گنہگار بھی ضرور ہوتا ہے لیکن یہ تمام برائیاں اس کی خدامعاف کر دیتا ہے۔ اگر وہ اپنی تمام قوتوں کو بھتہ رسدی کام میں لائے یعنی قوائے ملکیہ کو جو اس میں کمزور حالت میں ہے اسے بیکار نہ چھوڑے۔ قوائے ملکیہ کو کام میں نہ لانے کو زبان انبیاء میں تو بہ کہتے ہیں اور اسی کو مشارع نے کہا ہے (التائب من الذنب مکن لالذنب لہ) یہ مشکل اور باریک مسئلہ اس عام فہم طریقہ سے یوں ادا کیا گیا کہ آدم کو درخت ممنوعہ کے کھانے سے خدا نے روکا لیکن آدم نے کھا لیا اور اس نافرمانی کی وجہ سے گنہگار ہوا۔ بعد ازاں آدم اپنی قوت ملکوتی کو کام میں لائے اور دعا کی کہ اے ہمارے خدا ہم نے خود پر ظلم کیا اگر تو معاف نہ کرے گا اور رحم نہ کرے گا تو ہم آفت میں رہیں گے آدم کے پچھتانے اور معافی مانگنے پر خدا نے انکی خطا معاف کر دی۔ اور اگر شجرہ ممنوعہ کھانے سے عام برائیوں کا ارتکاب مراد ہو جب بھی معنی صاف رہتے ہیں۔ آدم کو ان کے قوائے شیطانی نے قوائے شر کو کام میں لانے کی ترغیب دی اور گنہگار ہوئے اور پھر پچھتانے لگے تو خدا نے معاف کیا اور یہی تو بہ کرنا اور معاف کرنا کہلاتا ہے۔

آدم کا زمین پر نائب ہونا صریح ظاہر ہے کہ سب سے زبردست مخلوق نبی نوح انسانی ہیں اور فرشتوں کا تکرار کرنا یہ از قسم خطابیات ہے۔ تمام قومی وہی کام کرتے ہیں جس کے لئے وہ مخلوق ہیں۔ مگر انسان ہی ایسی مخلوق ہے کہ وہ نیکی بھی کرتا ہے اور بدی بھی کرتا ہے۔ خدا نے گویا انسان کی حقیقت بیان کر دی ہے کہ وہ بڑے بڑے گناہ کرتا ہے لیکن وہ قابل تعلیم اور قابل اصلاح ہے اس لئے وہ نائب کیا جاتا ہے۔ خدا نے آدم کو تمام چیزوں کے نام بتائے۔ نام بتانے سے اس ملکہ کا علم انسان میں ودیعت کرتا ہے جس سے انسان بقدر اپنی طاقت کے کارخانہ قدرت پر غور کر سکتے ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ انسان کو خدا نے سب کے نام ہی بتائے ہیں (و علم آدم الاسماء کلہا) حقیقت ایک چیز کی بھی نہیں بتائی۔ جیسا کہ بڑے بڑے علماء کے قول سے ظاہر ہے کہ وہ جتنا ہی غور کرتے ہیں اتنا ہی خود کو خلاق عالم سے بے خبر پاتے ہیں۔



## حضرت نوح

ان کو آدم ثانی بھی کہتے ہیں اس لئے کہ ان کے وقت میں اکثر ذمی روح طوفان نوح میں ہلاک ہو گئے تھے اور پھر ان سے اور نیز ان کے ساتھیوں سے نسل بڑھی۔ قرآن میں یہ قصہ یوں مذکور ہے کہ حضرت نوح کے زمانے میں گمراہی بہت بڑھ گئی تھی۔ حضرت نوح نے لوگوں کو بہت سمجھایا بجائے شکر گزار ہونے کے لوگ ان کے دشمن ہو گئے۔ کسی نے ان کا کہنا نہ مانا۔ حتیٰ کہ ان کا ایک لڑکا بھی ان سے جدا ہو گیا۔ بالآخر ایک سوتے سے جس کو تنور سے تعبیر کیا ہے لیکن یہ صاف نہیں لکھا ہے کہ تنور سے کیا مراد ہے۔ پانی نکلنا شروع ہوا۔ حضرت نوح کو پہلے سے خیال تھا اور انہوں نے ایک کشتی بنا رکھی تھی اپنے ساتھیوں کو اس پر سوار کر لیا اور جانوروں کے جوڑے بھی رکھ لئے۔ تمام خلقت ڈوب گئی لیکن حضرت نوح اچھے اپنے ساتھیوں کے صحیح و سلامت رہے۔

## ذوالقرنین

قرآن میں ذوالقرنین کا قصہ ہے۔ لیکن ٹھیک پتہ نہیں لگتا کہ ذوالقرنین سے کیا مراد ہے غالباً یہ لقب اس بادشاہ کا ہے جس کا قصہ ہے۔ حضرت عیسیٰ سے کچھ ہی پہلے سکندر یونانی نے مشرق سے مغرب تک یعنی یونان سے ہندوستان تک فتح کر ڈالا تھا۔ اس کا پتہ سب کو معلوم تھا اور قرآن میں جس ذوالقرنین کا ذکر ہے اس نے بھی مشرق سے مغرب تک فتح کیا تھا۔ سکندر کے حالات پڑھ کر مسلمان سمجھے کہ ذوالقرنین سے وہی سکندر مراد ہے جو یونانی ہے۔ اس وقت کے مسلمان جغرافیہ ارض سے اس قدر واقف نہ تھے جتنا کہ اب نئی تحقیقات سے دریافت ہوا ہے اور اس لئے وہ ٹھیک مفہوم قرآن کا نہ سمجھ سکے اب تحقیقات جدید کے بعد قرآن کے معنی ٹھیک لگائے جائیں تو ذوالقرنین کوئی دوسرا شخص ٹھہرے گا اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں بالکل سنے سنائے قصے نہیں ہیں بلکہ ایسی باتیں بھی ہیں جو اس وقت کے لوگوں کو معلوم نہ تھیں۔ صرف پیغمبر کو اس خاص فیضان الہی کے ذریعے سے معلوم ہوئیں جس کا دوسرا نام رسالت ہے۔

قرآن میں مذکور ہے کہ ذوالقرنین کو خدا نے بہت بڑھایا اور سمجھ کی جانب وہ بڑھتے بڑھتے ایسے مقام پر پہنچا جہاں سیاہ کیچڑ کے کنڈل میں آفتاب غروب ہو جاتا ہے اور پھر



یورپ کی طرف بڑھتے بڑھتے ایسے مقام پر پہنچا جہاں لوگ جانوروں کی طرح بسر کرتے تھے ستر عورت بھی کسی چیز سے پھپھاتے نہ تھے۔ قرآن میں یہ بھی مذکور ہے کہ ذوالقرنین اتر جاتے جاتے ایک قوم کے پاس پہنچا جو اپنے ہمسایہ شمالی سے نہایت تنگ تھی۔ قرآن میں یہ شمالی قوم یا جوج اور ماجوج کے نام سے ذکر کی گئی ہے۔ اور یہ مذکور ہے کہ ان شمالی وحشیوں کا حملہ بچانے کے لئے دیوار تاتار ذوالقرنین نے بنائی تھی۔ دیوار تاتار دنیا میں صنعت انسانی کی نہایت مستقل یادگار ہے۔ اس قصہ کے ذکر کرنے کی غایت یہ ہے کہ اپنی صنعت اور ہمت پر ناز کرنے والے سلاطین سمجھیں کہ خدا نے دنیا میں ایسا بادشاہ بھی پیدا کیا تھا جو دیوار تاتار ایسی مستحکم یادگار چھوڑ گیا جسکی ثانی اس وقت بنا نامحال ہے مشرقی وحشیوں سے چین کے ساحل شرقی کے باشندے مراد ہوں جہاں تہذیب بہت دنوں کے بعد پہنچی اور مغرب میں سیاہ کچھڑ کے کنڈل سے بحر اسود سمجھا جائے تو ذوالقرنین کسی ایسے ملک کا بادشاہ ٹھہرتا ہے جسکے شمال میں دیوار تاتار اور پچھم بحر اسود ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترکستان۔ چینی تاتار اور چین خاص میں کوئی شہنشاہ اگلے زمانے میں ایسا زبردست گزرا ہے جس کے حکم سے دیوار تاتار بنائی گئی تھی اور تاریخ کی پرانی کتابوں سے بھی کچھ کچھ پتہ لگتا ہے کہ اگلے زمانے میں ایک بادشاہ ایسا گزرا ہے۔

## حضرت ابراہیمؑ

ان کا لقب خلیل اللہ ہے۔ ان کا تذکرہ بھی قرآن میں ہے اور مختلف جگہوں پر ہے کفار عرب اور یہودیوں کی انہیں کی نسل سے تھے اس لئے قرآن میں انکے ذکر کی زائد ضرورت تھی لوگوں کو یہ سمجھانا تھا کہ اگر باپ دادا ہی کے دین پر رہنے کے لئے وہ حریص ہیں تو ابراہیم کے دین پر چلیں کہ وہ بھی اجداد میں ہیں۔ گمراہ آباؤ اجداد کے طریقے اختیار نہ کریں۔ حضرت ابراہیم کے باپ آذر بت فروش اور مقرب سلطان تھے۔ بادشاہ بھی بت پرست تھا۔ حضرت ابراہیم کے عرفان کی کیفیت قرآن میں یوں لکھی گئی ہے کہ یہ اپنے طریقہ آباؤ یعنی بت پرستی سے متنفر تھے اور اس کو عقلاً برا سمجھتے تھے۔ ایک روز چاند نکلا تو اس کی پیاری پیاری صورت دیکھ کر یہ سمجھے کہ بت کی جگہ اسی کو خدا کیوں نہ سمجھیں پھر اتنے میں رات گزری دن آیا۔ آفتاب کی روشنی سب پر غالب ہوئی تو کہنے لگے کہ یہ تو بڑا زبردست معلوم ہوتا ہے۔ یہی خالق عالم ہوگا۔ پھر وہ بھی شام کو چھپ گیا تو کہنے لگے کہ خالق عالم کوئی دوسری



ہی قوت ہے جو پردہ میں بیٹھی ہوئی تماشہ دکھا رہی ہے اسی کو خالق سمجھنا چاہیے۔ جب وہ اس پر خوب اچھی طرح قائم ہوئے تو نور ایمان روز بروز ان میں بڑھنے لگا۔

ایک روز حضرت ابراہیم نے موقع پا کر تمام چھوٹے چھوٹے بت توڑ ڈالے اور جو سب سے بڑا تھا اس کو رہنے دیا۔ گھر والوں نے آکر پوچھا کہ کیا ہے۔ حضرت ابراہیم نے کہا کہ بڑے بت سے پوچھو۔ وہ سب سے بڑا ہے وہی جانتا ہو گا یا اسی نے یہ سب کچھ کیا ہو گا۔ لوگوں نے ابراہیم سے کہا اس پتھر سے کیا پوچھیں بھلا یہ بولنا جانتا ہے یا کچھ کرنے کی قدرت رکھتا ہے؟ ابراہیم نے کہا کہ پھر اسکی پرستش کیوں کرتے ہو۔ سب نے ابراہیم کو زندہ آگ میں ڈالنا چاہا کہ اس وقت سب سے سنگین یہی سزا تھی۔ حضرت ابراہیم کو خدا نے اس آفت سے بچا یا بچنے کی صورت زیادہ تفصیل سے نہیں بیان کی گئی ہے۔ قرآن میں صرف اتنا بیان ہے کہ خدا نے آگ سے کہا کہ ٹھنڈی ہو جاؤ۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں: ہم نے حکم دیا کہ اے آگ ابراہیم کے لئے ٹھنڈک اور سلامتی کی موجب ہو جاؤ۔ الانبیاء رکوع ۵۔ مفسروں نے لکھا ہے کہ آگ بالکل ٹھنڈی ہو گئی اور حضرت ابراہیم صحیح و سالم اس میں سے نکل آئے۔ ہم مسلمان ہیں اور ہم کو اس کے سچ ہونے میں شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ اگر خدا چاہے تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قانون قدرت کو خدا نہیں توڑتا تو وہ یوں سمجھ سکتے ہیں کہ خدا نے آگ سے ان کو کسی طرح بچا لیا جلنے کی نوبت نہیں آئی۔ دیکھئے کفار مکہ نے جب آنحضرت محمد کے قتل کے لئے آنحضرت کے گھر کا محاصرہ کیا تھا تو اپنی جگہ پر آنحضرت نے حضرت علی کو سلا دیا تھا اور خود مدینہ چلے گئے تھے۔ یہ سبھی تو خدا کا بچانا ہی تھا کہ تمام مکہ کے لوگ ایک شخص کے مار ڈالنے پر تلے ہوئے تھے اور وہ بچ کر چلا گیا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم بھی کسی طور سے بچ گئے ہوں گے۔ خدا نے اگر اس کو یوں کہا کہ ہم نے آگ کو حکم دیا کہ بچو جاؤ تو مجازاً ایسا کہنا درست ہے۔ پرانے قصے قرآن میں محض اشارہ اور کنایہ کے طور پر بیان کئے جاتے ہیں کیونکہ مقصود اصلی ہوتا ہے نصیحت کرنا نہ کہ قصہ بیان کرنا۔ قرآن کی فصاحت اور بلاغت کے لحاظ سے قرآن کا طرز بیان بھی ایک خاص قسم کا ہے خدا نے اگر آگ سے کہا کہ ٹھنڈی ہو جاؤ تو حاصل یہی ہوا کہ خدا نے ابراہیم کو آگ میں جلنے نہیں دیا ظاہری الفاظ کی پوری پوری پیروی کرنے کو تو کوئی بھی نہیں کہتا۔ یعنی یہ کسی کا خیال نہیں ہے کہ جس طرح ایک طرف لوگ حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈالنے کے لئے کھڑے تھے اسی طرح خدا دوسری طرف کھڑا اپنی زبان سے آگ کو حکم دے رہا تھا کہ ٹھنڈی ہو جاؤ۔ جس طرح کہنے کے مجازی معنی



لئے جائیں گے کہ زبان سے کہنا مقصود نہیں ہے اسی طرح آگ کا ٹھنڈا ہونا بھی یہ مفہوم رکھ سکتا ہے کہ آگ میں حضرت ابراہیم جلنے نہ پائے بلکہ آگ تک پہنچنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ تدبیر سے بچ گئے اس بچانے کو خدا سورہ عنکبوت کے رکوع ۳۔ اور طور سے بیان کرتا ہے: قوم کے پاس حضرت ابراہیم کی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا بجز اس کے کہ انہوں نے کہا کہ اسے مار ڈالا جائے یا جلا دینا چاہیے۔ لیکن اللہ نے اسے آگ سے بچا لیا! قرآن کے قصے زیادہ تر وہ ہیں جن کو لوگ پہلے سے جانتے تھے۔ ان قصوں کو یاد دلا کر لوگوں کو اسلام کی ترغیب دینے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے طرز بیان جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کچھ تو لسان تمثیلی کی رعایت سے ہے اور کچھ فصاحت کلام کے لحاظ سے ہے اس وقت کے مفسروں کو ملکی اور اخلاقی امور کی طرف زائد توجہ تھی۔ دوسرے علوم و فنون کی طرف متوجہ ہونے کی نہ ضرورت تھی اور نہ موقع تھا۔ اس لئے وہ سیدھے سیدھے طور پر قصہ کی تعبیر مشہور و معروف طریقے سے کرتے گئے دوسرے طور پر سمجھنے کی تو ضرورت اس وقت ہوئی جب اور علوم کی طرف بھی مسلمانوں کو توجہ ہوئی یا اور علوم جاننے والوں کے ساکت کرنے کی ضرورت ہوئی۔ قرآن کا معجزہ ہے کہ جس طرح اسکو سمجھو ٹھیک ہوتا ہے۔ جنگلی آدمیوں کو بھی وہ سمجھا سکتا ہے اور فلاسفہ وقت کو بھی تسکین دے سکتا ہے۔

ابراہیم کو اپنے وطن یعنی زمین بابل سے آ کر شام میں آباد ہونا پڑا۔ شام سے وہ مصر بھی گئے تھے مکہ میں خانہ کعبہ انہیں کی تعمیر ہے لیکن بیان یوں کیا جاتا ہے کہ پہلے بھی یہاں ایک عبادت خانہ تھا اور ابتداء خلقت آدم سے تھا جو منہدم ہو گیا تھا۔

حضرت ابراہیم بہت بوڑھے ہو گئے تھے اور کوئی اولاد نہ تھی۔ ایک دن فرشتوں نے کہا کہ آپ کے اولاد پیدا ہوگی۔ حضرت ابراہیم اور انکی بیوی کو حیرت ہوئی کہ پیرانہ سالی میں اولاد کیسے ہوگی لیکن خدا نے اولاد دی ایک بیوی سے حضرت اسمعیٰ اور دوسری سے حضرت اسمعیل ہوئے کبر سن میں اولاد کا پیدا ہونا ایک غیر معمولی بات تھی اس لئے خدا اس کا ذکر کر کے اپنی قدرت دکھاتا ہے فرشتوں کا مزدہ دینا بھی ہمارے نزدیک مستبعد نہیں ہے ابتداء عالم میں جب کچھ نہیں سے سب کچھ ہوا قانون قدرت کا طرز بھی موجودہ حالت سے ضرور ہی جدا ہوگا لیکن اس کو نہ ماننے والے اگر صرف اتنی ہی بات پر دین اسلام سے الگ ہو جاتے ہیں تو ہم ان کو یوں بھی سمجھا سکتے ہیں کہ ہر ایک انسان میں جو قوت ملکوئی یا قوت شیطانی دی گئی ہے اسی کی طرف یہاں بھی اشارہ ہے یعنی ابراہیم میں جو ملکوئی قوت تھی اس کے ذریعہ سے ان کو اور انکی بیوی کو آثار



معلوم ہوئے کہ لڑکا پیدا ہونے والا ہے اور ان کو سخت تعجب ہوا کہ اس کبر سنی میں یہ محض شان خدا ہے کہ جوانی میں یہ تمنا کبھی پوری نہیں ہوئی اور اب ناامیدی کی حالت میں امید قائم ہوئی۔

لڑکا اور وہ بھی بڑھا پے کا لڑکا۔ حضرت ابراہیم کو حضرت اسحق سے بے حد انس تھا خدا کو اپنے خلیل کی آزمائش منظور ہوئی اور حکم دیا کہ اسمعیل کو خدا کی راہ میں قربان کرو۔ حکم دینا وحی کے ذریعے سے تھا اور وحی آنا دو طور سے تھا خواب میں یا بیداری میں۔ قرآن میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے لڑکے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر رہے ہیں۔ سمجھے کہ خدا کا یہی حکم ہے اور لڑکے کو راہ خدا میں قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس واقعہ کے ذکر سے صرف آل ابراہیم کو یہ یاد دلانا مقصود تھا کہ خدا کی محبت میں اس کا دادا ابراہیم کس درجہ ثابت قدم تھا۔ قرآن میں مذکور ہے کہ حضرت اسحاق بھی قربان ہونے کو بخوشی راضی ہو گئے اس بیان سے حضرت اسمعیل کا بچپن ہی سے خدا شناس ہونا دکھایا گیا ہے اور نیز یہ بتایا گیا ہے کہ اپنے کاموں میں کس طرح باپ کی اطاعت لائق بیٹے کیا کرتے ہیں۔ یہیں یہ بھی جانا چاہیے کہ اخلاق اور تہذیب کے طریقے وقتاً فوقتاً بدلتے رہتے ہیں اس زمانے میں اللہ کی راہ میں اپنے کو قربان کرنا روانہ تھا اور اسی لئے حضرت ابراہیم بیٹے کے ذبح کرنے پر اسکی رضامندی کے ساتھ آمادہ ہو گئے۔ شرع محمدی میں اب یہ جائز نہیں ہے اور اس لئے اگر کوئی بسم اللہ اکبر کہہ کر اپنے گلے پر چھری پھر دے اور خدا کی راہ میں قربان ہونا چاہے تو شریعت ظاہری سے عاصی قرار دے گی۔

قرآن میں اس قربانی کا قصہ یوں ختم کیا گیا ہے کہ ہم نے ایک بڑی قربانی اسمعیل کا فدیہ دیا۔ اور آنے والی امتوں میں اس کا ذکر باقی رکھا۔ مفسروں نے یوں لکھا ہے کہ بہشت سے ایک موٹا دنبہ آیا اور وہ ذبح ہوا اور اسی روز سے ہر سال قربانی ابراہیم پر اور ابراہیم کی امت پر واجب ہوئی اور آنحضرت محمد کے مذہب میں بھی وہی وجوب قائم رہا۔ لیکن اگر بہشت سے دنبہ کا آنا نہ کہیں اور سیدھے سیدھے یوں سمجھیں کہ خدا نے پھر وہی کے ذریعے سے حضرت ابراہیم کو آگاہ کر دیا کہ بیشک تم میرے سچے دوست ہو لیکن بیٹے کو قربان نہ کرو یہ طریقہ برا ہے۔ تمہارا امتحان ہو چکا۔ اس کے عوہن میں بقر عید میں قربانی کیا کرو تو گویا یوں ہوا کہ بقر عید کی عالمگیر قربانی بجائے اسمعیل کی قربانی کے بطور فدیہ کے قائم ہوئی اور دوسری آیت کے معنی صاف ہیں کہ اس طرح سے آنے والی امتوں میں بھی حضرت ابراہیم کا ذکر خیر قائم ہو گیا۔ ہر ایک مسلمان جانتا ہے کہ بقر عید کی قربانی حضرت ابراہیم کے وقت سے اور اس طرح قائم ہوئی ہے۔



## حضرت یوسفؑ

حضرت ابراہیم کے دو بیٹے حضرت اسحاق اور حضرت اسمعیلؑ تھے۔ حضرت اسحاق کے ایک بیٹے کا نام حضرت یعقوبؑ تھا۔ حضرت یعقوب کے بہت سے بیٹے پیدا ہوئے جن میں حضرت یوسفؑ بہت صورت اور حسن اخلاق کی وجہ سے بہت زیادہ ممتاز تھے اور اسی لئے حضرت یعقوب ان کو بہت پیار کرتے تھے۔ بڑے بھائیوں کو حضرت یوسف کی حالت پر رشک آیا اور ان کو شکار کے جیلے سے گھر سے باہر لے جا کر ایک کنوئیں میں زندہ ڈال آئے بھائیوں نے تو حضرت یوسف کا خاتمہ ہی کر دیا تھا لیکن قدرت خدا کہ وہاں ایک قافلہ کا گزر ہوا اور سستی پانی بھرنے آیا تو روسی پکڑ کر حضرت یوسف باہر نکل آئے اور سردار قافلہ کے غلام ہوئے بکتے بکاتے شاہ مصر کے پاس پہنچے وہاں بادشاہ بیگم انکی طرف مائل ہوئی۔ یہ بھاگے تو شرمندہ ہوئی اور دباؤ ڈالنے کے لئے فریاد ہی ہوئی بادشاہ نے تحقیقات کی تو حضرت یوسف بے قصور پائے گئے ان کے بھاگتے وقت پیچھے کا دامن پھٹ کر شاہ بیگم کے ہاتھ میں رہ گیا تھا اور وہی شاہ بیگم کے خلاف ایک معقول شہادت تھی حضرت یوسف بچے تو سہی لیکن پھر مصلحتاً زندان میں بھیج دیئے گئے۔ زندان میں جانے سے قبل شہر میں اس واقعہ کا چرچا ہوا تو ہم چشم عورتوں نے شاہ بیگم کو چھیڑنا شروع کیا۔ شاہ بیگم نے ایک روز ان عورتوں کو جمع کیا اور سب کے ہاتھ میں ترنج اور چاقو دیدیئے اور کہا کہ تراشوا اور اسی حالت میں حضرت یوسف کو بلا بھیجا۔ حضرت یوسف آئے تو ان کا حسن و جمال دیکھ کر عورتیں گھبرا گئیں اور حالت بدحواسی میں بجائے ترنج کاٹنے کے انگلیاں زخمی کر لیں۔ ان عورتوں نے تو شاہ بیگم کو ضرر و نفع قابل الزام قرار دیا لیکن زبان خلق کو کون روکتا۔ اس واقعہ سے اور بھی شاہ بیگم کی رسوائی بڑھی اور حضرت یوسف کا زندان میں بھیجنا ناگزیر سمجھا گیا زندان میں بادشاہ کا ایک ندیم چند روز کے لئے معسوب ہو کر بھیجا گیا تھا۔ جب اس کی صفائی ہوئی اور پھر اسکو تقرب شاہی نصیب ہوا تو اس کے ذریعہ سے حضرت یوسف کی عقل و فراست کی خبر دربار میں پہنچی بادشاہ نے ایک خواب دیکھا جس کی تعبیر حضرت یوسف نے یہ کی کہ آئندہ قحط آنے والا ہے اور پھر اس قحط کی مصیبتوں سے بچنے کے لئے ترکیب بھی بتائی۔ وہ زندان سے پھر بادشاہ کے پاس پہنچے لیکن اب کی زمرہ غلامان میں نہ تھے بلکہ ندیموں میں تھے۔ رفتہ رفتہ اراکین دولت میں داخل ہوئے اور بادشاہ کے مرنے پر مصر کے بادشاہ ہوئے ان کے عہد سلطنت میں وہی دشمن بھائی غلہ لینے کے لئے مصر گئے تو حضرت یوسف نے ان کو پہچانا اور تھوڑے سے اسباب لطف فراہم کرنے کے بعد اپنے والدین کو مصر میں بلوا بھیجا اور بے حد تعظیم و تکریم انکی کی اور اسی



سلسلہ میں اپنے دشمن بھائیوں پر بہت کچھ احسان کیا اور وہ حضرت یوسف کا کرم دیکھ کر بہت  
محبوب ہوئے۔

اس قصہ سے مفصلہ ذیل باتیں پیدا ہوتی ہیں۔

۱۔- عدو بود سبب خیر گر خدا خواہد۔ جو فعل حضرت یوسف کا باعث ہلاکت خیال کیا گیا تھا  
وہی انکی شاہی کا سبب ہوا۔

۲۔- خدا کو کسی کے گھٹانے یا بڑھانے میں یا عزت و ذلت دینے میں دیر نہیں لگتی اس نے  
آغوش پدر سے نکال کر حضرت یوسف کو کنوئیں میں ڈالا۔ کنوئیں سے وہ نکلے تو غلام ہوئے  
حالت غلامی میں اس رتبہ کو پہنچے کہ شاہ بیگم کی نظر پڑنے لگی پھر اس عیش سے جدا ہو کر زندان  
میں بھیجے گئے۔ جہاں چوراچکے اٹھائی گئے بند رہتے تھے زندان سے نکل کر جو ایک بارگی ترقی  
کے زینہ پر چڑھنے لگے تو مصر ایسے ملک کے بادشاہ ہوئے جو اس زمانے میں تمام دنیا میں منتخب  
سمجھا جاتا تھا۔

۳۔- اس قصہ میں یہ تعلیم بھی دی گئی ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی برائی کرے تو تم اس کے ساتھ  
بھلائی کرو کہ یہ بھلائی دیکھ کر وہ دشمن محبوب اور شرمندہ ہوگا۔ اور اس طرح جو روحانی تکلیف  
اس کو ہوگی وہ اور طور پر شاید نہ ہو سکے۔

## حضرت داؤدؑ

یہ پیغمبر تھے اور بادشاہ بھی تھے۔ ان کے پاس ننانوے بیویاں تھیں۔ کسی سپاہی کی بیوی ان کو پسند آئی  
مگر شوہر اس کا زندہ تھا اس لئے اس کو زوجیت میں نہیں لے سکتے تھے۔ اتفاق سے کوئی لڑائی پیش آئی  
اس کے شوہر کو وہاں بھیجا گیا اور وہ مارا گیا۔ باقی ننانوے بشریت ان کو مسرت ہوئی ہوگی۔ خدا کو اس نوزائش  
پر متنبہ کرنا منظور ہوا۔ آپ کے سامنے ایک روز دو شخص لڑتے ہوئے آئے آپ نے وجہ مخالفت  
پوچھی تو ایک نے بیان کیا کہ میں دوسرے کا بھائی ہوں اس کے ننانوے بیویاں ہیں اور میرے پاس  
صرف ایک ہے یہ اسکو بھی نہیں دیکھ سکتا اور مجھ سے بہ جبر میری دینی لینا چاہتا ہے۔ حضرت داؤد  
نے کہا یہ بڑا ظلم ہے اس کے بعد ان کو خیال آیا اور سمجھے کہ ان کا حال تو بھنبہ اس ظالم کا سا ہے کہ  
ننانوے بیویاں گھر میں موجود ہیں اور پھر دوسرے کی بیوی پسند آتی ہے۔ حضرت داؤد نے اس  
واقعہ کے بعد خدا سے توبہ کی۔ اور پریشان ہوئے۔ خدا نے توبہ قبول کی اس



قصہ سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ انسان سے قصور ہو ہی جاتا ہے اور توبہ کرنے سے خدا معاف بھی کر دیتا ہے اس کے بعد خدا کی طرف سے جو نصیحت کی گئی وہ یہ ہے۔ داؤد ہم نے تم کو زمین کا بادشاہ بنایا ہے۔ تم آدمیوں میں منصفانہ حکم دیا کرو۔ خواہش نفس کی پیروی نہ کرو ورنہ یہ تم کو راہ خدا سے پھیر دیگی اور جو لوگ راہ خدا سے پھر جائیں گے ان پر روز حساب کو دل سے بھلا دینے کی وجہ سے عذاب شدید ہوگا۔

## حضرت سلیمان

حضرت داؤد کے بیٹے حضرت سلیمان بھی پیغمبر ہوئے اور وئے زمین کے بڑے بادشاہوں میں ہوئے کہ جن وانس، ہوا، طیور بھی ان کے قابو میں تھے۔ الفاظ قرآن ایسے ہی ہیں اور لسان تمثیلی سمجھ کر اگر یوں معنی پیدا کئے جائیں کہ علم و ہنر اور زور و دران میں اس قدر تھا کہ ہر شے ان کے تابع تھی جب بھی ممکن ہے۔ غبارہ کے اٹنے والے کو کہہ سکتے ہیں کہ ہوا پر بھی ان کا قابو ہے سرکس کے تماشہ کرنے والے وحشی جانوروں پر کیسا قابو رکھتے ہیں۔ تاریخوں سے ثابت ہے کہ بنی اسرائیل کی اعلیٰ ترقی کا زمانہ ایسا تھا کہ اب اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ خدا قرآن میں یہ دکھاتا ہے کہ ہم نے سلیمان ایسے پیغمبر بھی پیدا کئے ہیں جو ہر چیز پر قادر تھے۔ کوئی بادشاہ اپنے زور اور حکومت پر اترا نا چاہے تو اس کو حضرت سلیمان کے حالات پڑھ کر سمجھنا چاہیے کہ ابھی وہ حضرت سلیمان کا پاسنگ بھی نہیں ہے۔

قرآن میں حضرت سلیمان کے لشکر کا یوں ذکر ہے کہ لشکر کی آمد ہوئی تو چوہنٹیاں سوراخ میں چلی گئیں وہ ڈر میں کہ ہم سب پامال نہ ہو جائیں۔ قرآن میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ تمام حاضر تھے ہڈی حاضر نہ تھا۔ سلیمان نے پوچھا پوچھا تو معلوم ہوا کہ سب کی ملکہ بلقیس کی خبر لانے گیا تھا۔ حضرت سلیمان نے سنا کہ بلقیس کی بادشاہت میں لوگ آفتاب پرست ہیں جو اب وہی کے لئے بلقیس طلب کی گئی اسکے آنے میں ذرا دیر ہوئی۔ دیو (شیطان) تعینات ہوئے۔ معلوم نہیں کہ ہڈی اور دیو سے کیا استعارہ۔ یا کنایہ ہے۔ بہر حال اس سے سمجھانا ہے کہ سلیمان کی حکومت کس درجہ بڑھی ہوئی تھی۔ پھر قرآن میں حضرت سلیمان کے محل کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ بلقیس مکان میں چلی تو فرش زمین کا شیشہ کا تھا وہ پانی سمجھ کر پاٹھ چڑھانے لگی آجکل اس قدر صنعت کو ترقی ہے پھر بھی شیشہ کی اتنی بڑی چادر کہ فرش زمین ہو سکے کہیں نہیں دیکھی گئی۔ خدا ظاہر کرتا ہے کہ جس قدر سلیمان کو عیش و آرام حکومت و طاقت دی گئی تھی دوسرے کو نہیں دی گئی۔ حضرت سلیمان کا قصہ لوگوں کا غرور کم کرے گا۔



خدا سے ذرا سی نعمت پا کر جو لوگ خود کو اور اپنے ساتھ خدا کو بھی بھول جاتے ہیں ان کو اس قصہ میں بڑا سبق دیا گیا ہے کہ ظرف ہو تو حضرت سلیمان کا سا۔ اتنا خدا نے ان کو دیا پھر بھی وہ خدا کو نہیں بھولے اور نہ خود کو بھولے کہ انسان ایک قطرہ آب سے پیدا ہوا ہے اور پھر اس کو خاک میں مل جاتا ہے۔

## حضرت موسیٰ

حضرت موسیٰ کا قصہ قرآن میں یوں مذکور ہے کہ فرعون جو قبلیوں کی انتہائی ترقی کے زمانے میں تھا صرف بادشاہت کا مدعی نہ تھا بلکہ الوہیت کا بھی مدعی بن بیٹھا تھا۔ بنی اسرائیل جو اپنے زمانے میں دنیا کی اعلیٰ ترین قوم سے تھے اپنے اعمال کی برائیوں سے گرتے گرتے ذلت کی انتہا تک پہنچ گئے تھے آج کل ہندوستان میں جس طرح برہمن اور چھتری چاروں سے خد متیں لیتے ہیں اس سے بھی برے طور سے قبلی بنی اسرائیل سے پیش آتے تھے۔ خدا کو منظور ہوا کہ بنی اسرائیل کو پھر عروج دے اور ان کے ہاتھ سے فرعون ہلاک ہو اور قبلیوں کا زوال ہو۔ فرعون کو منجوں نے خبر دی کہ عجب نہیں تیری ہلاکت کے لئے بنی اسرائیل میں کوئی شخص پیدا ہو۔ فرعون نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل میں چلنے لڑکے پیدا ہوں وہ ہتھ تیغ کئے جائیں صرف لڑکیاں زندہ رہیں۔ ایسی حالت میں موسیٰ پیدا ہوئے اور حضرت موسیٰ کی ماں نے بادشاہ کے خوف سے حضرت موسیٰ کو صندوق میں بند کر کے دریا میں پھینک دیا۔ دریا سے ایک نہر باغ شاہی میں جاتی تھی۔ صندوق فرعون کی بیوی کے ہاتھ لگا انھوں نے حضرت موسیٰ کی پرورش کی اور اتفاق سے حضرت موسیٰ کی ماں دودھ پلانے کے لئے لوکر بھی رکھ لی گئیں۔ خدا اپنی قدرت دکھاتا ہے کہ دشمن کے گھر حضرت موسیٰ پلنے لگے اور خود فرعون کی گود میں کھیلنے لگے۔ جب وہ ذرا سن شعور کو پہنچے تو ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس سے ان کو مصر چھوڑنا پڑا۔ دارالحکومت فرعون میں بنی اسرائیل کا ایک مزدور جا رہا تھا اس پر کسی قبلی نے سختی کی۔ حضرت موسیٰ کو حب قومی نے جوش دلایا اور انھوں نے اس قبلی کو ٹھونکا۔ وہ اجل رسیدہ مر گیا اور حضرت موسیٰ کو وہاں سے مفرور ہونا پڑا۔ حضرت موسیٰ جاتے جاتے حضرت شعیب کے پاس پہنچے اور انکی لڑکی سے بیاہ کیا۔ حالت سفر میں تاجر بہ ہوا۔ عقل پختہ ہوئی۔ نبوت عطا ہوئی قبلیوں کو راہ راست پر لانے کے لئے یہ پھر مصر آئے بنی اسرائیل نے ان کا ساتھ دیا۔ قبلیوں نے نافرمانی کی لڑائی ہوئی فرعون کی ہلاکت ہوئی قصہ ختم ہوا۔ اس قصہ میں جس قدر اخلاق کی تعلیم ہے اور حکمت اور معرفت کی باتیں ہیں ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خود عیاں ہے



فرعون کے جادوگروں سے بھی حضرت موسیٰ کا مقابلہ ہوا اس کے سمجھنے کے لئے سحر و جادو  
فصل ۵۱ پڑھیے۔

## حضرت خضر علیہ السلام

حضرت خضر کا ذکر قرآن میں نہیں ہے لیکن ایک حکایت حضرت موسیٰ کے سفر کی مذکور ہے  
سفر کے ساتھ ہی کا نام قرآن میں مذکور نہیں ہے لیکن مفسروں نے اس نامعلوم شخص کو خضر لکھا ہے۔  
صورت قصہ یوں ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر ایک سفر میں ساتھ ساتھ چلے خضر نے معیت  
اس شرط سے قبول کی تھی کہ حضرت موسیٰ انکی حرکات پر معترض نہ ہوں۔ قصہ سے یہ مستنبط ہوتا ہے  
کہ خضر اس حالت میں حضرت موسیٰ سے زائد تر واقع رموز الہی تھے۔

حضرت خضر نے ایک لڑکے کو راستے میں مار ڈالا تھا۔ حضرت موسیٰ نے کہا یہ حرکت نامناسب  
تم نے کی۔ خواجہ خضر نے کہا مجھ سے تم سے یہ شرط تھی کہ تم میرے کاموں میں دخل نہ دو گے حضرت  
موسیٰ نے کہا کہ اچھا اب نہ بولوں گا۔ آگے چل کر حضرت خضر نے ایک کشتی ڈبا دی۔ حضرت موسیٰ  
نے اس پر بھی اعتراض کیا۔ خضر نے پھر انکا وعدہ ان کو یاد دلایا اور وہ پھر منفعل ہوئے۔ پھر یہ  
دونوں ایک گاؤں میں گئے جہاں کے باشندے نہایت بے اعتنائی کے ساتھ پیش آئے کھانے  
کو بھی نہ پوچھا۔ حضرت خضر بجاٹے ناغوش ہونے کے اس قدر خوش نظر آئے کہ ایک دیوار جو قریب  
الانہدام تھی مرمت کر دی۔ حضرت موسیٰ نے کہا کہ مجھ کو بولنے کا تو کوئی حق نہیں ہے لیکن میں  
صرف اتنا کہتا ہوں کہ دیوار بنوانے کی مزدوری تو نے لو کہ کچھ کھانے کا سہارا ہو۔ حضرت خضر نے کہا کہ آپ  
کی معیت کو سلام ہے میرا آپ کا ساتھ نبھنے والا نہیں ہے۔ فی امان اللہ میں رخصت ہوتا ہوں اور  
چلتے چلتے اپنے افعال کی وجہ بھی تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ جس لڑکے کو میں نے قتل کیا اس کے والدین  
صالحین سے ہیں اور یہ لڑکا ولی کے گھر شیطان پیدا ہوا تھا اور اس کے بعد دوسرا لڑکا ایسا پیدا ہونے  
والا ہے جو اپنے والدین کے قدم بہ قدم ہے۔ اس لڑکے کو مار کر میں نے اس کے والدین پر بڑا احسان  
کیا ہے۔ کشتی میں نے اس لئے ڈبا دی تھی کہ اس بے چارے غریب ملاح کو صرف ایک اسی کشتی کا  
سہارا تھا اور ایک بادشاہ ظالم کے آدمی کشتی گرفتار کرنے کے لئے مامور ہوئے تھے۔ جب تک ملاح  
کشتی نکالیں گے اور اسے درست کریں گے تب تک ظالموں کا گروہ وہاں سے چلا جائے گا اور اسکی  
کشتی بچ جائے گی۔ دیوار میں نے اس لئے بنا دی تھی کہ اس کے نیچے ایک خزانہ تھا اور خزانے کا  
مالک ایک یتیم بچہ تھا جس کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ مزدوری لیتا تو کس سے لیتا اور دیوار گر جاتی



خزانہ لوٹنے جانتے۔ اب وہ یتیم جب سن شعور کو پہنچے گا تو اس خزانے کو کھود کر تصرف کرے گا۔  
 الخیر فی ما وقع "جو ہوا اچھا ہوا جو شخص اس کا مفہوم سمجھتا ہے اس کو بہت کم دنیا میں تاسف  
 کی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ موجودہ حالت پر صبر کرنا اور خیال کرنا کہ خدا اس میں کوئی سبھلائی سمجھتا ہوگا  
 انسان کو نہایت آرام سے رکھتا ہے۔ خدا کے فعل کو خالی از حکمت نہ سمجھنا اور ہر امر کی نسبت یہ  
 خیال کرنا کہ ممکن ہے راز الہی کچھ اور معنی رکھتا ہو۔ مفصلہ بالا قصہ میں بیان کیا گیا ہے۔ جو انسان اس  
 کے نتیجہ پر دھیان رکھے گا وہ اوروں سے نسبتاً زائد خوش رہ سکتا ہے۔  
 اس قصہ میں درپردہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ رموز الہی سے پورے طور پر کوئی انسان واقف  
 نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ حضرت موسیٰ بھی جنکو کلیم اللہ کا خطاب ملا ہمہ دانی کے مدعی نہ ہو سکے۔

## قارون

قارون ایک بڑا مالدار تھا اس کے خزانے کی کنجیاں کئی آدمیوں کا بوجھ تھیں۔ دولت کے  
 نشہ میں وہ خدا کو بھول گیا اور سمجھا کہ اس کے قوت بازو سے سب کچھ ہے بالآخر خدا کی نافرمانی کرنے  
 لگا زیر دستوں پر ظلم کرنے لگا اور اس کے عزور کی کچھ انتہا نہیں رہی۔ لوگ اسے دیکھ کر دل میں  
 کہتے تھے کہ اللہ قارون پر اس درجہ مہربان ہے اور ہماری خبر نہیں لیتا اسے کاش ہم بھی قارون کے  
 سے زردار ہوتے۔ خدا نے ایک دن قارون کا خزانہ اور مکان زمین میں دھنسا دیا۔ دوسرے  
 دن لوگوں نے یہ عبرت ناک واقعہ دیکھ کر کہا خدا کا شکر ہے کہ ہم قارون کے سے نہ ہوئے۔  
 اس قصہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس کو خدا دے وہ خدا کی راہ میں بھی کچھ خرچ کرے۔ خدا بر تو  
 پاشد تو بر خلق پاش۔ قارون کی طرح ایک دن سب کو دولت چھوڑنا ہے پھر۔ برائے نہادن چہ  
 سنگ و چہ زر۔ نہ دولت پر اترانا چاہیے اور نہ اس کو جائزہ مقام پر خرچ کرنے سے دریغ کرنا چاہیے  
 اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جو لوگ بڑے روپے والے ہیں ان پر دوسروں کو رشک نہ کرنا چاہیے زائد  
 روپے والے بھی روپے سے اتنا ہی فائدہ اٹھاتے ہیں جتنا کم روپے والے قارون کی دولت اس  
 کے کس کام آئی۔ جو لوگ اپنی بے سمجھی سے ایک دن پہلے قارون کی حالت قابل رشک سمجھتے تھے  
 وہی دوسرے دن اسے قابل تاسف سمجھنے لگے۔

قارون پر کیا خصوصیت ہے دنیا میں۔ جینے قارون کے سبھائی ہیں سب کی یہی کیفیت ہے  
 لوگوں کو چاہیے کہ مالداروں کی حالت دیکھ کر رشک نہ کریں اور نہ اپنے دل میں دولت کو کوئی



بڑی چیز سمجھیں۔ دل غنی رہنا چاہیے اور چشم سیر رہنا چاہیے۔ ہر شخص دنیا میں اتنا فائدہ حاصل کرتا ہے جتنا اسکی قسمت میں ہے۔ زائد دولت بھی وبال جان ہوتی ہے۔ دنیا میں جتنے لوگ روپیہ جمع کرتے ہیں تمام عمر فکرِ زر میں پریشان رہتے ہیں وہ زرہ خاک بھی نہیں پاتے برائے نہادوں چہ سنگ و چہ زر اور دوسروں کے لئے اپنا اندوختہ چھوڑ جاتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ اگر چشم بینا ہو تو سبق حاصل ہوتا رہے۔ ابھی تھوڑے دنوں کا تذکرہ ہے کہ یورپ میں ایک بڑا مالدار یہودی اپنے خزانے کی کوٹھری یا ہتھ خانے میں گھسا۔ قارون ثانی اس کو سمجھنا چاہیے کوٹھری میں الماریاں اور درجے اتنے تھے کہ بھول بھلیاں بن گئے روشنی لے کر وہ گھسا اور گھستے وقت دروازہ بند کر تا گیا۔ روشنی گل ہو گئی اور کئی دن تک وہ اس میں پریشان پھرا۔ چیخ کی آواز باہر آتی نہ تھی۔ بخیل ایسے موقع پر بہت چھپ کر کام کرتے ہیں دوسروں کو خبر بھی نہ ہوتی کہ آج درخزانہ دا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مر گیا اور مرتے وقت ایک کاغذ پنسل سے اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر یہ لکھ گیا کہ "آج میری دولت کا شمار نہیں ہے لیکن ایک پیالہ چائے اور ایک بسکٹ کے نہ ہونے سے جان جاتی ہے"

قارون کے قصے لکھنے سے یہ سبق دینا منظور ہے کہ مالدار دوسروں پر احسان کرنا سیکھیں اور مفلس مالداروں کو ضرورت سے زیادہ محترم سمجھ کر اپنے دل میں بے جا کمزوری پیدا نہ کریں اور نہ خود کو حقیر اور خدا کو غیر منصف سمجھیں۔

## حضرت یونس

حضرت یونس کا قصہ مختصر طور پر یوں مذکور ہے کہ حضرت یونس کشتی پر جا رہے تھے کشتی رکی ایک شخص کو کشتی سے گرا دینے کی ضرورت معلوم ہوئی۔ قرعہ ان کے نام پر ڈالا گیا۔ مچھلی انکو نگل گئی۔ یہ مچھلی کے پیٹ سے زندہ بچ کر نکلے لیکن گھائل تھے اور کدو کے بیل کے نیچے پڑے رہے مفسرین لکھتے ہیں کہ کدو کے پتوں کے سایہ میں مکھیاں نہیں آئیں۔ اور یونس کے لئے بہت ضرورت اس کی تھی کہ مکھیاں نہ آنے پائیں۔ مکھیوں کی وجہ سے زخموں میں کیر پڑے پڑ جانے کا احتمال ہوتا ہے ناک گھڑیاں وغیرہ ایسے جانور ہیں جو آدمی کو کھا جاتے ہیں اور سمندر کی مچھلیاں بھی ایسی ہیں جو آدمی کو نگل جاتی ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان جانوروں سے آدمی نیم جان ہو کر بچ نکلتا ہے اس قصہ میں دکھایا گیا ہے کہ طرح طرح کی مصیبتیں انسان کے لئے ہیں جن سے پیغمبر بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔



مفسرین نے یوں لکھا ہے کہ حضرت یونس کی امت گمراہ تھی ان پر عذاب آنے والا تھا۔ یونس بھاگ نکلے اور لوگوں کو بھی متنبہ کر دیا۔ لوگوں سنکر شہر خالی کر دیا۔ اب عذاب آتا تو کس پر۔ حضرت یونس کو خیال گزرا کہ اب قوم میں جانا اپنی ہنسی کرانا ہے اس لئے وہ ایک طرف بھاگ نکلے راستہ میں ایک مچھلی ان کو نگل گئی اور وہ کچھ دنوں تک مبتلائے الام رہے۔

## حضرت عیسیٰ

حضرت عیسیٰ کا قصہ بھی قرآن میں مختلف مقامات پر ہے جس طرح سے حضرت موسیٰ کی پرورش میں قدرت خدا ہے کہ وہ دشمن کے گھریلے اسی طرح حضرت عیسیٰ کی پیدائش میں یہ شان ایزدی ہے کہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے بغیر باپ کے لڑکے کا پیدا کرنا خدا کے لئے کوئی بات نہیں ہے حضرت عیسیٰ کی ماں مریم تو موجود تھیں۔ زیادہ اچھا تو یہ ہے کہ حضرت آدم کی ماں سخی نہ باپ تھا پھر ان کو خدا نے پیدا کیا۔ جو لوگ یہ خیال رکھتے ہیں کہ جب خدا نے ایک طور پر سلسلہ توالد سل قائم کر دیا تو پھر اس قاعدہ کو خدا نہیں توڑتا ان کے سمجھانے کے لئے ہم وہی کہہ سکتے ہیں کہ جو اس خصوص میں بہت سے ڈاکٹروں نے کہا ہے یعنی عورت کے شکم میں دونوں قوتیں پیدا ہو سکتی ہیں جن کے اتصال سے توالد و تناسل کا سلسلہ معمولی طور قائم رہتا ہے۔

حضرت عیسیٰ کی زندگی بہت سادہ تھی۔ نہ انھوں نے شادی کی اور نہ گھر بنایا لوگوں کو راہ خدا دکھاتے پھرتے تھے۔ اخیر اخیر یہودان کے دشمن ہو گئے اور ان کو سولی پر چڑھانا چاہا۔ یہ رہتے جوگی تھے۔ آج یہاں کل وہاں۔ یہ دشمنوں کے ہاتھ نہ آئے ان کے شہر میں دوسرا شخص سولی پر چڑھایا گیا جب ان کا وقت آیا تب یہ بھی مرے اور گناہ حالت میں مرے۔ مرنے کے وقت ان کے معتقدوں کا گروہ کسی شمار میں نہ تھا۔ لیکن ان کے بعد ان کے وعظ اور نصیحت کی قدر بڑھی اور ان کے پروردگار بڑھتے گئے۔

## اصحابِ کہف

چند اصحاب ایسے تھے جو بت پرستی سے متنفر تھے لیکن بادشاہ وقت بت پرست تھا جسکی وجہ سے ان کو اپنی جان کے لئے پڑ گئے اور بھاگ کر کسی غار میں چھپے کہ وہیں چھپ کر خدا کو یاد کریں اور خیال کیا کہ اس کے بعد جو ہونا ہے ہو رہے گا اس وقت مخالفین سے بچنے کی یہی صورت تھی خدا کی قدرت کہ انکو وہاں نیند آئی اور وہ سو گئے۔ سو کر اٹھے تو آپس میں پوچھنے لگے کہ کتنی دیر



تک ہم سوئے مگر کچھ ٹھیک رائے قائم نہ کر سکے ان میں سے ایک آدمی بازار میں سودا خریدنے چلا کہ اپنے بھائیوں سے چھپ چھپا کر کوئی سودا خرید لائے کیونکہ بھوک کی بتیابی غار سے باہر نکلنے پر مجبور کرتی تھی۔ بازار میں جانے پر بازار کی صورت ہی دوسری نظر آئی اور وہاں بازار والوں نے اس عجیب الخلق آدمی کو دیکھ کر تعجب کیا سکہ جو اس نے پیش کیا تھا وہ تین سو برس کا تھا حالت یہ تھی کہ تین سو نو برس تک وہ سوتے رہ گئے تھے اس درمیان میں حضرت عیسیٰ پیغمبر مبعوث ہوئے اور عیسائی مذہب پھیلا اور شہر کا بادشاہ بجائے بت پرست کے اب عیسائی مذہب کا تھا اصحاب کہف بادشاہ کے سامنے پہنچائے گئے بادشاہ نے انکی بڑی تعظیم کی اس واقعہ سے وہاں کے عیسائیوں کے نور ایمان میں بھی روشنی بڑھی اور وہ کہنے لگے کہ جو خدا تین سو برس تک سلا کر پھر جگا سکتا ہے وہ بالکل جان سے مار کر حشر کے دن زندہ بھی کر سکتا ہے اس میں سب قدرت ہے ہم مسلمانوں کو اس قصہ کی صحت میں کوئی شبہ نہیں ہے بس اتنا جاننا ہمارے لئے کافی ہے کہ یہ قصہ قرآن میں ہے اور جو کچھ قرآن میں ہے سب سچ ہے لیکن جو لوگ غیر معمولی بات کے سچا سمجھنے میں خواہ مخواہ توضیح اور دلائل تلاش کرتے ہیں ان کے سمجھانے کے لئے ہم یہ کہتے ہیں کہ اب بھی ہندو فقر بہت سے ایسے ہیں جو سوال نہ برہانڈ میں چڑھا کر ایک جگہ بیٹھ جاتے ہیں اور برسوں اسی حالت میں رہتے ہیں۔ تمام بدن میں آثار موت نظر آتے ہیں۔ صرف دماغ میں گرمی رہتی ہے سندر بن میں اب بھی ایسے فقرا ہیں۔ سھوڑے روز کا ایک واقعہ بنگال میں عام طور پر مشہور ہے کہ ایک انگریز ایک ایسا ہی آدمی سندر بن سے اٹھا لایا تھا۔ کلکتہ میں وہ بہت روز تک تماشا بنا رہا۔ صرف دل و دماغ میں اس کے گرمی تھی اور بدن سڑتا نہ بھتا یہی دو علامتیں اسکی زیت کی تختیں ورنہ اور طور سے وہ مردہ تھا۔ انگریزوں نے بہت ترکیب کی کہ اس کو بیدار کریں مگر وہ بیدار نہ ہو سکا۔ علم جوگ سے انگریز واقف نہیں ہیں اس لئے انکی تدبیریں بیکار ثابت ہوئیں بالآخر اس کو کوئی گرم چیز کھلائی گئی شراب یا رندھی کا تیل جس سے اس کو ایک دست آیا اور دست کے ساتھ وہ دماغی حرارت جس زیت باقی تھی جاتی رہی اور وہ مر گیا اس وقت سے یہ حکم صادر ہوا کہ ایسوں سے تعرض نہ کرنا چاہیے۔

ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ اصحاب کہف کی نیند کو ہم ایسی ہی نیند سمجھتے ہیں۔ ہم خدا کو قادر مطلق جانتے ہیں تو پھر کوئی چیز ہمارے لئے قابل حیرت نہیں ہے اگر یہ مان لیں کہ خدا کبھی قانون فطرت نہیں بدلتا تو یہ کیا ضروری ہے کہ تمام قوانین فطرت ہماری سمجھ میں بھی آجائیں بلکہ ہمارا



ایمان ہے کہ اس کے سمجھنے سے ہم قاصر ہیں لیکن اگر منکرین کے ساکت کرنے کے لئے یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ اصحاب کہف جوگ کے طریقہ سے یا الہی کرتے تھے اور وہ ہذا طوار ملکی بھائیوں سے کنارہ کش ہو کر غار میں جا بیٹھے تھے اور تین سو نو برس تک وہ جس دم کر کے ایک حالت سے پڑے رہ گئے تب بھی ماحصل ایک ہی ہے یعنی خدا میں یہ قدرت ہے کہ جس دم کے طریقے جاننے والوں کو وہ مدتوں تک ایک حالت پر بیدم رکھ سکتا ہے اور پھر جگاتا ہے۔ تو وہ اپنی اصلی حالت پر آ جلتے ہیں۔

## لقمان

لقمان کا ذکر بھی قرآن میں ہے۔ معلوم نہیں یہ وہی یونانی حکیم ہیں جنکا ذکر یونان کے حکیموں کے سلسلہ میں بھی پایا جاتا ہے یا کوئی دوسرے بزرگ ہیں۔ خدا نے قرآن میں فرمایا ہے کہ ہم نے لقمان کو حکمت یعنی دانائی عطا کی تھی اور وہ اللہ کا شکر گزار بندہ تھا۔ لقمان نے جو نصیحت اپنے بیٹے کو کی تھی اس کا ذکر بھی قرآن میں ہے۔ سورہ لقمان رکوع اول سے ہم ترجمہ کرتے ہیں۔

بیٹا کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرانا یہ بڑا گناہ ہے۔ بیٹا! رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی عمل ہوگا پتھر میں ہو گا یا یا آسمان و زمین میں کہیں ہوگا تو خدا سے روز حشر میں سامنے کر دے گا خدا باریک بین اور باخبر ہے۔ بیٹا! نماز پڑھا کر و اور اچھے کاموں کی ترغیب دو اور برے کاموں سے منع کرو اور جیسی پڑے جھیلو کہ ہمت کی یہی باتیں ہیں۔ لوگوں سے بے رحمی نہ کرو زمین پر اثر کر مت چلو اللہ اترانے والے اور شیخی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا رفتار میں میانہ روی اختیار کرو اور آہستہ آہستہ بوسب سے بری آواز گدھوں کی ہے۔

## اصحاب فیل

اصحاب فیل کے واقعہ کی طرف سورہ فیل میں یوں اشارہ کیا گیا ہے۔

تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا کیا انکی چال اس نے غلط نہیں کر دی۔ ان پر اس نے مصائب کے غول بھیجے جس نے ان کو اس آفت میں مبتلا کیا جو انکے لئے لکھی ہوئی تھی اور کھائے ہوئے بھوسے کی طرح انکو کر دیا۔

تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا کیا انکی چال اس نے غلط نہیں کر دی ان پر اس نے غول کے غول چڑیاں بھیجیں جنہوں نے ان پر پتھر کی کنکریاں پھینک کر انکو کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا۔



سورہ فیل میں یہ قصہ لکھا ہوا ہے لیکن صورت قصہ میں اختلاف اور اسی کی رعایت سے اس سورہ کے ترجمہ میں بھی اختلاف کیا جاتا ہے دونوں ترجمے اوپر لکھ دیئے گئے ہیں پہلا ترجمہ لفظی ترجمہ ہے اور دوسرا ترجمہ محاورہ کے اعتبار سے ہے۔ ترجمے دونوں صحیح ہیں فرق اتنا ہے کہ پہلے ترجمہ میں مافوق العادت باتیں ہیں اور دوسرے میں کوئی بات مافوق العادت نہیں ہے اور تاریخی واقعات کے انطباق کے لحاظ سے بھی پچھلا ہی واقعہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ کوئی بہت پرانا واقعہ نہ تھا آنحضرتؐ کے سال پیدائش کا واقعہ تھا اور سب جانتے تھے کہ ابراہا کے لشکر ابا بیل کی کنکریوں سے تباہ ہوئے یا دبائے چیچک سے برباد ہوئے۔ ترجمے میں اختلاف کا سبب یہ ہے کہ "طیر" کے اصلی معنی ہیں "پرندہ" لیکن بدشگونی اور مصیبت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور اسی طرح "ترہیم بجارۃ" کا لفظی ترجمہ ہے "پتھر کی کنکریاں پھینکیں" اور محاورہ کا ترجمہ ہے "آفت میں مبتلا کیا اور سبیل" سے مراد ہے آفت مقدر۔



## فصل نمبر ۵۲

### شیطان اور جن

بھوت پریت - چڑیل - دیو اور پری کے افسانے جس طرح ہندوستان میں سنے جاتے ہیں اسی طرح اور ملکوں میں بھی سنے جاتے ہیں۔ یہ باتیں کچھ جدید نہیں ہیں بہت پہلے سے ہیں انکی دلچسپیاں البتہ قومی ترقی کے ساتھ گھٹتی اور قومی تنزل کے ساتھ بڑھتی رہتی ہیں قومی ترقی کے وقت یہ خیالات خاص خاص جہلا میں محدود رہ جاتے ہیں اور قومی تنزل کے وقت تمام قوم کی قوم انھیں باتوں میں مبتلا پائی جاتی ہے۔

یونان میں بھی ایک وقت ایسا تھا کہ تمام قوم کی قوم انھیں لغویات میں پھنسی ہوئی تھی اور جب قومی ترقی شروع ہوئی تو ان لغویات اور توہمات سے بھی آزادی نصیب ہوئی اسی زمانے میں ایک حکیم نے ارواح کے وجود سے انکار کیا اور بہت سختی سے لوگوں کو اپنے انکار کے وجہ بتائے ایک برابر کے علم والے نے اس پر اعتراض کیا تو اس نے کہا کہ "ارواح کے وجود سے مجھ کو انکار نہیں ہے لیکن اس بارے میں لوگوں کے خیالات ایسے برے ہو رہے ہیں کہ کچھ دنوں تک ارواح کے وجود ہی سے انکار کرنا قرین مصلحت ہے۔ عوام سے یہ کہنا کہ تمہارے خیال کے مطابق ارواح کا وجود نہیں ہے بلکہ میرے خیال کے مطابق اس کا وجود ہے قوم کی دودنی کا سبب ہو گا اور قومی اصلاح کا باعث نہ ہو گا۔ اب بھی مہذب سے مہذب ممالک میں یہ بلا پائی جاتی ہے لیکن ادنیٰ طبقہ کے لوگوں میں جو جتنا ہی ذلیل حالت میں ہے اتنا ہی اس کا زائد مقر ہے۔

عرب میں بھی مشرکان عرب بھوت پریت کے خیالات رکھتے تھے اور عرب کی لغت میں انکو



جن کہتے تھے۔ جن کے معنی ہیں پوشیدہ۔ خیال یہ تھا کہ رو میں چھپی پھرتی ہیں۔ مخلوقات عالم میں سے جو صورتیں چاہتی ہیں اختیار کر لیتی ہیں۔ بجنسہ یہ وہی خیال تھا جو ہندوستان میں بھی ہے۔ صرف لفظوں کا فرق ہے۔ ہندوستان میں بھوت نام ہے اور عرب میں جن۔ شیطان کو بھی اسی قبیل سے سمجھتے تھے۔ فرق اتنا ہے کہ جنات تعلیم پذیر سمجھے جاتے تھے ان میں اچھے بھی ہوتے تھے اور برے بھی ہوتے تھے شیطان راندہ بارگاہ ایزدی خیال کیا جاتا تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ تعلیم قبول کرنے کی قابلیت اس میں نہیں ہوتی۔

جہاں کہیں انسان نے ترقی کی ان خیالات باطل کی پیروی بھی چھوڑ دی۔ کیا اسلام نے اپنے زمانہ ترقی میں اس قسم کے خیالات کی تقلید قائم رکھی تھی؟ ہمارے نزدیک جس طرح دوا اور دوا چارہ ہوتے ہیں اسی طرح یہ امر بھی درجہ یقین رکھتا ہے کہ اگر اسلام نے ان باتوں کی پیروی کی ہوتی تو ہرگز اسکو ترقی نصیب نہ ہوتی۔ ہم آئندہ یہ دکھائیں گے کہ قرآن نے ان لغویات کے یقین دلانے کے بجائے ان لغویات کا ترک کرنا تلقین کیا ہے۔ اب رہا یہ امر کہ مسلمانوں نے اپنی ترقی کے زمانے میں اسکی نسبت کیا خیال کیا اسکی بابت ہمارے پاس دو قریبے ہیں جو بتاتے ہیں کہ مسلمانوں نے بھی مثل دوسری ترقی یافتہ قوموں کے ان چیزوں کی کبھی پروا نہیں کی ایک تو یہ ہے کہ انکی ملکی ترقیوں کی تاریخ میں اس قسم کے توہمات کا کہیں ذکر نہیں آیا ہے بلکہ فریق مخالف نے جہاں جہاں ان لغویات سے اثر قبول کیا ہے وہاں فریق ثانی کے قومی شعار کی تضحیک کی گئی ہے دوسرا قریبہ یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان کے تمام مسلمان چھوٹے بڑے عالم اور جاہل ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اس قوم کی جیسی حالت ہے ویسے ہی اس کے سامان بھی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہر مسلمان کو اس امر کا عقیدہ ہے کہ جب مسلمان پاک رہتا ہے اور کلمہ یا آیت قرآنی پڑھتا ہے تو بھوت اور چڑیل جو نجاست اور ناپاکی میں رہتے ہیں خوف سے مسلمان کے پاس نہیں آتے جنات جو خود مسلمان ہوتے ہیں کسی قدر بے خوف ہوتے ہیں لیکن وہ بھی مسلمانوں کو ایذا نہیں پہنچاتے اور ایذا پہنچاتے بھی ہیں تو آیات قرآنی سے اسکی روک تھام ہو جاتی ہے یہ خیالات ہمارے نزدیک موروثی ہیں اور اصلیت اس خیال کی وہی معلوم ہوتی ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا۔ یعنی مسلمان اپنی ترقی کے زمانے میں ان چیزوں سے ڈرتے نہ تھے اور نہ ان کے قائل تھے مسلمانوں کا نہ ڈرنا اور غیر مسلمانوں کا ڈرنا اب اس انحطاط کے زمانے میں یوں سمجھا گیا ہے کہ ارواح خبیثہ مسلمانوں کو نہیں ستاتیں اور غیر مسلمانوں کو ستاتی ہیں ایسا ہی انگریزوں



نسبت بھی کہا جاتا ہے کہ ان پر سحر یا جادو کام نہیں کرتا اور نہ بھوت پریت ان کو ستا سکتے ہیں اور نہ کبھی برہمہ بابا ان کو دق کرتے ہیں۔ ان چیزوں سے ان کا محفوظ رہنا انکی قوت کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے وہ محض اس لئے محفوظ ہیں کہ وہ اس کا اعتبار نہیں کرتے۔

اب اس وقت ہندوؤں میں عموماً اور مسلمانوں کے طبقہ جہلا میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بھوت انسان سے لڑتے ہیں اور انسان کو مار ڈالتے ہیں۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ صرف حیران کرتے ہیں جان سے نہیں مارتے بیمار ڈالتے ہیں اور بیماری سے انسان مرتا ہے۔ بلا واسطہ نہیں مرتا ہے۔ یہ سبھی مشہور ہے کہ انسان پر جن یا چرطیل سوار ہو جاتی ہیں اور اس وقت اس سے عجائبات کا ظہور ہوتا ہے۔

غرض کہ جتنی باتیں ظہور میں آتی ہیں۔ وہ یا تو خود اپنی قوت نفس کا اپنے اور پراثر ہوتا ہے یا ایک کی قوت نفس کا دوسرے پر ہوتا ہے اور کبھی کبھی نظر کے دھوکے کھانے سے بھی یہ باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ مضمون 'جادو (سحر)' فصل ۱۵ کے عنوان میں بخوبی واضح کیا گیا ہے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے لیکن اتنا کہنا اور بھی ضروری ہے کہ اس طرح کے عجائبات اور کیفیات سے زیادہ تر انھیں کا مقابلہ ہوتا ہے جو دل کے کمزور ہوتے ہیں۔ منکرین کو اس قسم کے عجائبات نظر نہیں آتے یا بعض منکرین کو نظر بھی آتے ہیں تو صرف اسی حالت میں کہ انکا انکار کاذب ہوتا ہے اور ساتھیوں کی گفتگو سے ان کے دل پورے طور سے متاثر ہوتے ہیں۔

سروں پر جنات اور چڑیلوں کا آنا زیادہ تر مصنوعی ہوتا ہے اور جہاں کہیں اصلی ہوتا ہے وہاں بھی اس سے زیادہ نہیں ہوتا جتنا کہ مسمریزم کے معمول عموماً دکھایا کرتے ہیں۔ حالانکہ کسی ارواح کا مسلط ہونا کسی صورت سے نہیں ہوتا۔ اس حکایت سے اسکی حقیقت بخوبی سمجھ میں آجائے گی۔

ایک شاہ صاحب کسی مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے وہاں سے ذرا فاصلہ پر ان کا معتقد رہتا تھا اور روز رات کو شاہ صاحب کا کھانا پہنچاتا تھا ایک رات وہ کھانا لے چلا تو لوگوں نے اس کو ڈرایا کہ راستہ میں فلاں درخت پر ایک بڑا بھوت رہتا ہے بیسیوں آدمی وہ مار چکا ہے تعجب ہے کہ اس سے تم سے ڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ اس تقریر سے اس پر کچھ ایسا خوف غالب ہوا کہ وہ اس شب کو کھانا نہ لے گیا اور دوسرے دن کچھ دن رہے کھانا لے کر پہنچا اور جلد واپسی کی اجازت چاہی شاہ صاحب نے اسکو باتوں میں لگایا۔ جب آدھی رات گزری تو اسے جلنے کی اجازت دی اس معتقد نے جانے میں تامل کیا تو شاہ صاحب نے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ اس درخت پر بہت بڑا شیطان رہتا ہے اور لوگوں سے چمٹ بھی جاتا ہے لیکن جب تم میرے پاس آئے ہو تو



تو اسکی مجال نہیں ہے کہ تم سے مقابلہ کرے لیکن اگر اسکی موت ہی آگئی ہوگی اور تم سے مقابلہ کرے گا تو پھر فنا بھی ہو جائے گا۔ ایک پڑیا میں میری دھوئی کی راکھ لیتے جاؤ۔ وہ تم سے چٹے تو اس کی پیشانی پر لگا دینا فوراً وہ جل کر خاک ہو جائے گا اور جب گھر پہنچنا تو اپنا منہ آئینے میں ضرور دیکھ لینا۔ اس مرید کو شاہ صاحب کے کہنے سے جہاں شیطان سے ڈبھیڑ ہو جانے کا خیال قوی ہوا وہاں اس بات کا بھی یقین ہوا کہ شیطان چمٹا اور خاک ہوا۔ اور جب وہ درخت کے نیچے پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ ایک دیو درخت سے اتر اور اسے چمٹ گیا۔ اس کا چمٹنا تھا کہ اس نے راکھ فوراً اسکی پیشانی پر مل دی اور وہ فوراً فنا ہو گیا۔ خوشی خوشی وہ گھر آیا اور آتے ہی شیشہ میں منہ دیکھا تو راکھ کا ٹیکا پیشانی پر تھا دوسرے دن شاہ صاحب کے پاس پہنچا تو بہت خوش تھا لیکن اپنے ماتھے پر راکھ لگنے سے حیران بھی تھا۔ شاہ صاحب نے اسکو بتایا کہ یہ سب تماشا تیرے واہمہ نے پیدا کیا تو نے خود اپنے سر پر ٹیکا لگایا اور سمجھا کہ شیطان ٹیکا لگاتا ہے۔ شاہ صاحب بھلے مانس تھے کہ صاف صاف کہہ دیا ورنہ کوئی دوسرا ہوتا تو بیسیوں ابلہ فریب باتیں بناتا۔ تمام گرد و نواح کے باشندوں کا دین اور ایمان خراب کرتا اور اپنا گھر دولت سے بھر لیتا۔

ہم جنات، شیطان اور بھوت کے منکر نہیں ہیں۔ ہم صرف نام جانتے ہیں۔ انکی حقیقت نہیں جانتے۔ ہم کو اس سے بھی بحث نہیں ہے کہ اس کا وجود ذہن میں ہے یا خارج میں ہے یہ محض لفظی بحث ہے اور ایک حد تک بے معنی ہے۔ اتنا ہم جانتے ہیں کہ وہ مادی نہیں ہے اور اتنا ہی جاننا کافی ہے۔ غیر مادی ہونے کی حالت میں اس کا وجود فی الذہن ہو یا فی الخارج دونوں یکساں ہیں۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جنات اور شیاطین کبھی سانپ بن گئے اور کبھی بلی بن گئے۔ گھوڑے کی صورت میں نمودار ہوئے اور جب کوئی تھوڑی دیر تک سوار ہو کر ان پر گیا تو وہ غائب ہو گئے۔ جب کسی کمزور سے سابقہ پڑا تو اسکو ستانا شروع کیا اور جب کسی زبردست عامل سے ڈبھیڑ ہوئی تو بوتل کے اندر جا کے چپ چاپ بیٹھے اور عامل نے بوتل میں کارگ لگا کر ہمیشہ کے لئے انکو زندہ درگور کر دیا۔ یہ سب خیالات نہ مسلمانوں کے تھے اور نہ کسی طرح قرآن شریف سے ان کا وجود ثابت ہو سکتا ہے۔ جن کا یہ خیال ہے کہ ایسے جنات اور شیطان کا وجود قرآن سے ثابت ہے وہ قرآن شریف پر بہتان کرتے ہیں۔ شیطان کے غیر مادی ہونے کی حالت میں کسی قسم کا اعتراض قرآن شریف پر کوئی ذی علم نہیں کر سکتا خدا نے نہ معلوم کیا کیا چیزیں پیدا کیں جن کے جاننے سے ہمارے حواس قاصر ہیں۔



ہمارے لئے اتنا ہی جاننا کافی ہے کہ شیطان میں یہ قوت نہیں ہے کہ گدھا بن جائے اور جب اس پر لڑکے سوار ہو جائیں تو وہ ہوا ہو جائے اس کے بعد اس کا غیر مادی ہو کر موجود فی الخارج ہونا یا موجود فی الذہن ہونا دونوں برابر ہے اندھے کے لئے جیسا سیاہ رنگ ویسا ہی اجلا رنگ نہ یہی نظر آتا اور نہ وہی نظر آتا۔ لیکن جو لوگ اس غیر ضروری مسئلہ میں خواہ مخواہ حجت کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ شیطان کا وجود خارجی نہیں ہے محض ذہنی ہے ان سے ہم اتنا ہی کہیں گے کہ یہ قرآن شریف کے منافی نہیں ہے۔ خدا نے جس چیز کی حقیقت نہیں بتائی اس کو جس طرح چاہو سمجھ لو۔ شیطان کا وجود اگر ذہنی ہونا مانا جائے گا تو وہ نفس انسانی کی ایک قوت ٹھہرے گی اور پھر اسکی ہیبت وہ ہوگی جو ایسے خیال والوں کی تسکین خاطر کے لئے قصص قرآنی فصل ۵۳ میں ابوالبشر آدم کے ذیل میں بیان کی گئی ہیں۔ اسی طرح جو لوگ جنات کے خیر مادی ہونے پر اکتفا نہیں کرتے اس کے وجود خارجی سے بھی انکار کرتے ہیں تو ان کے لئے قرآن کی سورہ جن کے معنی وہ کہے جائیں گے جو ہم آگے بیان کرتے ہیں کوئی یہ نہ سمجھے کہ قرآن میں جو معنی چاہے نکلے تو یہ قرآن کا ہے کوہو ادل لگی ہوئی۔ اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ قرآن میں جہاں تک اوامر و نواہی ہیں وہاں ذرا بھی رد و بدل کی گنجائش نہیں ہے جاہل سے جاہل اور عالم سے عالم ایک ہی معنی سمجھے گا اور جہاں اخلاق حسنہ کی تعلیم مقصود ہے گذشتہ زمانے کے حالات یاد دلانا اور موجودہ زمانے کی برائیوں سے نفرت دلانا مقصود ہے اور اسی ضمن میں رجا و بیم کا بھی ذکر ہے۔ قومی خیالات کی طرف بھی اشارہ ہے علمی باتیں بھی بقدر ضرورت بیان کی گئی ہیں وہاں چیزوں کا نام بیان کرنا ناگزیر ہوا ہے لیکن انکی حقیقت بیان کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔ کچھ تو اس لئے کہ ایسا بیان معرض بحث سے الگ ہو جاتا تھا اور کچھ اس لئے کہ ہر طبقہ اور ہر قرن کے مناسب حال ہوتا۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنے پندار کے مطابق جس طرح چاہے سمجھے۔ لیکن عربی زبان میں سمجھے۔ ایسا نہ سمجھے جیسا کہ ایک نے "خبر موسیٰ" میں موسیٰ کاٹ کر عیسیٰ بنا دیا کہ عیسیٰ کے پاس فر تھا موسیٰ کے پاس نہ تھا اور "عسیٰ آدم" کو "عسیٰ موسیٰ" بنا دیا کہ انھیں کا عضا مشہور ہے۔ آدم کے پاس عصا کہاں تھا۔

اب ہم سورہ جن کی آیات کے معنی لکھتے ہیں اور دکھاتے ہیں کہ اس میں جنات کے وجود سے بحث نہیں کی گئی ہے بلکہ جو لوگ جنات کے وسعت اختیارات کے قائل ہو کر اوہام باطلہ میں مبتلا تھے (یعنی مشرکین عرب) انکی توہین کی گئی۔ قبل اس کے کہ ہم آیات کا ترجمہ لکھیں،



شان نزول اور مفہوم بتا دیتے ہیں اس کے بعد آیات کا ترجمہ لکھیں گے کہ پڑھنے والے خود بخود سمجھتے چلے جائیں۔ سمجھانے کی ضرورت نہ ہو۔

عرب میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو مسلمانوں کی نصیحتوں کا سننا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے اور اس لئے وہ چھپ کر قرآن سنا کرتے تھے ان میں عیسائی بھی تھے کفار بھی تھے یہود بھی تھے مجوسی بھی تھے یہ لوگ چھپ کر قرآن سنتے تھے۔ جب بھی مسلمان ہو جاتے تھے اپنے عقاید سے پھر جاتے تھے اور علانیہ اپنے عقاید کی تکذیب کرتے تھے۔ قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ چھپ کر سننے والے جب قرآن سنتے تھے تو وہ عیسائی ہونے کی حالت میں یہ کہتے ہیں کہ خدا بڑا ہے اس کی شان سے بعید ہے کہ اس کے کوئی جو رد ہو یا لڑ کا ہو اور ہم میں جو احمق ایسا کہتے تھے وہ خدا پر اتہام کرتے تھے ورنہ انسان یا جنات کوئی بھی جب عقل رکھے گا تو خدا پر جھوٹ نہ بولے گا۔ یہ عیسائی بیشک جنات کے قائل تھے اور انہیں کا یہ قول تھا کہ انس و جن یعنی آدمی یا اور کوئی ارواحِ مخفیہ اب خدا پر جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کریں گی۔ کفار عرب جب قرآن چھپ کر سنتے تھے تو وہ اپنے عقاید سے پھر جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم میں جو لوگ جناتوں سے پناہ مانگتے تھے اور اس طرح وقار بڑھاتے تھے وہ جھوٹے تھے۔ فی الواقع ان کا کوئی وقار نہ تھا۔ اصلی وقار محمد رسول اللہ صلعم کا ہے۔ جناتوں کے وقار بڑھانے والے بعض مشرکین عرب ویسے ہی تھے جیسے کہ اس زمانے کے عامل خود کو جناتوں پر قابو پانے والا سمجھتے ہیں اور جناتوں کی بڑی بڑی داستانیں سناتے ہیں۔ اور یہودی کہتے تھے کہ بیشک لوگ سمجھتے تھے کہ اب خدا کسی کو اپنا پیغمبر نہیں کرے گا۔ لیکن یہ بات آنحضرت محمد کی رسالت سے صریح غلط ثابت ہوئی۔ مجوسیوں میں وہ باوقار نجومی تھے جو ستاروں کی گردش سے سجاد اور نجومست کا اندازہ کرتے تھے اور غیب کی باتیں بتاتے تھے۔ مجوسی دین اسلام قبول کرنے کے بعد کہنے لگے کہ جتنے ڈھکوسلے ہمارے پیشواؤں کے تھے۔ وہ سب اس دین برحق کے سامنے غلط ہو گئے۔ وہ دن گئے کہ نجومی آسمان کی باتیں بیان کرتے تھے اب وہ آسمان کی باتیں نہیں لاتے اور اپنے سابق پیشواؤں کے لئے بطور طنز کہتے تھے کہ اب گویا نجومیوں کے لئے آسمان پر چوکیدار بیٹھے ہوئے ہیں اور آگ کے شعلے سے آسمان بھرا ہوا ہے کہ انکے پردہاں پر جاتے ہوئے جلتے ہیں۔ پہلے ہم میں ایسے بھی تھے جو لمبی چوڑی باتیں بناتے تھے گویا آسمان میں بیٹھ کر خدا کی باتیں سنتے تھے اب وہی لوگ ہیں کہ انکے لبوں پر مہر سکوت لگ گئی ہے اور گویا وہ آسمان پر جانے نہیں پاتے۔ وہ جائیں تو آگ کے شعلے انہیں جھلسا دیں۔



مفصلہ بالابیان سے مرتکب ظاہر ہے کہ آسمان پر چوکیداروں کا بیٹھنا اور شہاب ثاقب کا (فرشتوں کا آگن بان - شعلہ آتشیں) ہونا اسلام کا عقیدہ نہیں ہے بلکہ یہ عقیدہ اسلام سے قبل تھا اور نو مسلموں کا یہ بیان تھا کہ یہ سب خیالات ہم لوگوں کے اسلام نے غلط کر دیئے لیکن ایک امر پھر بھی بحث طلب رہ جاتا ہے وہ لفظ "جن" ہے جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے چھپے ہوئے آدمی - یہ لغوی معنی صحیح ہیں لیکن مجازاً چھپی ہوئی ارواح پر بھی اسکو عرب بولتے تھے اب گفتگو یہ ہے کہ جن لوگوں کا شروع آیت میں چھپ کر سنا بیان کیا گیا ہے وہ انسان تھے یا از قسم ارواح تھے اگر وہ انسان سمجھے جائیں تو معنی بہت ہی قرین فہم ہوتے ہیں - جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اور اگر وہ از قسم ارواح سمجھے جائیں تو ذرا بعید از فہم ہوتا ہے لیکن محال نہیں ہوتا۔ ان ارواح میں بھی عیسائی - کفار، یہود اور مجوسی کا ہونا ممکن ہے اور پھر مفہوم صاف ہو جاتا ہے - واضح رہے کہ اگر جن کو اس پچھلے معنی میں لیں جب بھی صرف ارواح مخفیہ کا وجود قرآن سے ثابت ہوتا ہے - جنکو تمام عقلائے زمانہ مختلف حالتوں سے صحیح مانتے چلے آتے ہیں لیکن ان سے ان ارواح یا جنوں کا وجود ثابت نہیں ہوتا جن کو جہلا مانتے ہیں - قرآن میں صرف لفظ جن آیا ہے اسکی ماہیت نہیں بتائی گئی ہے اور اس لئے وہ خیالات مسلمانوں کی طرف کسی طرح منسوب نہیں ہو سکتے جنکو ہم نے شروع میں تمام جہلائے عالم کی طرف منسوب کیا ہے - اب ہم قرآن کی آیتوں کا ترجمہ لکھتے ہیں -

"پیغمبر کہو مجھ کو وہ جس سے معلوم ہوا ہے کہ چند چھپے ہوئے شخصوں (جنوں) نے قرآن سنا تو کہا کہ میں نے عجیب طرح کا قرآن سنا جو راہ نیک دکھاتا ہے ہم تو اس پر ایمان لائے اور آئندہ ہم کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ ٹھہرائیں گے اسکی بڑی اونچی شان ہے نہ کوئی اسکی جوڑ ہے اور نہ اس کا کوئی بیٹا ہے - ہم میں جو احمق تھے وہ خدا کی نسبت بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے تھے - ہم تو ایسا سمجھتے تھے کہ آدمی اور جن کوئی بھی خدا پر جھوٹ بول سکتا ہے - اور بے شک ایسے لوگ بھی تھے جو جناتوں سے پناہ مانگتے تھے اور اس طرح ان کا تکبر زیادہ بڑھ گیا تھا اور بے شک لوگ سمجھتے تھے جیسا تم سمجھتے ہو کہ خدا کوئی پیغمبر نہیں بھیجے گا اور بلاشبہ ہم نے دعوہ نڈ ڈالا آسمانوں کو تو اس کو بڑی مضبوط چوکیوں اور شہابوں (آگ کے پھڑکتے ہوئے شعلوں) سے بھرا ہوا پایا - پہلے تو آسمان میں بہت سے ٹھکانے تھے جہاں ہم سننے کے لئے بیٹھا کرتے تھے - لیکن اب کوئی سننے کا قصد کرے تو ایک شہاب اپنے لئے تیار پائے - ہم نہیں جانتے کہ اس سے زمین کے رہنے والوں کو کچھ نقصان پہنچانا مقصود ہے یا ان کے پروردگار کا ارادہ ان کے حق



میں بہتری کرنے کا ہے۔ ہم میں سے کچھ نیک ہیں اور کچھ برے ہیں۔ ہمارے فرقے مختلف ہیں۔ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم نہ تو زمین میں رہ کر خدا کو ہرا سکتے ہیں اور نہ کسی طرح بھاگ کر اس کو ہرا سکتے ہیں۔ ہم نے جب راہ کی بات سنی تو ہم اس کو مان گئے۔ اب جو محض اپنے پروردگار پر ایمان لائے گا اسے کسی نقصان یا ظلم کا ڈر نہ ہوگا۔ ہم میں فرماں بردار بھی ہیں اور نافرمان بھی ہیں جنہوں نے فرماں برداری کی انہوں نے سیدھا راستہ پایا اور جنہوں نے سرتابی کی وہ دوزخ کے کندھے ہوئے۔

اور دوسرے مقام پر سورہ ناس میں ہے۔

”تو کہہ میں آدمیوں کے رب۔ آدمیوں کے بادشاہ اور آدمیوں کے معبود کی پناہ میں آیا۔  
 وسوسہ ڈالنے والے جناس کی پرانی سے جن ہو یا آدمی“

اس سورہ میں بھی جن کی ماہیت بیان نہیں کی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی روح ہو اور یہ بھی ممکن ہے عرب میں جس طرح جنات کو با اختیار سمجھ کر خیر و شر پر قادر جانتے تھے انہیں کے خیال کے مطابق ارشاد ہوا ہے کہ شیطان جو دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے اسے جنات سمجھو یا انسان ان میں سے کوئی بھی پیغمبر کو نقصان نہیں پہنچا سکتا جب وہ اللہ کی امان میں ہے اور اس کا یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ جو انسان خدا سے امان طلب کرے گا پھر اسے کسی سے گزند نہ پہنچے گا۔ اس سورہ میں جن کے اختیارات کی صریح نفی ہوتی ہے اور اسی سے اسلام کو بحث ہے انکی نوعیت

لہ قل ادھی الی انہ استمع نھر من الجن فقالوا انا سمعنا قراناً عجیباً یہدی الی الرشداً منا بہ ولن نشکرک بر بنا  
 احداً وانہ تعلی جدر بنا ما اتخذ صاحبہ ولا ولداً وانہ کان یقول سفینا علی اللہ شیطاً وانا ظننا ان لن نقول  
 الالسن والجن علی اللہ کذباً وانہ کان رجال من الالسن یعوزون برجال من الجن فزادوہم رہقا و انہم  
 ظنوا کما ظنتم ان لن یبعث اللہ احداً وانا لمننا السمار فوجدنا ملت حرمات شریداً و شہباً وانا کنا نقعد  
 منہا مقاعد للسمع فمن لستمح الان یجد لہ شہاباً رصداً وانا لاندری اشرار یدبمن فی الارض ام ارادہم رہم  
 رشداً وانا منا الضالمون و منادون ذلک کنا طریق قد وانا ظننا ان لن نعجز اللہ فی الارض ولن نعجزہ  
 ہر باوانا لما سمعنا الہدی انا بہ فمن یومن بر بہ فلا یخاف نجساً ولا رہقا وانا منا المسلمون و منا القاسطون فمن اسلم  
 فادلک تحر وارشداً وانا القاسطون فکانوا الجہنم حطباً۔

”تو قل اعدو برب الناس۔ ملک الناس الہ الناس من شر الوساوس الجناس الذی یوسوس فی صدور الناس  
 من الجنۃ والناس۔“



یاد رہی کہ ایمان نہیں کیا گیا تو ان کا وجود اور عدم وجود دونوں برابر ہے۔ اور اگر یہ مان لیں کہ جن کو عرب جن معنوں میں سمجھتے تھے انہیں معنوں میں قرآن میں بھی استعمال کیا گیا جب بھی کوئی حرج نہیں مخاطب کے خیال کے مطابق یہ کہنا کہ جس کو تم اس قدر با اختیار سمجھتے ہو وہ خدا کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ان کے وجود اور اختیارات کا ایک حد تک قرآن میں اقرار کیا گیا ہے۔ بہر حال ہم کو صرف یہ دکھانا ہے کہ جن اور شیطان وغیرہ کتے جو اختیارات جہلا میں مانے جاتے ہیں قرآن سے (لعوذ باللہ من ذالک) اسکی تائید نہیں ہوتی۔



## فصل نمبر ۵۵

### قومی ترقی

شخصی ترقی کے وسائل کوئی ہم سے پوچھے تو ہم سیکڑوں ہی گنا چلیں لیکن قومی ترقی یا تنزل کے اسباب کا بتانا کیا سمجھنا بھی مشکل ہے۔ یہ سوچنا تو آسان ہے کہ قوم ترقی پر ہے اس کے ساتھ چلنے کی کوشش کس طرح کی جائے۔ اس سے کس طرح خود کو محفوظ رکھا جائے اپنی کمی کیونکر پوری کی جائے لیکن دوسری ترقی یافتہ قوم کے ہم پلہ یا اس سے بڑھ کر اپنی حالت کیونکر بنائی جائے یہی معنی ہیں ترقی کے، یہ نہایت مشکل اور انسان کے اختیار کے بالکل باہر ہے۔

دیوار چین کے عرض و طول اور استحکام سے چینیوں کی پچھلی ترقی کا جو اندازہ کیا جاتا ہے۔ وہ بہت ہی حیرت افزا ہے کسی طرح اس زمانے میں اس کے سمجھنے کا پورا مقياس سمجھ میں نہیں آسکتا قرآن میں جو لفظ ذوالقرنین کا آیا ہے بعض مسلمان مورخوں نے اسے خاقان چین سمجھا ہے۔ اور ہمارے نزدیک بجا سمجھا ہے چینیوں کے پچھلے کارنامے بالکل ناپید ہو گئے۔ چینیوں کا جو زمانہ پلٹا تو ایسا کہ گویا کچھ تھا ہی نہیں۔ دور نہ جانیے اس کے قریب ہی جاپان ہے۔ پچھلے زمانے میں جاپانیوں کو چینیوں کی غلامی کی قابلیت بھی نہ تھی۔ لیکن اب جو حالت جاپانیوں کی ہے اس کے اندازہ کرنے کی بھی قابلیت چینیوں کے پاس نہیں ہے۔

بہیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

بیشک چینیوں کو دوسری قوموں کے غلام ہو کر زندگی بسر کرنے کی نوبت کبھی نہیں پہنچی۔ لیکن اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ترقی یافتہ قوموں سے بعد رہا۔ اگر کوئی قوم بڑھی بھی تو مصافات چین تک پہنچنے پہنچنے اس کا زور گھٹ گیا۔ چین کسی طرح اپنا گزران کئے جاتا ہے۔ لیکن پوری آزادی سے وہ مدت ہوئی بے نصیب ہے۔ پہلے آتش پرستوں تاتاروں اور مسلمانوں سے وہ تنگ تھا اور



اب یورپین سلطنتوں کی شعاعیں بالکل اسکی آنکھیں خیرہ کر رہی ہیں۔

مصر کا وہ عروج جب اس کے سلاطین فرعون کہلاتے تھے کیسا کچھ تھا۔ تاریخوں کے صفحے لٹے تو معلوم ہو کہ کیسے کیسے کارہائے نمایاں اس قوم سے ہوئے ہیں۔ مصر کی گزری ہوئی حالت کی ایک یادگار یہ ہے کہ یونان کو اس نے اس قابل بنا دیا کہ آج اس کو دنیا کی تمام مہذب قوموں کے استاد ہونے کا دعویٰ ہے۔ اور پھر مصر کو زوال آیا تو یوں آیا کہ میناروں اور چند زراعتی چیزوں کے سوا اور کوئی شے اس امر کے بتانے والی نہ رہی کہ اس ملک کو کسی زمانے میں تمام روئے زمین سے وہ نسبت تھی جو انسان کو دوسرے حیوان سے ہے یا انسان کے دماغ کو دوسرے اعضا سے ہے۔

ایک زمانہ بنی اسرائیل کا وہ تھا کہ مصر کے قبطنی ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے تھے جیسا ہندوستان کے برہمن چاروں کے ساتھ کرتے ہیں اور اگر پچھلے زمانے کے طرز و تمدن پر لحاظ کیجئے تو اس سے بھی بدتر اور پھر حضرت موسیٰ کے زمانے میں بنی اسرائیل کی ترقی کی جو بنیاد قائم ہوئی تو ایسی کہ دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتی اور اس کے ساتھ ہی یہ قوم گرمی تو ایسا گرمی کہ خود اس قوم کے اسلاف اپنے بزرگوں کی ترقی کا اندازہ نہ کر سکے اور جن باتوں کو ان کے بزرگوں نے دنیا کی ترقی کے انتہائی زور میں کر ڈالا تھا اسکو اروج کی تاثیر پر لوگ محول کرنے لگے حضرت سلیمان دجنگواہل کتاب مسلمان پیغمبر کہتے ہیں) جو بنی اسرائیل کے ایک بڑے بادشاہ گزرے ہیں انکی نسبت لوگ کہنے لگے کہ دیوانے زیر فرمان تھے اور پر یاں ان کا خانہ باغ اور عیش محل آراستہ کرتی تھیں یہی ایک مثال انتہائی ترقی اور انتہائی زوال کے سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اس وقت ریل تار برقی۔ برقی روشنی، دخانی جہاز، مختلف کلیں جو یورپ اور یورپ کی بدولت افریقہ اور ایسا میں دیکھی جاتی ہیں قومی ادبار کی وجہ سے مٹ جائیں۔ قومی زور گھٹ جائے یورپ کے کارخانے بند ہو جائیں۔ کاریگری اٹھ جائے۔ جاہلیت کا زمانہ آجائے تو چند صدیوں کے بعد ان چیزوں کی نسبت لوگ ویسی ہی رائے قائم کرنے لگیں گے جیسی حضرت سلیمان کے کارناموں کے سمجھنے کے لئے دیو اور پریمی کے وجود کو ماننے کی ضرورت پڑی تھی کہ مسلمانوں کے بعض فرقوں کے عقیدے کے مطابق خدا کو بھی قرآن میں عوام کے سمجھانے کے لئے انھیں الفاظ کے استعمال کی ضرورت پڑی جس طرح ہندوستان کے بڑے بڑے بیرو کی نسبت خارج از عقل باتوں کے سمجھنے کے لئے منتر جادو، معلوم نہیں کیا کیا باتیں فرض کرنا پڑیں کیونکہ انسان کو جہالت کی تاریکی



میں عجائبات دنیاوی کے ساتھ تائید غیبی یا امدادِ ارحام کے مان لینے میں اور اس طرح تمام کاوشوں سے چھٹکارا پانے میں جو آسانی ہے کسی میں نہیں۔ ہندوستان کے متعدد شہروں کی نسبت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بارہا لیسے اور اجڑے۔ عام لوگوں میں ایک نقل مشہور ہے کہ حضرت خواجہ خضر نے کسی بزرگ سے ملاقات کی اور عند الاستفسار خواجہ صاحب نے بیان کیا کہ دہلی سات مرتبہ اجڑی اور بسی اور کو تو الی کو بتایا کہ یہ مقام ہمیشہ خطرناک رہا۔ آبادی کی صورت میں سیاست گاہ رہا۔ شہر دریا بردہ ہوا تو یہاں بھنور میں لوگ ڈوبتے تھے اور جنگل کی حالت میں درندہ جانور رہتے تھے۔ اس نقل سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم اس کو باور کرتے ہیں کہنے کا منشا یہ ہے کہ دنیا جب نئے قائم ہے تب سے معلوم نہیں کیسی کیسی ایجاد کیسی قومی ترقی ہوئی اور پھر اس طرح مٹی کہ قیاس کو بھی دخل نہ رہا کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ کیا کیا عمارتیں بنیں اور بن کر اس طرح منہدم ہوئیں کہ نشان تک باقی نہ رہا۔ ایک ویران جگہ کو دیکھ کر کبھی قیاس نہیں ہو سکتا کہ یہاں کسی زمانے میں موتی محل تھا اس کے ساتھ ایک پائیں باغ بھی تھا۔ دنیا کے مشہور کاریگروں نے آکر بنایا تھا شام کو شہنشاہ وقت اپنی بیگم کے ساتھ یہاں سیر کرتا تھا۔ فوارے چھوٹتے تھے۔ جابجا حوضوں میں مچھلیاں تیرتی تھیں۔ رنگ برنگ کے پھول تھے اور طرح طرح کے سبزہ زار کی کیا ریاں تھیں۔ اب کیا ہے کہ سر شام سے گیدڑ بولتے ہیں۔ عوام میں سمجوت کے بہنے کی جگہ سمجھی جاتی ہے دن دوپہر یہاں کوئی آئے تو ڈر جائے بس یہی حالت قوم کی ہے ایسی ایسی قومیں مٹ گئیں کہ ان کا کچھ اثر تک باقی نہیں رہا۔ ہمارے نزدیک تو عمدہ قیاس یہ ہے کہ جس قوم کو جتنا ہی ذلیل حالت میں دیکھو تو سمجھو کہ کسی زمانے میں وہ اتنی ہی با وقعت تھی اگر قوم کے مرنے جینے کا نام تناسخ ہوتا تو بہت ٹھیک تھا اور کیا عجب کہ اسی معنی میں تناسخ کا خیال ابتدا ظاہر کیا گیا ہو ہندوستان کی پچھلی ترقیوں کا تذکرہ کرنا عجب ہے۔ تمام اسکولوں کے بچے اسے جانتے ہیں اور انگلستان کی پچھلی حالت کا بیان کرنا بھی غیر ضروری ہے۔ کوئی تعلیم یافتہ اس سے لاعلم نہیں ہے بھلا اپنی پچھلی ترقی میں تو ہندوستان کوئی ملک اپنا ہمسر نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اس گئی گزری حالت پر یعنی مسلمانوں کی فتح کے بعد بھی وہ ایسا تھا کہ دو تین سو برس پہلے انگلستان کو اس سے کوئی نسبت کسی قسم کی نہ تھی۔ اللہ نے یورپ کو ترقی دی تو اس کے ساتھ انگلستان کو بھی بڑھایا اور ایسا بڑھایا کہ وہاں کے تاجروں کے گروہ اگر ہندوستان کی بگڑی ہوئی حالت سنبھالنے میں مدد نہ کرتے تو معلوم نہیں اسکی حالت کہاں تک ابتر ہو جاتی۔ اس کا کوئی سبب نہیں قانون قدرت



یوں ہی ہے کہ ایک گھٹتا اور دوسرا بڑھتا رہتا ہے۔ تک الایام نزدیکیا بین الناس۔  
یونان کا جب زمانہ تھا تو علم و دولت، بہادری، صناعتی، خدائے ستی، تمام صنعتوں میں اس  
کو کمال حاصل تھا اور دنیا کی سلطنتوں میں نہیں بلکہ تمام دنیا کی سلطنتوں میں اس کا درجہ  
بڑھا ہوا تھا اور اب بھی وہی یونان ہے کہ یورپ کی تمام سلطنتوں سے براعظما میں گھٹا ہوا ہے۔ اس  
قومی ادبار کو ہندوستان کے عام باشندے یوں تعبیر کرتے ہیں کہ تختہ یونان الٹ گیا سارا ملک قعر  
بھر میں چٹا گیا اگر وہ نواح کے لوگ کسی اہم کام پر غور کرنا چاہتے ہیں تو جہاز لے جا کر وہاں ٹھہر دیتے  
ہیں۔ ہوا میں اب بھی وہی ذہانت ہے۔ وہاں ٹھہرنے سے رائے ایسی معائب قائم ہوتی ہے۔ کہ  
دوسری جگہ ممکن نہیں۔ اس عام پسند حکایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو ترقی یونان کی کسی زمانہ میں  
تھی وہ لوگوں کے نزدیک ایسی نہ تھی کہ مرد زمانے سے بالکل ناپید ہو جاتی اور اس لئے یہ کہا  
جاتا ہے کہ وہ خطہ ہی آبادی کے قابل نہ رہا جہاں ملائکہ صفت لوگ پیدا ہوتے تھے۔ یہ بالکل غلط  
ہے کہ خطہ الٹ گیا۔ ملک وہی زمین وہی۔ آب و ہوا وہی۔ نسلیں وہی، سب کچھ وہی۔ بس خدا  
کی مشیت جب کو اقبال کہتے ہیں البتہ نہیں ہے

ایران کی سلطنت بہت قدیم ہے۔ مشہور ہے کہ کھانے پینے اٹھنے بیٹھے، پہننے اور دھننے کے  
سارے سارے طریقے ایران سے نکلے۔ ایران کی ابتدائی ترقی کا زمانہ کسی طرح دریافت نہیں  
ہو سکتا۔ یہ ابتداء سے ترقی پر تھا اور ہمیشہ ترقی پر رہا۔ چینیوں سے، ترکوں سے، مصریوں سے  
اور یونانیوں سے برابر اس کا مقابلہ رہا۔ جنگ و سرداروں جیتنے ہارنے کی کوئی بات نہیں یہ تو ہوتا  
ہی رہتا ہے۔ لیکن قومی تنزل اسے اسلام سے قبل کبھی نہیں ہوا۔ ہر اعتبار سے ایران دنیا میں  
استاد سمجھا جاتا تھا اس کے برابر ہی عرب کی ایک خانہ بدوش قوم تھی دشہری تھے لیکن وہ بھی  
خانہ بدوشوں کی صفت سے متصف تھے، جو ہمیشہ ایران کی ماتحت رہی اگر یوں سمجھو کہ ایران کو  
اس کا ماتحت رکھنا ملک کے افلاس و ناداری کی وجہ سے وبال جان تھا تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک  
خود مختار آزاد قوم تھی۔ لیکن آزادی ایسی ہی جیسے کسی احمق غلام سے یہ سمجھ کر کام نہیں چلا جائے کہ وہ  
کوئی بات سمجھ نہیں سکتا کام کیا کرے گا خدا کو منظور ہوگا کہ اس نیکے ملک کو بھی عزت دی جائے۔ یہ  
ملک جیسا ہی گڑھا تھا ویسا ہی اعلیٰ درجے پر اس کا عروج پہنچا ایک بے لکھے پڑھے غیر متمول یعنی  
حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے عرب ہی کی نہیں بلکہ کل دنیا کی اصلاح خالق کو منظور ہوئی  
ایک دن وہ کہہ پڑا کہ ہم کو اللہ نے حکم دیا ہے کہ ہم لوگوں سے کہیں کہ وہ اللہ کو پہچانیں دیکھئے قوم کی



ترقی کی یہی جڑ بندھتی ہے۔ جن لوگوں نے اس پر اقتدار کیا وہ پیغمبر کے پیر و ہونے اور جو منکر ہوئے وہ کافر سمجھے گئے ان مومنوں پر ان کے کافر اعزہ کی طرف سے زیادتیاں ہونے لگیں۔ اس لئے بچاؤ کے لئے فوجی قوت کی ضرورت ہوئی۔ دوسرے ملکوں سے خط و کتابت کی ضرورت ہوئی تو لکھے پڑھے لوگوں کی بھی قدر بڑھی۔ جلاوطن نو مسلموں کے لئے روپے پیسے کی ضرورت ہوئی اور اس کے بہم پہنچانے کے لئے بیت المال جو قائم ہوا وہ آگے چل کر خزانہ شاہی بن گیا غرض کہ دس بارہ برس میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد پڑ گئی اور پھر تو تمام دنیا کے علوم اور تمام دنیا کی صنعتیں مسلمانوں نے سکھیں۔ تمام علوم و فنون کے ماہر مسلمانوں کے پاس آ کر جمع ہو گئے اور اس طرح عرب بھی یہ کہنے کے قابل ہوا کہ ہمارے کارنامے بھی تاریخی دنیا میں بے نظیر ہیں۔ جہالت۔ نا اتفاقی۔ کم ہمتی۔ بے زرمی۔ بد خلقی۔ بے ہنرمی یہ سب باتیں قوم کے ادبار کا سبب سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن غور کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ قومی ترقی اور تنزل میں ان باتوں کو کوئی دخل نہیں۔ شخصی موت کے ساتھ قومی موت کو پورے طور پر تشبیہ دے سکتے ہیں۔ مرنے کے لئے کسی بیماری کی خصوصیت نہیں ویسے ہی قوم کے تنزل کے لئے کوئی سبب معین نہیں کیا جاسکتا۔ قوم کے تنزل کے وقت ہمیشہ ایک نیا سبب پیدا ہو جاتا ہے ایران اور یونان پر مسلمانوں کے فتیاب ہونے کے حالات دیکھیے۔ قدرت خدا نظر آتی ہے۔ ہم یہاں صرف ایران کا تذکرہ کرتے ہیں ایران میں کوئی کسی قسم کے آثارِ نکبت یا قومی تنزل کے نظر نہیں آتے تھے اس کے چراغ کی روشنی بدستور قائم تھی۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ عرب کی مشعل کے سامنے خواہ مخواہ اس کی روشنی جاتی رہی اسلام کے پھیلنے کے سھوڑے ہی دنوں بعد دفعۃً عربوں نے ایران کا قصد کر دیا۔ فوج لب دریا پہنچی جسکے عبور کرنے پر ایران کی سرحد اور ایران کا پائے تخت تھا۔ عربوں کے پاس تلوار اور گھوڑوں کے سوا اور کیا سامان تھا۔ کشتیاں ایرانیوں نے اپنی طرف منگوائی تھیں یا ڈبوادی تھیں۔ عربوں نے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے۔ گھوڑے تیرنے لگے اسی اثنائے میں ایک سپاہی کی کمر میں لکڑی کا پیالہ بندھا تھا اور وہی اس کا سارا اثاثہ تھا پیالہ کسی طرح کھل کر دریا میں بہہ چلا ذرا اس کے استقلال اور قوم کے اقبال پر غور کیجئے دوسرے ملک پر چڑھائی جان جو کھم کا سودا۔ گھوڑا بھر ذخار میں تیر رہا ہے جان کے لالے پڑے ہیں ان سب باتوں کا خیال نہیں۔ میاں سپاہی کو یہ سوچ پیدا ہوا کہ ملک فتح ہونا تو اتفاقاً سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ میرا اثاثہ جو بہا جاتا ہے۔ ”نقد را بہ نسیم گزاشتن کار خرد منداں نیت“ اس کو تو کسی طرح جانے نہ دینا چاہیئے۔ اب میاں سپاہی نے اسی پیالے کے پیچھے گھوڑا ڈالا۔ اور



پیالے کے ساتھ گھوڑا بھی دھار میں چلا۔ تھوڑی دور جا کر اس نے پیالہ پایا اور پھر فوج کی طرف پھریوں تو نام سن سن کر ایرانیوں کا اقبال روگردانی کر رہا تھا۔ اس جملہ کی کیفیت دیکھ کر بھلا کسے تاب مقابلہ تھی کچھ ایسی لڑائی بھی نہ ہوئی اور عربوں کا قبضہ ایران پر ہو گیا یا یوں کہو کہ ایرانیوں کی ترقی کا زمانہ ختم ہو گیا اور عربوں کی ترقی کا وقت خود بخود آ گیا۔ اس مہم نے عربوں کی زبان۔ طرز تمدن اخلاق مذہب سب کو ایک دم سے ایران کا حکمران کر دیا۔ جس زبان سے ایرانیوں کو نفرت تھی اب اسی کی تحفیل کا نام سعادت دارین حاصل کرنا سمجھا گیا۔ فردوسی نے اسے یوں نظم کیا ہے۔

ز شیر شتر خوردن و سوس مار

عرب را بجائے ریدہ است کار

کہ ناک عجم را کنت آرزو

تغز بر تو اے چرخ گرداں تغو



## فصل نمبر ۵۶

### ضعف اسلام

ہر کمال کو زوال لازم ہے لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ زوال بلا سبب پیدا ہو جاتا ہے نہیں۔ سبب ضرور ہوتا ہے۔ اس لئے ضعف اسلام کے اسباب پر ہم غور کریں تو یہ کاربے سود نہ ہوگا۔ اسباب تو بہتیرے بیان کئے گئے اور بیان کئے جائیں گے لیکن ہمارے نزدیک سبب وہی ہے جس کی پیش گوئی روم کے پادریوں نے کی تھی۔ خلفائے عباسیہ کے عہد میں مسلمانوں نے یونان کے علوم قدیمہ کی کتابیں روم کے بادشاہ سے طلب کیں۔ یہ حکم ایسا تھا جیسے گورنمنٹ انگلشیہ کا والی کشمیر کے نام۔ عدول کیونکر ہوتا۔ لیکن ملکی دہم کے طور پر پادریوں سے کہہ ہی ارکان دولت تھے استصواب کیا گیا۔ پادریوں نے سوچ کر کہا اچھا یہ کتابیں مسلمانوں ہی کے پاس جانے دیجئے۔ کسی طرح ان کا زور تو گھٹے! ان کتابوں کا آنا تھا کہ مسلمانوں کا زور گھٹنے لگا۔

فلسفہ کی دو قسمیں سمجھئے۔ عملی اور خیالی۔ مسلمانوں کا مذہب خود ایک فلسفہ تھا لیکن فلسفہ خیالی نہیں۔ فلسفہ عملی اگر ہم شرح بیان کرنا شروع کر دیں تو ایک جدار سالہ لکھنا پڑے۔ اختصار میں گنجائش نہیں ہے۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لیجئے کہ خدا کی معرفت۔ محنت اور استقلال۔ یہ باتیں موضوع اس علم کی تھیں جو مسلمانوں کو مذہب اسلام کے ساتھ اعلیٰ درجہ پر تعلیم دیا گیا تھا۔ خیالی فلسفہ کے ترجمہ نے جو اشاعت پائی اس سے اسلام کی خوبیاں زائل ہونے لگیں۔ یقین گھٹتا گیا اور ظن بڑھتا گیا۔ طتی اور خیالی قوت کے سامنے دماغی اور جسمانی قوت کا زور کم ہو گیا۔ ہمت اور استقلال نے جواب دیا اور ان کے بدنہ میں کیا ملا؟ خیالی کمزوریاں۔ خدا کی معرفت اور مذہب ہی روشنی نے کنارہ کیا نام کے مسلمان باتوں کے شیرہ گئے جسمی اور روحی ان دونوں قوتوں کے عوض صرف خیالی اور لاحقہ حاصل مقدمات کی ترتیب دماغ میں رہ گئی۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو فلسفہ نہ پڑھایا جائے۔ اب کچھ نہیں تو یہی سہی کچھ تو جانا چاہیے لیکن جس زمانے کا ہم ذکر کرتے ہیں اس زمانہ میں جو مسلمانوں کے پیغمبر کا پڑھایا ہوا فلسفہ،



سینہ بہ سینہ چلا آتا تھا وہ یونانی فلسفہ سے کہیں اچھا تھا اور اس کی ابدولت مسلمانوں نے ابتداء میں ترقی کی تھی اب اس کو کوئی سیکھنا چاہے تو مشکل ہے۔ مسلمانان درگور و مسلمانان در کتاب! مسلمانوں کے پیغمبر کے وقت سے کئی صدی بعد تک جو سچا طریقہ زندگی بسر کرنے کا جاری تھا اس میں اس نئے فلسفہ نے خلل ڈال دیا اور خلل ڈالنے کا نتیجہ وہی ہوا جو روم کے بادریوں نے پہلے سوچا تھا۔ فلسفہ پھیلنے کے بعد عرصہ تک مسلمانوں کو عروج رہا لیکن یہ عروج ماضی کا رواداروں کا نتیجہ تھا۔ ژالی کوریل کی پٹری پر چلا کر قلی بیٹھ جاتے ہیں اور ژالی میلوں خود چلی جاتی ہے بس یہی مثال اسلام کے آخری زمانے کی سمجھیے۔ پہلے زمانے میں مسلمانوں نے جو ملک فتح کئے ان کا مقابلہ کھیلی فتوحات سے کر تو معلوم ہو گا کہ فاتحین کی کارگزاریوں میں کتنا بڑا فرق ہے ابتدائی فتوحات میں مسلمانوں کی محض صحبت سے مسلمان اور بچے مسلمان ہو جاتے تھے اور آخری زمانے کو دیکھو اکبر نے کیا کچھ دیکھا نہ کی۔ عالمگیر نے کیا کچھ سختی نہ کی مگر ایک سبھی کارگر نہ ہوئی۔ وجہ صرف یہی تھی کہ ان میں یا ان کے ہم عصر مسلمانوں میں وہ صفت نہ تھی جو اگلے مسلمانوں میں تھی۔ اندلس (اسپین) وہ مقام ہے جہاں کے علم و فضل پر آج تک مسلمان فخر کرتے ہیں لیکن ہم یہ کہیں گے کہ فخر بالکل بیوجہ۔ جب عیسائیوں نے اندلس کے مسلمانوں سے کہا کہ تم سب ایک دم سے نکل جاؤ۔ تو علم و فضل سے کچھ نہ بن پڑا اگر بجائے علم و فضل کے سچا اسلام ہوتا اور مصر اور ایران کی طرح سب مسلمان ہی مسلمان ہوتے تو یہ کون کہہ سکتا تھا کہ ملک خالی کر و سپر ملک کا مسلمانوں سے خالی کرانا ملک کے لئے ایسا ہی دشوار تھا جیسا جسم سے کھال یا ہڈیوں سے گوشت کا علیحدہ کرنا۔ علم و فضل کا حاصل کیا ہے؟ روحی اور دنیاوی ترقی۔ جب تک مسلمان اپنے مذہبی فلسفہ پر قائم تھے تو یہ دونوں باتیں ان میں اس قدر تھیں جو دوسری قوموں کو آج تک نصیب نہیں ہوئیں تاریخوں کے صفحے پر ہمارے اس دعوے کو ایسا ہی سچ ماننا پڑے گا جیسا آفتاب کو روشن اور رات کو تاریک جاننا۔



## فصل نمبر ۵

### مذہبی نفاق

ارکان مذہب کے ادا کرنے کا نام ہے مسلمان ہونا اور بعض کے نزدیک محض ارکان مذہب کا حق جانتا مسلمان ہونے کو کافی ہے یا دوسرے لفظوں میں اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لانا بس یہی "اسلام" ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ارکان مذہب یا ان کے فرائض کے متعلق مسلمانوں میں اختلاف نہیں ہے دنیا کے کل مسلمان ان کو یکساں مانتے ہیں اور بالکل اختلاف نہیں کرتے لیکن جزوی مسائل جو مستحبات کے درجہ میں ہیں ان میں روایت یا اجتہاد کے اختلاف کی وجہ سے اختلاف واقع ہوا دنیا میں جب تک اسلام قومی تھا ان اختلافات پر کچھ توجہ نہ ہوئی۔ ضعف اسلام کے ساتھ یہ اختلاف بھی ترقی پکڑتا گیا اور ان ہی اختلافات سے جدا جدا فرقے قائم ہوئے۔ قرآن کی آیت: "واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا واذکر والنعمة اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فالقہ بین قلوبکم فاصبحتم بنعمة اخواناً" بھی پڑھا کئے لیکن عمل ایک نے بھی نہ کیا۔ سنی، شیعہ، بدعتی، وہابی، خارجی، اہل حدیث، مقلدین بہیرے فرقے قائم ہوئے اور مذہبی کتابوں میں دیکھو تو ساٹھ ستر فرقے نہ معلوم کیا کیا قائم ہو گئے ان فرقوں کے قائم ہونے کو گویا اسلام کی چار کہنہ میں سوراخ ہونا یاد یوار اسلام کی اینٹیں کھسکنی سمجھیے اختلاف سے نفاق پیدا ہوا اور نفاق سے زور گھٹتا گیا۔

اس نفاق نے کعبہ کو بھی نہ چھوڑا۔ وہاں خانہ کعبہ کے گرد چار مصلے بچتے ہیں اور چار فرقوں کی جدا جدا نمازیں ہوتی ہیں۔ گوان میں باہم مخالفت نہیں۔ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کو برا نہیں سمجھتا بلکہ ایک مصلے کا مسلمان دوسرے مصلے پر بے تکلف نماز بھی پڑھ لیتا ہے۔ لیکن ہم تو سیدھے مسلمان ہیں بس اتنا جانتے ہیں کہ پیغمبرؐ یا ان کے اصحاب کے وقت یہ چار مصلے قائم نہیں ہوئے تھے۔

عرب سے جب یہ اختلاف ہندوستان میں آیا تو یہاں اس نے صورت ہی دوسرے طور پر قائم کر لی یہاں ایک فرقہ دوسرے فرقے کے پیچھے نماز کیا پڑھے گا ایک دوسرے کو دشمن اور جہنمی ٹھہرانے لگا جو ذمی علم ہیں وہ گو منہ سے کہتے ہیں کہ فرقے برے نام ہیں اور مسلمان سب ہی ہیں



لیکن دل ان کے بھی متاثر ہیں۔

ان ملاؤں کے پاس کوئی جائداد نہیں۔ جاگیر نہیں۔ اساسہ نہیں۔ سامان نہیں لڑیں تو کس برتنے پر جھگڑیں تو کس چیز کے لئے اور لڑنا ٹھہرا ضروری کہ وہ انسانیت کا مقتضایہ ہے۔ یہی مسجدیں جو اگلے زمانے کے امراء اور سلاطین بنوا گئے ہیں انکی ساری کائنات ہے اسی کے متعلق جھوٹے سچے قصے نکال نکال کر باہم لڑا کرتے ہیں اور اس طرح دل کے ابھرے نکالتے ہیں۔

مسلمانوں میں ابو حنیفہ اور انکے صحابہ بڑے ذمی علم اور ذمی عقل گزر رہے ہیں انھوں نے قرآن اور پیغمبر خدا کے مقولوں سے اخذ کر کے ایک مجموعہ قانون ترتیب دیا تاکہ لوگوں کو کاروبار میں سہولت ہو اس مجموعہ قانون کے ماننے والے مقلد کہلاتے ہیں اور جو لوگ پیغمبر خدا کے اقوال کو پڑھ کر خود اس کے معنی لگاتے ہیں وہ اہل حدیث ہیں۔ ہندوستان میں جو بہت بڑا ادیب اور ذمی علم ہو گا وہ البتہ اجتہاد کر سکے گا ورنہ عام طور پر تو تقلید ہی سے کام چلتا ہے۔ حنفیوں کی ہو یا اہل حدیث کی دونوں میں حاصل ایک ہی ہے۔ شاید کوئی جزوی باتوں میں اختلاف ہو ورنہ اہم مسئلوں میں اختلاف بہت کم ہے۔ دیکھیے بات کچھ نہ تھی لیکن دو نام قائم ہو جانے سے دو فرقے ہو گئے اور آپس میں اس طرح لڑتے ہیں جس طرح ابتدائے اسلام میں مومنین اور کفار قریش کے مقابلے ہوتے تھے۔ معاذ اللہ! بھائیوں کوئی دوسرے مشغلے نکالو۔ یہ کیا کچھ دنوں دہلی میں لڑائی ہو اکی اور اب میرٹھ میں معرکہ جنگ وجدل ہو رہا ہے۔ ہم تو ہزار میں کہیں گے کہ یہ لڑنے والے محض نفسانیت سے لڑتے ہیں لڑنے کا ان میں مادہ ہے اسلام کو ناحق بدنام کرتے پھرتے ہیں۔

بھر گر بھر نہ ہوتا تو بیا بیا ہوتا

مولوی محمد شبلی نعمانی نے ابو حنیفہ کے حالات اور اعتقادات کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے۔ جہاں سب کچھ لکھا رنج یدین کے متعلق بھی انکی رائے لکھی ایک صاحب سے نہ رہا گیا انھوں نے فوراً ہی ایک نوٹ اس کے خلاف اخبار میں بھیج دیا اور حنفیوں کی رائے سے اختلاف ظاہر کیا واہ کیا نئی بات لکھی ہے بھلا دنیا میں سوائے آپ کے اور سبھی کوئی ان باتوں کو جان سکتا ہے۔ برادر عزیز۔ ان باتوں کے متعلق کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ان باتوں پر غور کرنا مجتہدین کا کام ہے یا ان کا جنھوں نے مذہبی کاموں کے لئے اپنے کو وقف کر رکھا ہے اور وہ بھی آپس میں بحث کے لئے نہیں بلکہ علم سے ہر از جہل سے محض اس لئے کہ مذہب کے متعلق کوئی مسئلہ بے سمجھانہ رہ جائے۔ ہم کو آپ کو اس سے کیا بحث یہ مسلم ہے کہ ہاتھ جوڑ کر یا ہاتھ باندھ کر دونوں طرح نماز درست ہوتی ہے تو پھر اس مسئلہ کو زیر



بحث لانا آپ تو سمجھتے ہیں کہ اقتضائے عالمیت ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر جہالت ہو ہی نہیں سکتی کہ ناحق اپنے وقت عزیز کے ساتھ دوسرے کے وقت کا بھی خون کیا جائے اور بلا وجہ شجر فساد کی جڑ مضبوط کی جائے۔

بعض وقت ایک ہی مذہب کے دو فرقے آپس میں اس طرح لڑنے لگتے ہیں کہ گویا ان میں اخوت مذہب کی ہوا تک نہیں لگی عیسائیوں کی پھیلی تاریخیں پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اختلاف فرقہ یا مذہب کی ضمنی تقسیم کی وجہ سے جو نزاعیں ہوئیں غالباً دو مختلف مذاہب یا دو اجنبی قوموں میں بھی ایسی لڑائیاں کم ہوئی ہونگی۔ اب علمی روشنی نے ان عیسائیوں کی حالت کو اس خصوص میں ایسا درست کیا کہ کہیں سے بھی اس قسم کی تکرار کی صدا نہیں آتی۔ لیکن جہاں نئے علوم نے اپنی روشنی نہیں پھیلائی یا پھیلے علوم تقویم پارینہ کی طرح قوم کے خاص خاص پیشواؤں یا سرداروں کی الماریوں میں بند ہیں وہاں کی کیفیتیں ناگفتہ بہ ہیں۔

اب اس زمانے کے مسلمانوں میں اگر کچھ اسلام ہے تو یہ ہے کہ ایک کو سنی ہونے پر فخر ہے اور دوسرے کو شیعہ ہونے پر ناز ہے۔ مقلدین اپنے آپ کو سب سے بڑا جانتے ہیں اور اہل حدیث اپنے کو سب سے افضل۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ تمام لوگ اپنے ٹھیٹھ مذہب کے مطابق اس محصیت سے بچ نہیں سکتے کہ انہوں نے اسلام کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے ضعیف کیا اور جزوی اختلاف کو رکن دین قرار دیکر مذہب کو خراب کیا۔

بالفعل ہندوستان میں جو کبھی کبھی شرمناک لڑائیاں سنیوں اور شیعوں میں ہوتی ہیں وہ بہت زیادہ قابل افسوس اور لائق شرم ہیں ہمارے نزدیک دونوں فریق مسلمانوں کی نظروں میں اہل اسلام ہونے کی حیثیت سے بے وقعت سمجھے جانے کے لائق ہیں۔

افسوس ہے کہ اسلام جو اخوت بڑھانے کے لئے آیا وہ فساد بڑھانے کا سبب سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں سے جہاں تک ہم کو واقفیت ہے ان میں سے شیعہ ایسے لوگوں کو برا جانا اچھا سمجھتے ہیں جن کے برا کہنے سے سنیوں کے دل دکنے کا احتمال ہے۔ اور سنیوں کا یہ فعل بھی قابل اعتراض ہے کہ شیعوں کی ان حرکات پر خواہ مخواہ معترض ہونا وہ اپنے مذہب کا شعار سمجھتے ہیں۔ خدایا رسول کو کوئی برا کہے تو کچھ نہ بولیں گے لیکن مسلمانان سلف کو کوئی برا کہے تو وہ سر ہو جائیں گے۔

اگر قانون کی نظر سے دیکھیے جب بھی یہ الٹی بات ہے۔ اہل تشیعہ مرے ہوئے بزرگوں کو برا کہتے ہیں جن کا برا کہنا ہر جہ از الہ حیثیت عرفی کی بنیاد قائم نہیں کر سکتا اور اس کے جواب میں سنی جو زندوں



شیعوں کو برا کہتے ہیں اسی سے لائبل کے لئے بنا رخصت پیدا ہو سکتی ہے۔

مقلدین اور اہل حدیث کے جھگڑے جو دہلی کے گرد و نواح میں آئے دن سننے جانتے ہیں وہ اور بھی حیرت افزا ہیں شرعی طور پر ایک دوسرے کو اگر کچھ کہہ سکتا ہے تو صرف یہ کہ وہ درجہ احتیاط سے گھٹا ہو ہے لیکن عملی طور پر جو نتیجے پیدا ہوتے ہیں وہ ایسے ہوتے ہیں کہ کافروں کے مقابلے میں بھی اسلام کا قانون اس کی اجازت نہیں دیتا۔

میرٹھ کے مقلدین اور اہل حدیث کے جھگڑے سنتے سنتے ہم پریشان ہو چلے تھے کہ امر دہا، (مراد آباد) کے سنیوں شیعوں کے اختلافات کی صدا میں آنے لگیں۔ ممکن ہے کہ معاملہ خطرناک حد تک نہ پہنچا ہو لیکن اخباروں کو تو ایک مشعلہ ہاتھ آ گیا۔ کوئی اخبار اس تذکرہ سے خالی نہیں اڈیٹر سنی ہے تو رواد اس کے ہاتھ میں ہے اور شیعہ ہے تو وہ اپنی طرف کھینچتا ہے حالانکہ معاملہ کچھ نہیں ہے امر دہا کے ایک بااختیار اہل دول رئیس و آئری مجسٹریٹ نے کوئی مذہبی کتاب لکھی ہے۔ اور سنیوں اور ان کے پیشوائے مذہب کو برا کہا ہے بس بات اتنی ہی ہے لیکن ممکن ہے کہ بڑھتے بڑھتے بڑھ جائے کوئی مولف سے پوچھے کہ آپ نے کون سی ایسی باریک بات پیدا کی ہے یا اس کتاب کے بغیر قوم کا کون سا کام بند تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ہم سنی حضرات سے پوچھتے ہیں کہ اگر ایک شیعہ بھائی نے اپنے خیال کو ایک رسالے میں ظاہر کیا تو تمہارا کیا نقصان ہوا خواہ مخواہ کو تم شور و غل مچانے لگے اگر مسلمانوں کے کتب خانوں کی تلاشی لی جائے تو کوئی ہزاروں ہی کتابیں ایسی نکلیں گی اگر ایک تعداد بڑھ گئی تو کیا ہوا۔ یہ کچھ نہیں۔ نہ کتاب لکھنے کی ضرورت تھی اور نہ کتاب پر اعتراض کرنے کی حاجت تھی۔ دلوں میں لڑائی کا مواد موجود تھا مذہب کو ناحق بدنام کیا۔

شیعوں اور سنیوں کا ایک مقدمہ بڑا دلچسپ لڑا ہے۔ کسی شیعہ نے ایک مسجد بنوائی اور در مسجد پر لکھا "علی خلیفۃ بلا فصل" یعنی بعد پیغمبر خدا کے حضرت علی خلیفہ ہوئے پیغمبر خدا اور حضرت علی کے درمیان میں جو تین خلیفہ ہوئے ان کو حق خلافت حاصل نہ تھا پوچھیے اس کے لکھے بغیر اس وقت مسجد کی کیا شان گھٹی جاتی تھی۔ جب خلافت کا جھگڑا تھا اس وقت ان باتوں کا لکھنا کہنا بولنا کچھ مفید بھی ہوتا اب اس لکھنے اور پرانے جھگڑوں کے یاد دلانے سے کیا فائدہ لیکن اس سے کہیں زیادہ حیرت یہ سن کر ہوئی کہ سنیوں نے دیوانی میں دعویٰ کیا کہ در مسجد سے یہ عبارت نکلا دی جائے کوئی مدعیوں سے پوچھے کہ اس عبارت نے ان کا کیا بگاڑا۔ اس عبارت کے قائم رہنے سے ان کا کیا حرج۔ اگر در مسجد پر یہ لکھا ہوتا کہ اس مسجد کے گرد جتنی زمین یا مکانات ہیں سب مسجد کے ساتھ مال موقوف سمجھے جائیں تو پڑوسیوں کے



عذر کے واسطے ایک بات بھی تھی۔ تیرہ سو برس کے بعد کسی کی خلافت یا سلطنت سے انکار کیا جائے تو ایک فعل عجب اور انکار اعتراف کیا جائے تو اس سے زیادہ عجب۔

## فصل نمبر ۵۸

### دنیا خوش رہنے کی جگہ نہیں ہے

( دنیا میں کوئی شے ایسی بھی ہے جس کا ذکر ہر شخص کی زبان پر اور جس کی خواہش ہر ایک کے دل میں ہو۔ پیدائش سے موت تک ہر شخص اس کا متعین ہو۔ لیکن فی الواقع دنیا میں اس کا وجود ہو اور نہ کسی کو کبھی حاصل ہوئی ہو؛ اس چیتان کا سمجھنا آسان نہیں ہے۔ جب ایک سے کسی کی مطلوب یا معصود ہوئی تو پھر اسکے نزدیک اس کا وجود کسی طرح محال تصور نہیں ہو سکتا۔ لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہو گا کہ ہمارا سوال بے معنی نہیں ہے۔ بھلا سوچو تو سہی خوشی پر یہ تمام باتیں صادق آتی ہیں؟ غور کرنے سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ خوشی ہی ایک ایسی شے ہے جس کو ہر فرد بشر چاہتا ہے لیکن کسی کو بھی وہ حاصل نہیں ہوتی۔ خوشی کے ساتھ غم اور غم کے ساتھ خوشی اس طرح وابستہ ہے کہ کسی طرح ان میں انفصال نہیں ہو سکتا۔ رونے کے ساتھ ہنسنا اور ہنسنے کے ساتھ رونا گویا لازم و ملزوم ہے خزان اور بہار دو لفظ جدا جدا ہیں لیکن ایک دوسرے کے بعد اس طرح آتی ہے کہ بمشکل کسی زمانے کو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابھی خزاں ہے بہار نہیں آئی۔ سارے پتے گرے نہیں تھے کہ نئی کو پلین نکلنے لگیں۔ اگر مسرت کا کچھ وجود ہے تو اسی حیثیت سے۔ ابھی پوری طرح سے جشن شادی ہونے بھی نہیں پایا تھا کہ ماتم کے سامان بندھ چلے۔ یہ تو وہ حالت ہے کہ خوشی براٹے نام ہمارے قریب آئی اور فوراً چل دی لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہ بھی شاذ و نادر ہوتا ہے۔ خوشی تو عموماً قریب آنے ہی نہیں پاتی ایک طرف سے اگر کچھ سامان عیش نظر آئے تو دوسری طرف سے کدورت کی صورت دکھائی دے رہی ہے۔ مصیبت کا پلہ ہمیشہ بھاری رہتا ہے۔ المہ کے نہ ہونے کا نام ہے خوشی اگر تو میں ننانوے حصہ خوشی کا ہے اور کہیں ایک حصہ رنج کا شامل ہو گیا تو خوشی کہا باقی رہی۔ غرض کہ دنیا میں خوش رہنا کبھی انسان کو میسر نہیں ہو سکتا۔ پولین بونا پارٹ ایک مرتبہ جوش ہمت میں کہہ پڑا کہ کوئی امر دنیا میں محال نہیں ہے اس بے معنی لفظ کو لغت سے نکال دینا چاہیے۔ اس وقت کوئی حاضر جواب نہ ہوا اور نہ بونا پارٹ سے فوراً ہی قبول کر لیا کہ دنیا میں خوش رہنا ضرور محال ہے کیونکہ بونا پارٹ جیسے



باہمت اور مستقل مزاج شہنشاہ سے زیادہ تر شاید کوئی شخص تجربہ کار اس امر کا پیدائہ ہوگا۔ کہ خوشی ایسی شے نہیں ہے جو اس عالم میں میسر آسکے۔ خوشی ایک محال چیز ہے تو خلقت اسکی متمنی کیوں ہے؟ یہی راز الہی یا قدرت خدا ہے خوشی کسی کو میسر نہیں آتی لیکن ہر شخص اپنے سوا دوسرے کو خوش سمجھتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ دوسرے کی طرح وہ بھی خوش رہے۔ یہ تمنا مرتے دم تک ساتھ لے جاتا ہے اور کبھی اسے ایسا وقت نہیں ملتا کہ وہ خوش ہو اور سمجھے کہ اس کے سوا دوسرے ناخوش ہیں دنیا کی حالت تو یہ ہے کہ ایک نان شبینہ کو محتاج ہے اور دوسرا متمول تو ہے لیکن اولاد نہ ہونے کے غم میں مرا جاتا ہے۔ مفلس ہے کہ متمول کو سب سے زیادہ خوش نصیب جانتا ہے اور متمول اس مفلس، صاحب اولاد کو خوش قسمت سمجھتا ہے۔ اسی طرح ایک تو اس لئے ناخوش ہے کہ حکومت کی تمنا اس کا سارا کھیل بگاڑ رہی ہے اور دوسرا ہے کہ بار حکومت سر پر پڑنے سے رات دن بے چین رہتا ہے کسی کو بے زری تباہ کرتی ہے اور کسی کو زر کی حفاظت رات بھر پلک سے پلک نہیں لگانے دیتی۔ ایک نے پیٹ کے خالی رہنے سے رات بھر اختر شمار کی ہے اور دوسرا سو رہنمائی کے درد سے رات بھر گھنٹے گنتا رہا۔ کسی کے گھر شادی کی دھوم ہے رات بھر اہل خاندان کو سونا نصیب نہیں ہوا اور کہیں مالک خانہ کے تابوت پر گھر والوں نے ماتم کر کے صبح کی ہے۔ لیکن شادی کے بعد تمام گھر والے ترودات کی بے چینی سے پڑ مردہ اور بے لطف ہو رہے ہیں اور بمقابلہ ان کے ماتم کرنے والوں کا اگلا دن فرحت و انبساط کا رنگ جھاڑا ہے۔ رو لینے سے بیعت ہلکی ہے۔ متعلقین نے سمجھ لیا ہے کہ مرنے والے کے ساتھ ہمارے تمام عیش و آرام بھی مر گئے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا اب کیا رہا جس پر روئیں۔

شکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

کسی کا قول ہے اور کیا اچھا قول ہے کہ "فرط غم کا نام ہے انبساط۔ اور فرط انبساط کا نام ہے غم" کسی کے منہ میں زبان ہے کہ خدا کی بے عیب ذات کو عیب لگا سکے؟ ہرگز نہیں۔ لیکن پھر بھی سیکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں کروڑوں ایسے بے سمجھ بندے بھی ہیں جو اللہ میں عدیل ہوئے کی صفت کو تسلیم نہیں کرتے۔ اندھے کہتے ہیں خدا یا ہم نے کیا قصور کیا تھا کہ آنکھیں (جو فطراناً تمام نبی نوع انسان کو دی گئی ہیں) ہم کو نہیں دی گئیں؟ "یتیم بچے کہتے ہیں: ہمارا کیا قصور تھا کہ باپ کا سایہ ہمارے سر سے اٹھالیا گیا؟ کتنے شیر خوار بچے اپنی ماؤں کے مرنے پر زبان حال سے کہتے ہیں: رب کریم ماؤں کا دودھ جو تو نے حیوانوں تک کے لئے حلال کر رکھا ہے ہمارے



لئے وہ کس جرم میں حرام کیا گیا؟ کوڑھی کہتے ہیں۔ جب ہم دنیا کے کسی کام کے نہیں گلے سترے پھل کی طرح درخت دنیا کی شاخ میں لٹک رہے ہیں تو پھر باغ عالم میں ہمارے لانے یا قائم کرنے کے بغیر تیری قدرت میں کیا بٹ لگا جاتا تھا۔ اسی طرح لنگڑے لوے گونگے بہرے اپنے اپنے طور پر سب ہی شاکی ہیں راجہ اپنی لاوادی کے غم میں الگ اللہ کی بے انصافیوں سے رو رو کر کہہ رہا ہے: خدا یا تو نے دولت مال جاہ و چشم یہ سب لوگوں کے دکھانے کو دیئے ہیں۔ اختیارات جو ہم کو دیئے وہ اپنی رعایا کی حفاظت کے لئے۔ دولت اس لئے دی گئی کہ شکستہ حال کی خبر گیری کی جائے۔ فوج اس لئے کہ غنیمت کی لوٹ مار سے ملک بربادی سے بچایا جائے۔ لیکن وہ شے جس سے میرے دل کو راحت پہنچے آنکھیں ٹھنڈی ہوں تو نے عطمانہ کی۔ بیوہ رانی محل کے اندر بیٹھی گھسیاروں کو دیکھتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ گھاس کا گٹھا سر پر رکھے ہوئے چل کر تھی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ دل میں کہتی ہے خدا ان گھسیاروں کی سی قسمت بھی تو نے میرے لئے مقدر نہ کی تو میں کیا سمجھوں گی کہ میں بھی کسی قادر مطلق کی بندی تھی۔

عمر ساری تو مصیبت ہی میں گزری غائب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

خدا نے راجہ دیا حکومت دی۔ لڑکے بالے عزیز یگانے سب موجود اور خوش و خرم رعایا بھی فارغ البالی غنیمت کا بھی کچھ ڈر نہیں۔ ملک میں پورا امن دیکھنے والے سمجھتے ہیں کہ راجہ سے زیادہ خدا نے کسی کو خوش قسمت پیدا نہیں کیا اور راجہ ہے کہ دو دن سے اس کے دانتوں میں درد ہے یا آنکھ میں ٹیس ہے یا گھنٹے ہو گئے کہ پلک سے پلک نہیں لگی۔ درد اس شدت کا ہے کہ وہ برداشت نہیں کر سکتا خود کشی کے لئے کئی مرتبہ اس نے نیچہ نیام سے باہر نکالا اور پھر کچھ سمجھ کر رہ گیا۔

جس وقت عبدالملک ابن مروان کو جو اپنے وقت میں دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ تھا مرض موت کی تکلیف نے زیادہ بے قرار کیا اسکی نظر ایک دھوبی پر پڑی جو محل شاہی کے نیچے دھوپ میں کھڑا کپڑے دھو رہا تھا بادشاہ کے منہ سے بے اختیار یہ کلمہ نکلا: اللہ نے اس وقت مجھ سے کہیں زیادہ آرام اس دھوبی کو دے رکھا ہے۔ اس لئے مجھ کو اس دھوبی کے عیش پر رشک آتا ہے۔ دنیا میں کوئی غذا نہ ملنے سے مر رہا ہے اور کوئی اس لئے مر رہا ہے کہ ضرورت سے زیادہ کھانا کھا جانے سے تنگ ہو گیا ہے۔ پہلا تو رزاق مطلق کا اس لئے شاکی ہے کہ اسے غذا نہیں ملی اور دوسرا اس لئے کہ کیوں ملی۔ کوئی برسوں دیہات میں جو کی روٹی اور مٹر کی دال کھاتے کھاتے اکتا گیا ہے شہر میں حلوائی کی دکان پر کھڑا اپنی بے زری سے نالاں مٹھائیوں کی خوشبو سے دماغ تازہ کر رہا



ہے اور دوسرا صفراوی تپ میں مبتلا بستر پر پڑا کر اہتا ہے اہتا کی صلاح سے گھر والوں نے کیوڑے سے بسی ہوئی کچھ کی پیالی اس کے سامنے پیش کی ہے۔ مریض ہے کہ اس کو زہر کی پیالی سے بھی زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ مفلس دیہاتی اس صفراوی کی حالت پر رشک کرتا ہے اور یہ صفراوی ہے کہ اس دیہاتی کی صحت کو یاد کر کر کے راتوں کو خدا کی بیٹے رحیمی کے شکوے زبان پر لاتا ہے۔ تکلیف مرض سے نیند تو نہیں آتی رات بھر کر اہتا یا خدا کا شکوہ کرنا یہ دو مشغلہ ہمدوم اور ہمدرد ہیں۔ ستر برس کے بڑے میاں کروڑوں روپے کی دولت گھر میں رکھ کر اس حسرت کے ساتھ اپنی جوانی یاد کرتے ہیں کہ اگر کوئی انکی ساری دولت لے کر اپنی جوانی ان کے بڑھاپے سے بدلنا چاہے تو وہ اپنی عین مراد سمجھیں گے اور ایک وہ مفلس نوجوان ہے جسکو فاقہ کشی نے اس طرح جوانی سے بیزار کر دیا ہے کہ وہ چار روپے پرلے بیچنے کو تیار ہے اور فوج میں بھرتی ہو کر مر کھپ جانے کے لئے کیا کچھ سعی اور کوشش نہیں کرتا۔

دو نوجوان عورتوں میں سے ایک نوجوان مفلس اور دوسری پیر دولت مند کے ساتھ بیاسی گئی اب اللہ کے انتظام پر دونوں کو اعتراض ہے۔ پہلی کو مفلسی ستا رہی ہے اور دوسری کو غیر موافقت۔ تیسری نے اگر دونوں باتیں پائیں تو اب اس کو فکر ہے کہ لڑکے بھی بیاہ بعد ہی پیدا ہو جائیں اور ہوں بھی تو زندگی کا بیمہ خدا کے یہاں سے کرتے آئیں۔ شوہر بھی تا بعد از رہے اور بیوی کی زندگی تک جیتا بھی ہے۔ اور اگر ان باتوں میں کہیں ایک بات بھی پوری نہ ہوئی تو بس پہاڑ سا الزام خدا پر دھر دیا گیا۔ یہ تو کیفیت ان کے دلوں کی ہے جو انتظام عالم اور خدا کی قدرت پر بالانفراد نظر ڈالتے ہیں اور جواہل دانش ہیں وہ ان سب باتوں پر اکھٹا نظر ڈال کر . . . . . یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ دنیا میں نہ کوئی خوش ہے اور نہ کوئی ناخوش ہے کوئی کسی اعتبار سے خوش ہے اور کوئی کسی اعتبار سے خوش ہے خوشی اور رنج کی حالتیں ناپائیدار ہیں۔ اگر سامان عیش یا باعث حزن علی الاطلاق قائم رہے تو اس کا وجود دیکھنے والوں کی نظر میں رہ جاتا ہے اس پر کچھ اثر باقی نہیں رہتا جس کو لوگ دائم السرور یا دائم الحزن سمجھتے ہیں۔

اللہ نے دنیا کی ساری نعمتیں ایک شخص کو عطا نہیں کیں کسی کو کچھ دیا اور کسی کو کچھ دیا۔ یہ تصور بندوں کا ہے کہ جو نعمت انکو ملی اسے حقیر سمجھیں اور جو دوسرے کو ملی اسے اچھی سمجھیں خدا کی حکمتوں کو جو اس طرح سمجھے اور خدا کے وجود کو جو اس طرح مانے اسی کو مذہبی اصلاح میں موحد اور خدا پرست کہتے ہیں اور محققوں کا قول ہے کہ جو جتنا ہی بڑا حکیم ہو گا اتنا ہی



بڑا موحد بھی ہو گا اور جو موحد ہو گا اسے دل سے یقین ہو گا کہ خدا کے عدل اور انصاف میں ذرا تامل کرنا عقلاً درست نہیں ہے اور اگر ہم سے پوچھیے تو یہ خیالات جنکے دل میں پورے طور پر مستحکم نہیں ہیں انکو کسی طرح سچی خوشی حاصل نہیں ہو سکتی۔

## فصل نمبر ۵۹

### لیست الشباب لعود

دہلیز سے نیچے دیوار سے لگی ہوئی ایک بڑھیا بیٹھی ہے کوئی ستر اسی برس کا سن ہو گا بدن پر بھریاں پڑی ہیں۔ گردن ہلتی ہے۔ مزار کے لئے زمین کی جستجو میں پشت بھی خم ہے کثیف کپڑے بدن پر ہیں۔ ہاتھ پاؤں میلے ہیں منہ پر مکھیاں بھنک رہی ہیں شاید آنکھوں کی بصارت میں بھی فرق آ گیا ہے۔ ورنہ کچھ تو اسے اپنے جسم کی صفائی کا خیال رہتا۔

پیری و حد عیب ہمیں گفتہ اند

شاید کوئی والی دوار شا نہیں ہے اس لئے بھیک کے ٹکڑوں پر مدارز لیتے ہیں مدارز لیتے ہیں۔ کیا ہے زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔

یہاں کیوں بیٹھی ہے؟ وجہ کھلی ہوئی ہے۔ خود کما سکتی نہیں دوسروں کی کمائی میں حصہ پانے کا آسرا۔ کسی گوشے یا ویرانے میں جا بیٹھے تو کون پوچھتا ہے ایسے لوگ بہت کم ہیں جو کہ ایسے ذی الحقوق کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر دیتے پھرتے ہیں۔ گزر گاہ پر بیٹھی ہے تاکہ لوگوں کی نظریں پڑیں ہزار میں کہیں ایک سنے بھی اس کا خیال کیا تو اس کا کام نکل گیا۔

کچھ کہتی بھی ہے؟ کہتی یہی ہے کہ جن لوگوں کو خدا نے کان، ہاتھ، آنکھ، پاؤں اور دانش، فراست، قوت بازو عطا کئے ہیں ان پر فرض ہے کہ ہم ایسے اپاہجوں کی خبر گیری کریں نہیں نہیں کچھ اور بھی کہتی ہے۔ کہنے کو تو ایک نہایت عمدہ قصہ کہہ رہی ہے۔ لیکن نوجوان لوگوں تم میں اس کے سننے اور سمجھنے کی طاقت نہیں۔ ہاں موتو قبل ان موتو تو۔ پر عمل کرو تو سمجھ سکو یا اس عمر کو پہنچ کر تم خود قصہ سنانے کے قابل ہو تو شاید تمہاری سمجھ میں آئے۔ قصہ نہایت دلچسپ ہے۔ زبان مقال سے وہ کہنے پر آئے اور تم سننے بیٹھو تو مہینوں ختم نہ ہو لیکن زبان حال سے جو تقریر مختصر وہ سن رہی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ جب کوئی لڑکا یا لڑکی کہیں پیدا ہو کیسے



ہی غریب یا مفلس کا گھر کیوں نہ ہو اس کی پیدائش سے اپنے یگانے سارے محلہ والوں کو خوشی ہوتی ہے ہر ایک دوڑا ہوا چلا آتا ہے آنکھیں بھاڑ بھاڑ کر دیکھتا ہے۔ حسن پڑوغ پر رنگ پر تناسب اعضاء پر رائیں دیتا ہے۔ جن کو لڑکوں سے شوق یا اپنے لڑکوں کا داغ ہے۔ وہ تو چٹے جلتے ہیں کوئی گود میں اٹھا رہا ہے کوئی چمکارتا ہے۔ ایک ہے کہ پلا پڑتا ہے دوسرا ہے کہ چٹا جاتا ہے کبھی کبھی کم سن سپیلیوں میں اس لڑکی کے کھلانے کے لئے ہر تکرار ہو پڑی۔ اللہ اللہ اس درجہ کا اخلاص اور اس حد کا پیار۔ وجہ کیا فطرت کا تقاضہ نیچر کا زور اگر بچوں کی طرف اللہ اس طرح ماؤں نیز دوسرے نبی نوع انسان کو مائل اور گریہ نہ بنائے تو پرورش کیسے ہو۔ بچوں کی بھولی بھالی صورتیں ہیں کہ دلوں کو بے قرار رکھتی ہیں۔ جبکہ اللہ نے عقل رسایا چشم بنیا عطا کی ہے وہ دوسرے ہی خیال سے دیکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اصل گھر اور اصلی وطن سے یہ نو وارد آیا ہے۔ ہماری ولایت سے تازہ وار ہے۔ دنیا کی ہوا اسکو نہیں لگی۔ دیکھئے وہاں کے خیالات اس کے ساتھ کیا کیا ہیں۔ یہ ہنستا ہے تو کیوں؟ اور روتا ہے تو کیا سوچ کر؟ غرض اس بڑھیا پر سال اول یوں ہی گزرا ہوگا۔ اچھے اچھے حسینوں اور بڑے بڑے متکبر مالداروں کی گود میں اس نے پرورش پائی ہوگی اور ذرا رونے یا اس کے منہ بنا لینے سے کتنوں کی جان پر بنی ہوگی۔ اب دوسرے سال کا واقعہ سنئے۔ کچھ کچھ پاؤں میں چلنے کی قوت آئی۔ بات بھی الٹی بیدھی منہ سے نکلنے لگی۔ اب ہر ایک چاہتا ہے کہ میری ہی دی ہوئی شے کھائے مینا کی طرح اپنی بولی سنا کر مجھے شاد کرے۔ ایک ایک بولی کے لئے سو سو خوشامدیوں۔ اور ذرا سے تبسم کے لئے لاکھ لاکھ آرزوئیں۔ اب روز بروز وزن بڑھنے لگانے نئے تعلقات لوگوں سے پیدا ہوئے کوئی تو اس لئے خاطر کرتا ہے کہ میرا کچھ کام کر دے گی اور کوئی اس لئے کہ بڑی ہو کر میرے کام آئے گی ہوش سنبھالنے پر دنیا پیچھے پڑی اس لئے دنیا کی چاہتیں بھی شروع ہوئیں۔ ابھی یہ باتیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ پندرہواں برس شروع ہوا۔ اس کا شروع ہونا تھا کہ ایک دم سے چاند ابر سے نکل آیا۔ تمام جہان میں روشنی پھیل گئی یا یوں سمجھو کہ شہاب نے تمام دنیا کے نوجوانوں کے دلوں پر اپنا سکہ جما لیا یہ وہ زمانہ ہے کہ کیسی ہی بد صورت عورت ہو لیکن وہ بھی حسین سے حسین نوجوان پر اور متکبر سے متکبر مرد پر فطری طور پر ایسا بڑا اثر رکھتی ہے کہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ سچ ہے یہ پراثر زور نیچر سے نہ عطا کیا جاتا تو یہ عورتیں بیچاری نیچر کی خدمت تو والد و تناسل کا اتنا بڑا اہم کام روز ازل سے کیوں کر انجام دیتی چلی آتیں۔ غرض کہ اب وہ زمانہ ہے کہ ایک غریب کم حیثیت کی بھی لڑکی اچھے اچھے سلاطین پر ایسی ایسی حکومت کر سکتی ہے جو کسی بادشاہ کو کسی رعایا پر یا کسی زبردست کو کسی کمزور پر حتیٰ کہ شیر کو بکری پر بھی



نصیب نہیں۔ یہ بڑھیا کہہ رہی ہے کہ یہ مناسب زمانے میں دیکھ چکی ہو شباب کی عنان حکومت بھی ایک روز میرے ہاتھ میں تھی اور ایسی تھی کہ شاید و باید۔ تینوں زمانے میں نے طے کئے ہیں۔ لڑکپن میں تمام دلوں پر ہماری حکومت تھی اس کے بعد کتنے خود غرض انسانوں پر ہمارا دباؤ تھا حالت شباب میں نوجوانوں کے دلوں پر ہماری حکومت تھی۔ اس کے بعد چوتھے پن میں ہمارے بچوں کو دودھ پینے کے لئے ہماری خواہش تھی۔ شوہر کو اولاد کی پرورش کے لئے ہماری ضرورت تھی۔ محلہ کے چھوٹے چھوٹے بچے دنیا میں زندگی بسر کرنے کے طریقے ہم سے پوچھنے آتے تھے اور اس طرح گویا عام طور پر ہم چوتھے پن میں بھی ہر دل عزیز سمجھے جاتے تھے۔ یہ پانچواں پن ایسا ہے کہ ہم دنیا جہاں حسی کہ زمین کو بھی بھاری ہیں۔ اور ہم کو سارے جہاں حسی کہ زمین سے بھی نفرت ہے۔ انٹی، نونے برس کا سن ہے دنیا کے تمام تعلقات ٹوٹ گئے اتفاقات سے وہ لوگ بھی زندہ نہ رہے جو محبت سے نہیں تو قرین ہی ادا کرنے کے طور پر ہم سے خدمت لیتے تھے۔ ہماری خدمت کرتے۔ یا خدا کے خوف سے ہماری خبر گیری کو فرض کفایہ نہیں بلکہ فرض عین سمجھتے۔ اب تو یوں سمجھیے کہ درخت میں پھول آیا پھل لگا۔ پھل بڑھا بڑھ کر پکا پک کر شاخ میں ہی سر لگ گیا اور ٹٹک رہا ہے انسان یا جانور سے کوئی بھی نہیں پوچھتا ہے حسی کہ مالک باغ (نیچر) بھی یہی کہتا ہے کہیں لوٹ کر گر پڑے کہ درخت صاف ہو۔

قصہ تو ختم ہو گیا لیکن قصہ کا نتیجہ سننا باقی ہے جو حکمت کا ایک بہت بڑا سبق ہے۔ دنیا میں موت سے زیادہ کوئی شے یقینی نہیں ہے لیکن عملی طور پر سب سے زیادہ شک اسی کی صحت میں مانتا جاتا ہے۔ موت کے آنے میں شبہ نہیں لیکن مرنے کا نام سن کر کوئی ایسا نہیں جو ناخوش ہوتا ہو اور جو اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے اسے سمجھو کہ اس خصوص میں سب سے اچھا ہے۔ دنیا کی تمام چیزوں میں اچھے اور برے دونوں اعتبارات ہوتے ہیں۔ اس بڑھیا میں سب برائی سہی لیکن مرنے میں وہ تم سب سے زیادہ جواں مرد ہے۔ اور اس لئے اس خصوص میں وہ تم سے اچھی ہے۔ اس بڑھیا کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے وقت اسکی اس خوبی پر غور کر لیا کرو تو بہت سے خطروں سے بچتے رہو گے۔



# فصل نمبر ۶

## موت

انسان کو موت لازم ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ جو پیدا ہوا اس کو ایک دن مرنا ہے۔ بلکہ اس کا منشا یہ بھی ہے کہ پیدا ہونے والے کے لئے مرنا ایک عمدہ اور آخری چارہ کار ہے۔ کبر سنی کے لئے موت لازم نہ ہوتی تو درختوں پر چڑھ چڑھ کر لوگ گرتے اور کنوئیں میں کود کود کر جان دیتے۔ ورنہ آج مورثوں کے مرنے پر آہ و فغاں کرتے ہیں۔ موت نہ ہونے پر مورثوں کے طول حیات پر گریہ و زاری کرتے۔ ہم خود اپنی ناگوار زلیلت سے بیزار ہو کر مرنے کے یوں متعنی رہتے جیسے اب جینے کے۔ خدا کی جہاں سب حکمتیں ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ اس نے پیدا ہونے کے ساتھ مرنے کو لازم قرار دیدیا۔ مرنا تو انتظام عالم کی بقا کے لئے ضروری ہے زندگی کو سبھی اس نے بالطف کر رکھا ہے۔

### نہ ہو مرنا تو جینے کا مرنا کیا

ہمارے نزدیک تمام مذاہبوں کے پیدا ہونے کا سبب یہی موت ہے۔ موت نہ ہوتی تو اس کی فکر بھی نہ ہوتی و فکر موت معدوم ہونے کے ساتھ ہی دغدغہ حشر بھی جاتا رہتا اور جب یہ نہیں تو مذہب کی پروا کس کو ہے۔ پروا ہونے ہی کیوں لگی؟ جب وہ ایک غیر ضروری چیز ٹھہری اب حالت تو یہ ہے کہ موت ٹھہری لازمی اور موت کے بعد کیا ہوگا۔ اس کو کوئی بھی نہیں جانتا۔ یہ لاطینی بس غضب کرتی ہے۔ تصور کے ساتھ ہی بس مہیب صورتیں سامنے آکھڑی ہوتی ہیں الہام غیبی کے ذریعہ سے موت کے بعد کی زندگی جس علم کی موضوع ہو اسی کو علم دین یا علم مذہب کہتے ہیں۔ الہام غیبی تو ایک ہی ہو سکتا ہے لیکن زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے کبھی کبھی پرانے مذہب کی اصلاح بھی ضروری ہوتی ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ خست باطن طمع دنیاوی یا اقتضائے جہالت کبھی ایجاد مذہب کا باعث ہو جاتا ہے۔ سچے مذہب بگڑ کر مختلف طور سے مذہب باطلہ پیدا کر دیتے ہیں غرض یہ کہ انھیں سب اسباب کے اکٹھا ہو جانے سے ہم دیکھتے ہیں کہ جتنے فرقے اتنے ہی مذاہب۔

اس وقت ہم کو مذاہب کی تاریخ نہیں لکھنی ہے۔ ہم کو صرف یہ دکھانا ہے کہ دنیا میں کوئی فرد بشر ایسا نہیں ہے جو کوئی مذہب نہ رکھتا ہو۔ حق و باطل سے بحث نہیں جھوٹ یا سچ ایک نہ ایک خیال موت و حیات کی نسبت ہر شخص رکھتا ہے اور یہی اس کا مذہب کہلاتا ہے ممکن ہے کہ دنیا کی شردت



بے فکری یا نشہ حکومت مذہب کا خیال پاس نہ آنے دے۔ مذہبی باتیں ہنسی سمجھی جائیں۔ لیکن تردد مصیبت یا بیماری کے وقت کیسا ہی آزاد خیال آدمی ہو اسے مذہبی امور ضرور بدیہی معلوم ہوتے ہیں بعض ایسے بھی ہیں جو مرتے دم تک مذہب کو پاس آنے نہیں دیتے۔ ان کا مقولہ ہے کہ چراغ گل ہو تو اسکی لوکیا ہوئی؟ بس یہی کیفیت روح انسانی کی ہے۔ حیات ایک کیفیت تھی جو مرنے کے ساتھ ہی زائل ہو گئی حشر و نشر۔ عذاب و ثواب یہ ڈھکوسلے ہیں لیکن ایسے خیال کے آدمی بھی نزع روح کے وقت اپنے خیالات پر قائم نہیں رہتے اور کہیں کر وڑ دو کر وڑ میں ایک آدھ ایسے نکل آئے کہ مر گئے مگر بات نہ بدلی تو انکا وجود الشاذ کا لعدم کے حکم میں ہے۔

موت انتظام عالم میں بہت کچھ دخل رکھتی ہے۔ مذہب گویا اسی سے نکلا ہے۔ بعض مذہب میں موت کا خیال بہت بڑی عبادت ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ دنیا میں جتنی برائیاں ہیں وہ موت کے خیال کو دل سے نکال ڈالنے پر پیدا ہوتی ہیں۔ دل میں موت کا تصور ہے تو انسان محیبت کا مرتکب نہ ہو گا۔

دیکھو تو سہی ایک تھوڑی سی زندگی کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔ گھر بنا لے۔ زمین خریدتا ہے۔ کاروبار بڑھاتا ہے۔ تجارت پھیلاتا ہے۔ بڑے بڑے معاملات کرتا ہے۔ کسی کو ملک گیری کا شوق ہے اور کسی کو قطاع الطریق کی چاٹ۔ ایک چوری کرنے گھر سے چلا ہے اور ایک اس لئے بھیس بدل کر نکلا ہے کہ چور کو پکڑ کر حسن کارگزاری دکھائے۔ غرض کہ مرتے دم تک انسان اپنی تدابیر سے نہیں چوکتا۔ اچھی تدبیروں کا کیا کتنا یہاں ذکر بری باتوں کا ہے۔ آدمی جانتا ہی نہیں کہ مرنا بھی ہے۔ کیسا غفلت کا پردہ ہے کہ موت کا وقت آگیا اور انسان ہے کہ زمین آسمان کے قلابے بیٹھا ملا رہا ہے موت کھڑی ہنس رہی ہے کہ دو چار منٹ اسکو دنیا میں اور رہنا ہے۔ اور مرنے والا سمجھتا ہے کہ تمام دنیا کے لوگ مر لیں گے جب کہیں میری باری آئے گی۔

موت سب سے زیادہ یقینی اور سب سے بڑھ کر بدیہی ہے۔ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص موت سے انکار کرے۔ اپنے مرنے پر کوئی شخص ذرا بھی شک نہیں کر سکتا۔ لیکن پھر بھی انسان جتنا موت سے غافل ہے دنیا کی کسی چیز سے نہیں۔ یہی نیچر کا اقتضا ہے۔ قدرت کا زور کہلاتا ہے قدرت خدا انسان کے دل میں نزع روح تک موت کا پورا خیال آنے نہیں دیتی۔ کیوں؟ اس لئے کہ انتظام عالم موقوف ہے اسی پر انسان اپنی موت یاد نہ کرے۔ موت کا جیسا خیال ہونا چاہیے اگر ویسا خیال آدمی کے ذہن میں رہے تو دنیاوی ترقی کے اعتبار سے اشرف المخلوقات ہونے کی



کی صفت انسان سے زائل ہو جائے۔ برے کام کے ساتھ دنیا کی عمدہ باتیں بھی انسان سے چھوٹ جائیں۔ ہمت اور استقلال کی صفت تو انسان سے بالکل جاتی رہے۔ ترقی موقوف ہو جائے اور حیوانوں کی طرح انسان کے مرنے پر بھی کوئی یادگار اسکی قائم نہ رہے۔ کوئی علم ایجاد نہ ہو نہ کوئی کل بنائی جائے۔ دریا کا سفر بند ہو جائے۔ جہاز ریل تاریں یہ تمام چیزیں معدوم ہو جائیں۔ سلطنت حکومت یہ سب باتیں مٹ جائیں۔ زیادہ تر غذا کا دار و مدار درختوں کے پھل اور پتوں پر آ رہے پکڑوں کا رواج بند ہو جائے۔ سردی میں آگ تاپنے کے سوا گرم کپڑے دیکھنے کو بھی نصیب نہ ہوں پس ایک فوری تسکین کی تمنا دلوں میں رہ جائے اور باقی تمام جوصلے اور ارادے پست ہو جائیں کوئی کام بھی اس خیال سے نہ کیا جائے کہ آئندہ زمانے میں یا آئندہ نسل کے لئے اس سے فائدہ حاصل ہو گا۔

موت کا بالکل خیال نہ آنا ایک اعتبار سے تو قیام عالم کے لئے ضروری ہے لیکن اس خیال سے کہ فسق و فجور اس پر متفرع ہوتے ہیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انسان کو ہر دم موت کا خیال رکھنا چاہیے مذاہب میں موت کا یاد کرنا ایک ضروری کام سمجھا گیا ہے۔ موت کا ہر دم خیال کرنا تو محال ہے کیونکہ خود قدرت ایسا نہیں چاہتی لیکن مذاہب کھینچ کھا سچ کر کچھ نہ کچھ موت کی طرف توجہ دلاتے رہتے ہیں تاکہ انسان دنیا کی بے ثبات خوبصورتی پر محو ہو کر برائیوں کا ارتکاب نہ کرے اور اس قدر خیال رکھنے کو قانون قدرت بھی برا نہیں سمجھتا بلکہ اچھا جانتا ہے۔

موت سے کیوں لوگ غافل ہیں جب وہ سب سے زیادہ یقینی ہے؟ اگر مفصلہً بالاتحریر نے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ یاد دیا۔ لیکن اس قدر طوالت کے ساتھ کہ ترتیب مقدمات کے بعد خلاصہ کلام تک ذہن آسانی سے نہیں پہنچ سکتا تو مختصر یوں کہہ سکتے ہیں کہ جس نے جانداروں کے لئے موت بنائی اسی قادر مطلق نے موت کے خیال کو بھی دلوں سے محو کر دیا اور اگر اس جواب میں کوئی سقم ہو تو جلنے دیجئے۔ یوں سمجھیے کہ خود سوال میں جواب موجود ہے موت سب سے زیادہ یقینی ہے اور یہی وجہ ہے کہ لوگ اس سے غافل ہیں۔ غافل نہ ہوتے تو فکر کرتے اور فکر تو اس چیز کی کی جاتی ہے جس کا تدارک اپنے اختیار میں ہو۔ مرنا سہرا لازمی اور یقینی تو پھر تر دہی کیا ہے موت کو تو ایک نہ ایک دن آنا ہی ہے پھر ابھی سے ہم قبل از وقت کیوں مرجائیں۔ خیر یہ تو عقلی تکیے ہیں جنکی کوئی حد و انتہا نہیں۔ لیکن اس بارہ میں قول فیصل یہ ہے کہ "موتو قبل ان تموتوا" مرنے سے پہلے مر جاؤ۔ یعنی موت کے خیال سے کبھی غافل نہ رہو



شارع سمجھتا ہے کہ موت کے خیال میں اس طرح مستغرق رہنا کہ دنیا کے کام بند ہو جائیں یہ تو محال عقلی ہے۔ جب تک روح بدن میں ہے ایسا ہو نہیں سکتا لیکن تاکید سی حکم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو دن میں سو مرتبہ موت کو یاد کرنا چاہے گا اسے دو چار مرتبہ وہ ضرور یاد پڑے گی اور دنیا کے مکر و ہات سے بچنے کے لئے اتنا بہت ہے۔

## فصل نمبر ۶۱

### لذات دنیا

بے بھوک تمام دنیا کی نعمتیں کھائی جائیں تو کچھ مزہ نہیں۔ سو کھی روٹی شدت بھوک میں جو لذت پیدا کرتی ہے اس کا مزہ ان سے پوچھیے جو دن کو چار دانے منہ میں ڈال کر رہ جاتے ہیں اور شام کو موٹی موٹی روٹیاں انگاروں پر سینک کر نمک یا کوئی ایسا ہی اچھا دن ہوا تو چٹنی یا آلو کے بھرتے سے کھانے بیٹھتے ہیں۔ ان بے سرو سامانوں کو جو مزہ اس سادہ کھانے میں ملتا ہے وہ شاہ ایران کو اپنے خوانِ نعمت میں بھی نہ ملتا ہو گا جب وہ بے بھوک اوروں کا ساتھ دینے کو طوعاً و کرہاً پیٹ پکڑے ہوئے کھانے کی میز پر آ بیٹھتے ہوں گے۔ جو کے ستوں میں نمک اور پانی ملا ہوا جس مسرت سے کسان اپنے انگوچھے کے گونے پر پاتوں کے دوڑے میں دیکھتے ہیں وہ مسرت ان آنکھوں کو کبھی نصیب نہیں ہوتی جو مزہ عذرا اور بریانی دیکھتے دیکھتے تھک گئی ہیں۔

پانی کا مزہ ان سے نہ پوچھو جو خس خانے میں بیٹھے ہیں۔ سوڈا۔ گلاب۔ کیوڑا۔ شربت، درد و غیرہ وغیرہ کی بوتلیں سامنے رکھی ہیں۔ ایک طرف برف کا بکس رکھا ہے۔ ابھی ایک گلاس کی برف پگھلی نہیں اور خانساماں دوسرا گلاس تیار کر رہا ہے جھلا ان بے فکر وں کو کیا پتہ لگے کہ پانی کا مزہ کیا بلا ہے۔ اس کا مزہ ان مزدوروں سے پوچھو جو پہروں کدّار چلا کر دس منٹ کے لئے کنویں کے قریب آ کر لٹیا مانج رہے ہیں۔ یا ان مسافروں سے پوچھو جو جیٹھ بیساکھ کی دھوپ میں کوسوں چل کر ایک سایہ دار درخت کے نیچے کنوئیں کے قریب آ کر دم لیتے ہیں اور گڑ کی ایک ڈلی تھیلی سے نکال کر منہ میں رکھی ہے اور پوسالہ کے قریب چلو نکا کر بیٹھ گئے ہیں اور زبان حال سے کہہ رہے ہیں۔

بجھے اک جام سے کیا پیاس اے پر مغال میری: صراحی کے دہن میں کاٹ کر رکھو دے زباں میری



پانی خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے اور زندگی بسر کرنے کے لئے ہوا کے بعد اسی کا درجہ ہے۔ لیکن اس نعمت کو وہ لوگ کبھی نعمت نہیں سمجھتے جنکو انکی زندگی میں کبھی ایسا اتفاق نہیں پڑا کہ پینے کے لئے انکو پانی تلاش کرنے پر ملا ہو۔

پوشش کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ عریانی کی تکلیف قریب نہ آنے پائے اس میں امرار کی حیثیت مفلسوں سے ضرور اچھی ہے۔ لیکن دوسرا پہلو یہ ہے کہ پوشش سے راحت پہنچے۔ جسم کو آرام ملے اور برہنگی کی تکلیف رفع ہو اور اس کے ساتھ جو ایک خاص مزہ آتا ہے اس کا لطف حاصل ہو۔ یہ باتیں امرار کو خواب میں بھی نصیب نہیں۔ اس لطف کو ان سے پوچھو جو ماگھ پوس کے جاڑے میں نو بجے رات کو گھر سے نکلے مانگنے نکلے ہیں۔ سردی سے ہاتھ پاؤں قابو میں نہیں ہیں دانت سے دانت بچ رہے ہیں متوالوں کی طرح قدم میں لغزش ہے ہاتھ پاؤں اوگردن کو اس طرح سمٹائے ہوئے ہیں جیسے لجا لور چھوٹی موٹی کی پتیوں پر کسی کا ہاتھ پڑ گیا ہو یا کچھوے نے آدمی کی صورت دیکھ لی ہو۔ پیٹ کبھت کا تقاضہ نہ ہوتا تو یہ لاکھ برس گھر سے نہ نکلتے۔ اسی حالت میں کسی سخی داتا نے نینی تال کا بنا ہوا بارہ ہاتھ کا دبیز کبل جسم پر ڈال دیا۔ ابا ہا ہا۔ ایسا مزہ آیا کہ سکندر کو خزانہ ہفت اقلیم کی کنجیوں کے شمار میں بھی یہ مزہ نہ آیا ہو گا۔ اب بتائیے جن مالداروں کی کوٹھیوں کے پتے دن چھپتے ہی بند ہو گئے۔ آتش خالوں میں آگ جلا دی گئی۔ فرش۔ گدا۔ میز کی چادر۔ بچھونا۔ تکیہ۔ جدھر دیکھو ادھر شہینہ نظر آتا ہے انکو کبھی خواب میں یہ تصور نہ آتا ہو گا کہ جاڑوں میں گرم کپڑوں کے پہننے کی لذت کی نوعیت کیا ہے اور نہ وہ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ جن عزیزوں کو وہ کبل بانٹتے ہیں انکو کیا مزہ آتا ہے۔

ایک مسافر ریگستان میں پیادہ پاسفر کر رہا ہے۔ ہنڈ لیاں سوچ گئی ہیں تلوؤں میں آبلے پڑ گئے ہیں۔ آبلوں کے ٹوٹنے سے جو زخم پیدا ہوا اس میں گرم ریت نمک بر جراثیم کا کام کر رہی ہے۔ پگڑی کا ٹکڑا بھاڑ کر مسافر نے پاؤں میں لپیٹ لیا ہے۔ یہ غیر معمولی بندش اور بھی اس کی رفتار میں دقت بہم پہنچاتی ہے اور ادھر سرد ہند جو ہلکا ہوا تو تازت آفتاب سے گودا پگھلنے لگا۔ اسی حالت میں سامنے سے ایک قافلہ نمودار ہوا اور کسی خدا ترس نے اپنے محل میں اس غریب الوطن کو بٹھا لیا۔ اللہ نے مویشیوں کو انسان کا مطیع بنا کر کتنا بڑا احسان بندوں پر رکھا ہے۔ یاد دوسرے لفظوں میں سواریاں بھی انسان کے لئے کیسی مزیدار چیزیں بنائی گئی ہیں اب اس مسئلہ کو یہ آوارہ وطن اچھی طرح سمجھے گا یا وہ لوگ سمجھیں گے جن کو تمام عمر دو قدم



بھی پیدل چلنا نہیں پڑا اور اس لئے وہ اپنی سواریوں کو ایسی ہی معمولی چیزیں سمجھتے ہیں جس طرح ہر جان دار اپنے ہاتھ پاؤں کو اپنا جزو بدن اور ہر وقت کا ساتھی جانتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی لذتیں امیر اور غریب دونوں پر یکساں تقسیم کی گئی ہیں۔ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ دنیا میں دولت مندوں کو زیادہ مزا ملتا ہے اور مفلسوں کو کم۔ آرام اور تکلیف یہ دونوں اعتباری اور خیالی چیزیں ہیں۔ اکثر غریب کا یہ غلط خیال ہے کہ امیروں کے ساتھ فیضان الہی کچھ رعایت کرتا ہے۔ امیر اور غریب کا ہونا یہ ایک انتظام دنیا ہے اور یہ بھی ایک ضروری انتظام سے ہے کہ ہر غریب کو امیر بننے کی خواہش رہے ورنہ فی الواقع سچی مسرت جو اصل نعمت ہے امیروں کو زیادہ دی گئی ہے اور غریبوں کو کم ایسا ہرگز نہیں ہے اور اسی وجہ سے مذہبی لوگ اللہ کو عادل کہتے ہیں بلکہ ایک اعتبار سے امیروں کو تفکرات دنیا کی وجہ سے تکلیف غریبوں سے زیادہ دی گئی ہے۔ یعنی جس طرح سے غریبوں کو یہ فکر ہوتی ہے کہ ہم کس طرح سے اپنی مالی حالت میں ترقی کرتے آتی ہیں یا اس سے بھی زیادہ متمولوں کو اپنی حالت قائم رکھنے کی فکر ہوتی ہے۔ سعدی کا قول کتنا اچھا ہے۔

گدرا سیر شوذنان شام !  
چنان خوش بہ حسد کہ سلطان شام

## فصل نمبر ۶۲

### اچھا برا

دنیا کی تمام صفتیں اعتباری ہیں۔ ایک شے ایک اعتبار سے اچھی اور دوسرے اعتبار سے بری ہے یعنی بجز ذات باری کے اور کوئی شے یہ حق نہیں رکھتی کہ ہر اعتبار سے اچھی کہی جائے اس لئے کسی کی نسبت یہ کہنا کہ یہ اچھا ہے یا برا نہایت مشکل ہے اور اس سے زیادہ مناسب لفظ استعمال کیجئے سخت غلطی ہے۔ صوفیوں اور جوگیوں کا قول ہے کہ انسان کے لئے بجز خود اپنی ذات میں ہم کیا کم نقص پاتے ہیں کہ دوسروں کے نقائص کی ہم کو تفتیش ہو۔ لیکن دنیاوی اغراض کے لحاظ سے کوئی تعریف اچھے یا برے کی ٹھہرانا ہی پڑتی ہے



کسی نے لکھا ہے کہ اچھا وہ ہے جو اپنی ڈیوٹی کو اچھی طرح انجام دیتا ہو۔ اب ڈیوٹی اچھی طرح انجام دیتا ہو۔ ان تینوں الفاظ کا پورے طور پر سمجھنا اور بھی مشکل ہو گیا اور گویا دقتیں سہ چند ہو گئیں جہاں ایک لفظ کا سمجھنا دشوار تھا وہاں اکٹھے تین تین لفظ سمجھنے پڑے۔

انسان کے ساتھ بہت سی ڈیوٹیاں ہیں تو کچھ تو با اقتضائے انسانیت کچھ بلحاظ پیشہ کچھ بہ حیثیت حالت۔ یہ اکثر سنا گیا ہے کہ ایک شخص باعتبار رنج ہونے کے برا ہے اور باعتبار انسان ہونے کے اچھا ہے لیکن یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گا کہ ان حیثیتوں سے الگ ہو کر سوال کیا جائے تو جواب میں اچھا کہا جائے گا یا برا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جن لوگوں میں زیادہ تر اچھے اعتبارات ہوں ان کے برے اعتبارات سے چشم پوشی کی جائے اور اسی اعتبار سے نشہ خوار کی مروت۔ حلم۔ سخاوت یہ صفتیں اس کے عیب کے چھپانے والی سمجھی جاتی ہیں۔

### سخاوت میں عیب راکیمیاست

اور اسی طرح جو اپنے اہم کام کو عمدہ طور پر انجام دیتا ہو اس کا ایک کام باعتبار اہم ہونے کے بہت سی صفتوں کے برابر سمجھا جاسکتا ہے اور لوگ اس کے دیگر عیوب سے چشم پوشی کرنے لگتے ہیں۔ جہانگیر اور عالم گیر کو دیکھیے۔ قتل انسان اور باپ کی نافرمانی پر گویا اخلاقی برائیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ تاریخ بتا رہی ہے کہ یہ دونوں بادشاہ ان جرائم کے ضرور مرتکب تھے۔ لیکن تاریخی صفحے اٹپے تو معلوم ہو گا کہ یہ دونوں بادشاہ اچھے سمجھے جاتے ہیں۔ جہانگیر کو عام باشندگان ہند اور عالمگیر کو عام مسلمانان ہند اچھا جانتے تھے اور سمجھتے ہیں۔

باپ سے بغاوت اور ابو الفضل کے قتل ناحق کا دھبہ جہانگیر کے دامن نیک نامی سے کسی طرح مٹ نہیں سکتا۔ عالمگیر کے شرعی لباس سے بھائیوں کے خون ناحق کا داغ نہ دور کیا جاسکتا ہے اور نہ جب تک اس کے باپ کے مقید رہنے کا خیال دل میں ہے غضب سلطنت کا الزام اسپر سے ہٹایا جاسکتا ہے۔ لیکن ان تمام برائیوں کے ساتھ کیا وجہ ہے کہ لوگ اسکو اچھا سمجھتے ہیں۔ بس اسی لئے کہ دونوں بادشاہوں نے تخت پر بیٹھ کر عادل ہونے کی ایسی کچھ صفت دکھائی کہ معاصر بادشاہ باوجود تمام نیک نامی اور اخلاقی صفات کے ان کا مقابلہ نہ کر سکے اور اس غالب صفت میں غالب رہنے سے وہ جہانگیر اور عالمگیر تمام صفات میں اچھے رہے اور عام طور پر اچھے سمجھے اور اچھے کہے گئے۔

اسی طرح جموں کو خیال کیجئے۔ جو شخص حقوق کے تصفیہ کرنے کا کام اپنے سر لیتا ہے



اسکی تمام صفات سے الگ ہو کر لوگ صرف یہ دیکھنے لگتے ہیں کہ اس ججی (تصفیہ حقوق) کی ڈیوٹی کو یہ کس طرح انجام دیتا ہے اور اس کے لپے برے مشہور ہونے کے لئے بس یہی ایک معیار ٹھہر جاتا ہے۔ اسکی وجہ کیا ہے۔ بس یہ کہ تصفیہ حقوق کی ڈیوٹی اس کے تمام کاموں میں اہم ہے اور اس لئے لوگ اس کے دوسرے افعال کی طرف نظر نہیں ڈالتے۔

لیکن یہ کلیہ بھی بعض مقامات پر غلط ثابت ہوتا ہے۔ کتنے بادشاہ ایسے گزرے ہیں بہترے قاضی ایسے ہو گئے ہیں جو باوجود اعلیٰ درجہ کے عدل اور منصف مزاجی کے نیکنام نہ ہو سکے اپنے غرور، نخوت، سخت زبانی، سخت دلی، تیز مزاجی سے وہ ہمیشہ برے سمجھے گئے اور ان کے عادل و منصف مزاج ہونے کی صفت ان سخت برائیوں کے مقابلہ میں غالب نہ آسکی۔

مسلمانوں کے پیغمبر کا ایک مقولہ ہے جسکا ترجمہ ہم یوں کر سکتے ہیں کہ تم میں اچھا وہی ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہے اور برا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ برا ہو۔ یہ مقولہ بہت صحیح ہے انسان کی اچھائی برائی جاننے کا اچھا موقع یہی ہے کہ اسکی ابتداء زندگی اور طرز تمدن کو معیار ٹھہرائیں یا یوں سمجھیں کہ جو اپنے یگانوں کے ساتھ اچھا نہ رہ سکا وہ دوسروں کے ساتھ کیا اچھا ہو سکے گا۔ کہیں یہ مطلب نہ سمجھیے کہ جو غمروں کے گھر نقب دیکر اپنے یگانے کی پرورش کرے وہ بھی اچھا مفصلہ بالا تحریر کو اس پوری تقریر سے کوئی نسبت نہیں جو اس خصوص میں کیجا سکتی ہے لیکن ناظرین کو اس مختصر تحریر کو دیکھنے کے بعد بھی کسی کو اچھا برا ٹھہرانے میں بہت تاثر ہوگا اور صوفیوں کے قول پر لا محالہ ان کو عمل کرنا پڑے گا کہ ہم میں کیا کم عیب ہیں جو دوسروں کے عیوب کو ہم دیکھتے پھریں۔

حکما کے اکثر مقولے یا شاعروں کے بعض کلام بڑے بڑے مباحث کے طے کر دینے میں کچھ ایسا اثر رکھتے ہیں کہ سن کر حیرت ہوتی ہے اور یہ رائے قائم ہوتی ہے کہ خاص فیضان الہی کا یہ نتیجہ ہے کہ ایسا قول فیصل انسان کی زبان سے نکلا۔ اس خصوص میں جو رائے مسلمانوں کے پیغمبر نے ایک دوسرے مقام پر ظاہر کی ہے اسے ابراہیم ذوق نے اپنے طور پر شاعرانہ مذاق میں یوں نظم کیا ہے۔

جسے برا کہے عالم اسے برا کہیے  
زبان خلق کو نقارہ خدا کہیے



## فصل نمبر ۶۳

### حرص

انسان بھی کیا حرص ہے۔ خدا نے اپنے فیض میں کسی بندے کے ساتھ کمی نہیں کی۔ لیکن عجب معاملہ ہے کہ بہت کم ایسے ہیں جو اس کے شکر گزار ہیں: ان قلیلًا من عبادی الشکور۔ "غضب تو یہ ہے کہ بہتیرے شکر کرنے والے ایسے ہیں جو دل سے شکر نہیں کرتے صرف زبان سے الحمد للہ علی نعمائہ کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ رکن مذہب ادا کرنے کے لئے دل سے نہیں تو منہ سے کہنا لازم ہے۔

سمجھ داروں کے نزدیک خدا منصف ہے اور منصف کا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی مخلوق میں سے کسی کے ساتھ کم احسان کرے اور کسی کے ساتھ زیادہ۔ خدا اپنے تمام بندوں کو یکساں سمجھتا ہے یہ ہماری غلطی ہے کہ ہم سمجھنے میں قصور کرتے ہیں۔ زندگی کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز ہوا ہے سچے پڑے کے فعل ہی صحیح رکھنے کے لئے نہیں بلکہ ترکیب جسم کو اپنی اصلی حالت پر قائم رکھنے کے لئے بھی ہاؤدیکھو خدا نے ہوا اس کثرت سے پیدا کر رکھی ہے کہ شاید ہی اس کی مخلوق میں کوئی شے اتنی زیادہ ہو۔ کبھی کسی کو ہوا کی شکایت نہیں ہوتی بعض حکما کے نزدیک تو ظالم حال ہے۔ جہاں کچھ نہیں وہاں ہوا ضرور ہے۔

ہوا کے بعد پانی کا درجہ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہوا کی طرح دس پانچ منٹ تک پانی نہ لے تو آدمی ہلاک ہو جائے لیکن پھر بھی یہ ضرور ہے کہ اللہ نے ہوا کے بعد اور تمام چیزوں سے زیادہ پانی کی ضرورت ہے۔ اللہ نے پانی کے لئے مختلف ذریعہ پیدا کر رکھے ہیں۔ کمی بیشی اچھے برے کی بحث نہیں۔ نفس پانی کو دیکھنے تو دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس کو پانی بہم پہنچانے میں دقت ہوتی ہو۔ ہر جگہ یہ موجود ہے اور فطرتی فیض باری میں اس کا شمار ہے۔

ہوا اور پانی کے بعد غذا کا درجہ ہے۔ جس طرح ضروریات انسانی میں اس کا تیسرا درجہ ہے اسی طرح اس کے بہم پہنچانے کے وسائل میں بھی کسی قدر دشواری ہے۔ لیکن پھر بھی خدا کا انتظام قابل ستائش ہے کہ ایک طرف رزق کے وسائل تمام دنیا وی امور سے مشکل رکھے گئے ہیں اور دوسری طرف یہ خوشخبری سنائی جاتی ہے کہ: رزقکم فی السماء: شاید ہی



کوئی ایسا شخص ہو جو بھوکوں مرے ہر شخص کو کسی نہ کسی چیلے سے رزق پہنچ جاتا ہے اور اس امر میں بھی گویا تمام نبی نوع انسان کا ایک ہی درجہ ہے۔ جاہلوں کو یہ شکایت ہے کہ خدا بعض بندوں کو اچھا کھلاتا ہے اور بعضوں کو برا۔ لیکن واہ رسی حکمت خداوندی۔ عورت سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ غذا کا اچھا برا ہونا ہمارا واہمہ ہے تمام غذائیں لذت میں مساوی ہیں غذاؤں میں فرق ہے ہی نہیں۔ مزید ار اور بد مزہ ہونے کا معیار بھوک پر رکھا گیا ہے۔ کھانے کی اصلی لذت ہے بھوک اور وہ ہر شخص میں اگر کوئی جسمانی عارضہ نہ ہو تو مساوی پیدا کی گئی ہے بھوک کی حالت میں فقیر کی نان جوئی کا مزہ اس خوان نعمت سے جو بادشاہ کے آگے رکھا جاتا ہے کہیں بڑھا ہوا ہوتا ہے۔

دھات میں لوہا سب سے زیادہ کارآمد چیز ہے اور اس لئے خدا نے اسے سب سے زیادہ ارزاں کر رکھا ہے۔ سونے چاندی کا وجود دنیا میں کم ہے بازار میں ان کا نرخ بھی تیز ہے لیکن یہ ہماری غلطی ہے کہ بے سود چیز کو بے وجہ قابل قدر ٹھہرائیں اور تونگروں کے زرد سیم پر رال پیکائیں۔ کچھ دنوں سے سونے چاندی کے ورق مقویات میں استعمال کیئے جاتے ہیں اور تھوڑے عرصہ سے محمود خاں کی بدولت سونے کا کشتہ بھی کھایا جاتا ہے ورنہ اس کے پہلے یہ چیزیں دھوکے ہی دھوکا تھیں نہ کسی مصرف کی تھیں اور نہ کسی طرح انسان کی فطری ضرورت کو رفع کر سکتی ہیں اور سمجھیے کہ ذلیت انسانی کے مفر سمجھ کر خدا نے ہیرے کو پہاڑوں کے نیچے چھپا دیا تھا تاکہ لوگوں کا دست رس نہ ہو۔ گندم بہشت کی طرح بندوں نے سمجھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اتنا چھپایا ہے تو اس میں کوئی لذت ضرور ہوگی۔ کبخت یہ نہ سمجھے کہ اس میں اگر کچھ لذت ہوتی تو خالق مطلق چھپاتا ہی کیوں۔ بہ ہزار وقت جب یہ کھو دکر نکالا گیا تو مفر ذلیت ثابت ہوا کہیں اس کے ذرے پیٹ میں پہنچ جائیں تو زندگی کے لالے پڑ جائیں۔ مناسب تو یہ تھا کہ اپنی غلطی پر متنبہ ہونے پر انسان کو انفعال ہوتا۔ لیکن اس کے برعکس حضرت انسان ہیں کہ اپنی ہٹ پر قائم ہیں۔ یا اپنی محنت کی داد چاہتے ہیں۔ ہیرا جتنی ہی بیکار چیز ہے ویسی ہی اب اسکی زیادہ قدر ہوتی ہے اور تمام نعمتوں سے زیادہ گراں ہو کر بازار میں بکتا ہے۔ اب ان سب باتوں سے نتیجہ یہ اخذ ہو سکتا ہے کہ خدا نے ضروریات زندگی تمام بندوں پر یکساں تقسیم کر دی اب یہ انسان کی غلطی ہے کہ جس چیز کو خدا نے غیر ضروری سمجھ کر کم پیدا کیا انسان خواہ مخواہ اصرار کرتا ہے کہ یہی ہم کو زیادہ ملے کتنا عمدہ مقولہ ہے "الان حریصین فیما منح"



## فصل نمبر ۶۲

### خَلْقِ الْإِنْسَانِ ضَعِيفًا

غور کیجئے تو انسان کا سامنا کمزور اور بے سروسامان کوئی دوسرا جاندار نہیں۔ گائے۔ بھینس۔ بکری کے بچوں کو دیکھئے پیدا ہوتے ہی کو دہانے لگتے ہیں۔ دو تین ہفتوں میں ماں کے دودھ سے بھی بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اور انسان کے بچے پانچ چھ مہینہ کے بعد تو ہنسنا سیکھتے ہیں۔ چلنے پھرنے بولنے کے لائق تو وہ جب ہوں گے کہ ان کے ہم عصر حیوانوں کے بچے عمر طبعی طے کر لیں۔

انسان تنگ پیدا ہوتا ہے۔ پیدا ہونے پر اسے پہلی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ گرمی اور سردی سے بچانے کو اس کے لئے لباس بہم پہنچایا جائے۔ مکان یا کسی دوسرے سایہ کی تلاش ہو پوشش کے لئے دوسرے حیوانوں کی کھال ڈھونڈنا پڑتی ہے۔ نباتات کے پھلوں یا ریشموں سے کپڑوں کے لئے سوت بنائے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی کپڑوں کی بیٹ یا ان کے لحاب دہن کے لئے بھی رکہ یوں ہی ریشم پیدا ہوتا ہے) جانفشانی کی جاتی ہے۔ جانوروں کو قدرت نے ان تمام جھگڑوں سے مستغنی پیدا کیا ہے۔ اپنے جسم کی حفاظت کے لئے وہ دبیز کھال یا گرم روئیں ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں وہ خود کیا محتاج ہوں گے اپنی بدولت ہم کو غنی بنا دیتے ہیں۔ اپنی کھال اور روئیں ہم دام دیتے ہیں جب کہیں ہماری زندگی قائم رہتی ہے۔

خوراک کی نسبت غور کیجئے۔ اکثر حیوان بے منت خیرے زمین کی گھاس اور دخت کے پتوں سے پیٹ بھرتے ہیں اور بے غل و غش زندگی بسر کرتے ہیں۔ نباتات جنکی غذا نہیں ہے وہ چھوٹے چھوٹے جانوروں یا کپڑوں یا پانی کی میل کچیل کھانے کے عادی ہیں اور اس طرح گویا انکو بھی فکر معاش نہیں ہوتی۔ چلتے پھرتے اپنی غذا میں پالتے ہیں اور پیٹ بھرتے رہتے ہیں بخلاف اس کے انسان کو اپنے رزق بہم پہنچانے میں جو کاوشیں کرنا پڑتی ہیں وہ لاتعداد و لاتحصى ہیں مثلاً روٹی۔ گیہوں کے دانے کھیت میں پڑے اور جم آئے۔ کھیت لہلہانے لگا تمام حیوانات اس پر ٹوٹ پڑے اور کھانا شروع کر دیا۔ انسان ہے کہ اس کو کھا نہیں سکتا اس کو انتظار ہے کہ خوشے لگیں۔ دانے پڑیں۔ دانے پکیں۔ پک کر خشک ہوں خشک ہو کر بھوسا الگ ہو۔ ان سب مرحلوں کے طے ہونے کے بعد بھی بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ یہ دانے آگ میں بھون



کر کھائے جائیں۔ سب کے معدے ان کے ہضم کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ضرورتاً پینا پڑتا ہے پین کر چھاننا اور چھان کر آٹے کا گوندھنا۔ خمیر کرنا۔ روٹی پکانا اور پکانے میں آگ کا تاؤ دیکھنا کہیں روٹی جل گئی تو ساری محنت اکارت گئی اسی طرح تمام غذاؤں پر خیال کیجئے تو انسان کی کوئی غذا ایسی نہ ملے گی جو بے تردد اور بلا کاوش بہم پہنچتی ہے۔

دیکھیے صحت بدنی قائم رکھنے کے لئے انسان نے کتنا بڑا علم طب کا بنایا ہے روز بروز امراض اور دواؤں کے مدت بڑھتے جاتے ہیں۔ حیات انسانی کا ایک حصہ اس کے متعلق غور و فکر کرنے میں بھی صرف ہوتا ہے اور حیوانوں کو نہ کچھ اسکی پروا ہے اور نہ کچھ احتیاج ہے۔ کتنی بیماریاں وہ زبان سے بچاٹ کر اچھی کر لیتے ہیں انکی ساخت ہی کچھ ایسی رکھی گئی ہے کہ ان کو مرض بھی بہت کم ہوتا ہے۔ دیکھیے جا بجا مولیشیوں کے لئے اسپتال کھولے گئے ہیں انسان نے فرط رحم کے اظہار میں یا اپنی خود غرضی کی وجہ سے حیوانوں کے علاج کا بندوبست کیا ہے۔ یا یوں کہو اپنی طرح حیوانوں کو بھی کمزور سمجھ کر ان کی مٹی خراب کرنا چاہی ہے لیکن تجربہ سے یہ معلوم ہوا کہ مولیشیوں کے علاج کی بہت کم ضرورت پڑتی ہے وہ بیمار پڑنے ہی کیوں لگیں ان کے قوائے ذائقہ اور شامہ کو قدرت نے ایسا قوی پیدا کر رکھا ہے کہ ان سے بہت کم چوک ہوتی ہے اور چوک نہ ہونے سے بیماری قریب نہیں آتی۔

جانوروں کی اعانت کے بغیر انسان راہ بھی طے نہیں کر سکتا وہ خود چل بھی سکا تو اپنی ضرورت کی چیزوں کو کسی طرح اٹھا نہیں سکتا۔

یہ مضمون بہت وسیع ہے جتنا کہا جائے تقویرا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی بسر کرنے میں خلقتاً جتنا محتاج پیدا کیا گیا ہے اتنی محتاج کوئی دوسری مخلوق نہیں ہے اور اس عالم میں بیکس اور بیچارہ کی مصداق اگر ہے تو ذات انسانی ہے یا اینہمہ انسان اپنے کو اشرف المخلوقات سمجھتا ہے۔

مفصلہ بالا مضمون ذہن میں رکھنے کے بعد اس اشرف المخلوقات ہونے کی اذکار پر تنسی آتی ہے۔ واہ کیا اچھا شرف ہے۔ اگر اسی بیکسی و بیچارگی کو شرف کہتے ہیں تو اشرف ہونا بدترین صفت ہے۔ نہیں! نہیں! زبان کو رو کو خدا کی ناشکری نہ کرو۔ ایک نعمت ہم کو ایسی عطا ہوئی ہے جو ہمارے تمام نقصانات کی تلافی کرتی ہے اور ہماری تمام کمزوریوں کا نعم البدل بن سکتی ہے اس نعمت کا نام عقل ہے۔ جس طرح ایک بہت بڑے تیرہ و تار یک مکان کی بھیانک شکل کو....



ایک شمع کی روشنی بالکل نوزانی کر دیتی ہے ویسے ہی عقل نے ہماری تمام کمزوریوں کو ایک دم سے رفع کر دیا۔ جب عقل ایسی دولت ہمارے ہاتھ میں ہے تو ہم کسی طرح محتاج نہیں کہے جاسکتے اور جب عقل ایسا ہتھیار ہمارے قبضہ میں ہے تو ہم کسی طرح کمزور نہیں ہو سکتے لیکن پھر بھی ایک بات رہ جاتی ہے۔ یعنی اگر ہم عقل کو کام میں نہ لائیں تو ہمارا ضعف بدستور قائم رہے گا۔ یہ امر مسلم ہے کہ انسان میں بہت سی قوتیں ایسی ہیں جو عقل سے ہمیشہ لڑتی ہیں اور اس پر غالب آنے کی کوشش کرتی ہیں مذہب یا اخلاق کے اکثر مسائل اسی نزاع کے طے کرنے کے لئے یا عقل کو قوت دینے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ مثلاً تکبر نہ کرو۔ اس کا منشاء یہ ہے کہ اپنی کمزوریوں کو تم کبھی نہ بھولو کیونکہ ان کے بھولنے سے تم اپنے کو عقل سے مستغنی سمجھو گے اور اس لئے ضرور ہے کہ ایک نہ ایک دن مصیبتوں کا سامنا ہو۔ تمہاری دنیاوی احتیاج رفع کرنے کے لئے جو راستہ عقل بتائے گی اس پر چلنے کی حالت میں تم میں اس امر کی بڑی ضرورت ہے کہ لوگ تم کو صادق القول سمجھیں۔ اگر تم جھوٹ بولو گے تو اس راہ پر نہ چل سکو گے اور اس طرح احتیاج کی ہتیری کمزوریوں سے اپنے کو نہ بچا سکو گے۔ اپنے ضعف مٹانے کے لئے ضرور ہے کہ دنیا کے معاملات میں قاعدوں کو اپنا رہنما سمجھ کر سختی کے ساتھ ان کے پابند رہو اور اس لئے تم پر فرض ہے کہ بلا نکاح عورتوں سے قربت نہ کرو۔ حاکم وقت کی اطاعت کرو۔ بڑوں کا ادب ملحوظ رکھو۔ متوفی کے ترکے میں اپنے حق سے زائد نہ لو۔ گھر والوں اور پڑوسیوں سے بہ کشادہ پیشانی ملو۔ اگر ان قاعدوں کا لحاظ نہ کرو گے تو اپنی کمزوریوں کی وجہ سے ضرور ایک نہ ایک دن بڑے دنوں کا سامنا ہو گا۔

حرص۔ غضب۔ شہوت۔ طمع۔ غصہ۔ تکبر۔ حسد۔ رشک۔ فکر۔ تردد۔ بیماری۔ سردی۔ گرمی۔ مفلسی۔ بھوک۔ پیاس۔ عشق۔ بیکسی۔ ایک انسان کے پیچھے نہ معلوم کتنی بلائیں ہیں۔ اور عارضی یا چند روزہ نہیں انسان کے ساتھ پیدا ہونے والی اور اسی کے ساتھ مرنے والی ہیں یہ سب بلائیں ایک طرف اور انسان ضعیف البیان عقل کے سہارے پر دوسری طرف بھلا کہاں تک وہ ان مصیبتوں کا مقابلہ کر سکے گا۔

غرض کہ تمام دنیا کی بیماریاں انسان ہی کے لئے مخلوق ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیماریاں دو چند بھی ہوتیں تو ایک عقل سب کے علاج کو کافی ہوتی۔ لیکن اس عقل کے دشمن اتنے زیادہ ہیں کہ ان کے مقابلے سے اس کو فرصت نہیں ملتی۔ ہماری مدد وہ کہاں تک کرے گی۔ ایسے لوگ بھی گزر رہے ہیں اور اب بھی جو اس عقل کو بہت زیادہ احتیاط سے کام میں لاسکتے



ہیں اس کے مخالفین کو وہ کبھی غالب نہیں ہونے دیتے۔ لیکن ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ گویا یہ نہیں ہیں اور اس لئے عملی طور پر جو نتیجے نکلتے ہیں ان پر لحاظ کرنے کے بعد بے تکلف کہا جاسکتا ہے کہ انسان اپنی خلقت میں کمزور ہے۔

## فصل نمبر ۶۵

### نطق اور دل و دماغ سے اسکا تعلق

شخصی حالت سے قطع نظر کر کے قومی حالت پر لحاظ کیا جائے تو یہ امر ماننا پڑے گا کہ فصاحت بلاغت۔ قوت۔ ادائے مطلب۔ زبان دانی۔ یہ تمام باتیں دل و دماغ کی قوت پر منحصر ہیں کسی کا قول ہے کہ ضعیف الجثہ آدمی کا ذہن اور متین ہونا بالکل بے سود ہے۔ جب دل و دماغ میں طاقت نہیں تو نری ذہانت سے خاک کام نکلے گا۔ دل و دماغ کی قوت کے علاوہ طبیعت کا قوی ہونا بھی ایک ایسی شے ہے جس کو نطق میں بہت دخل ہے۔ بہت بڑے علامہ دہر کو جو مفلسی میں فاقہ کرتا ہوا اس جاہل بے بلد کے پاس بٹھا دیکھے جو نشہ دولت میں سرشار ہوا اور پھر دیکھے کہ اگر ملا صاحب کو کچھ غنائے نفس ہے تو خیر ورنہ اس جاہل کے سامنے یہ سٹی بھول جائیں گے اور پھر یہی نہیں کہ وہ جاہل تمام باتیں بے سرو پا کرتا رہے گا معقول باتیں بھی اس سے سنی جائیں گی۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ دولت بڑھنے سے یا کسی قسم کی خوشی یا استغنیٰ حاصل ہونے سے بھی نطق میں زور اور طبیعت میں روانی آجاتی ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ نطق کو بہت کچھ زور طبیعت سے تعلق ہے۔ فاتح اور مفتوح قوموں کا مکالمہ بھی اس خصوص میں قابل لحاظ ہے۔ مفتوح قوم کی عمدہ سے عمدہ رائے اسکی زبان سے لچر معلوم ہوتی ہے اور وہی فاتح قوم کا ممبر ہے کہ ایک سٹری سی بات کس زور دار لہجے میں بیان کرتا ہے۔ کہ سنکر تعجب ہوتا ہے۔ بادشاہوں کا رعب۔ سپہ سالاروں کا تہو ریا رکیوں کا دباؤ یہ سب چیزیں کیا ہیں۔ وہی طبیعت کا زور ہے کہ اس نے نطق میں قوت دے رکھی ہے اور یہ قوت دلوں پر مقناطیسی اثر یا سحر کا کام کرتی ہے۔ نطق بھی قوم کی حالت کا ایک مقیاس ہے جس قوم میں طاقت لسانی نہ ہو اسے بیچ اور نیکی سمجھنا چاہیے۔ طاقت لسانی سے لاف زنی یا فضول



گوئی مراد نہیں ہے۔ بلکہ گفتگو کا وہ لہجہ مراد ہے جو دوسروں کی طبیعتوں پر اثر ڈال سکے اور مافی الضمیر پورے طور پر ادا ہو۔ اگر ہمارے دعوے کا بین ثبوت دیکھنا ہو تو عدالتوں میں تشریف لائیے۔ دیہاتی گواہ بے علم۔ بے قدرت۔ چاروں طرف سے ادبار گھیرے ہوئے۔ نہ کسی طرح کا زور نہ کسی قسم کی ہمت۔ پڑ مردہ دل اور زبوں حال جب کبھی عدالت میں گواہی دینے آئے تو آپ کی زبان پورے طور پر آپ کی حالت کا فوٹو کھینچ دیتی ہے۔ چیراسی نے حلف دینے کا ارادہ کیا چیراسی نے کہا کہو: خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ کہوں گا۔

گواہ: سچ نہیں کیا جھوٹ کہنے آیا ہوں۔

چیراسی: ارے میاں! جو کہتا ہوں وہی لفظ بہ لفظ کہو۔

گواہ: ہاں! ہاں! خدا کو جانتا ہوں۔

چیراسی: خدا کو کون نہیں جانتا۔ یہ کہو: خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ کہوں گا۔

گواہ: ہاں جی ہاں۔ سچ کہوں گا۔

غرض کہ ذرا سا معاملہ اور دس منٹ تک چیراسی سے حجت ہوئی۔ جب تک حاکم نے ڈانٹ نہیں بتائی تب تک پورے طور پر حلف نہیں لیا۔ اب آگے چلے تو سوال کا جواب یا تو سوال سے بالکل الگ یا ضرورت سے بہت زیادہ اور فنول۔ اور کبھی اختصار کیا تو ایسا کہ کچھ سمجھ نہ آیا۔ بجائے ہاں کے کیوں نہیں بولنا تو گویا تکیہ کلام ہے پانچ پانچ منٹ پر حاکم کا ترش رو ہو کر ڈانٹنا یا چیں بہ جبین ہو کر دیکھنا ویسا ہی ضروری ہوتا ہے جیسا مٹھر گھوڑے کو بار بار ایڑ لگانا اکثر لوں کی رائے ایسے اظہار پر یہ ہوتی ہے کہ گواہ ٹال مٹول کرتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یہ لفظ کی کمی ہے کہ جو قومی ادبار اور قومی ضعف کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اس کے مقابل میں کسی ان پڑھ گورے یا کابلی میوہ فروش کو کھڑا کر کے اظہار لیجئے تو دیکھئے۔ لیس۔ نو، ہاں۔ نہیں ہیں کھٹا کھٹ سوالوں کا جواب دیتے چلے جاتے ہیں۔ ابتدائے فتوحات اسلام میں جو طاقت جاہل عربوں کو تھی اس پر مصر۔ شام۔ ایران کے بڑے بڑے عالم دنگ رہ جاتے تھے سلاطین عصر جاہل سفروں سے اپنے مذہب اور عقیدے کے خلاف باتوں کا سننا اور عرصہ تک سلسلہ سخن کا جاری رکھنا محض طاقت لسانی کا لطف حاصل کرنے کے لئے گوارا کرتے تھے سب سے بڑا تعجب تو یہ ہے کہ جہلائے عرب لڑائی خوشی یا جوش کی حالت میں فی البدیہہ شعر کہتے تھے اور وہ بھی دو ایک نہیں دس دس پندرہ پندرہ۔ فصاحت ایسی کہ اس زمانہ



کے لکھے پڑھے مقابلہ نہ کر سکیں۔ واقعات تو پیدا سے بالکل موافق جن سے یہ خیال نہ ہو کہ شعر پہلے سے موزوں کئے گئے تھے۔ فتوحات اسلام میں جاہل عربوں کے فی البدیہہ اشعار کے دیکھنے سے ہم نے پورا ثبوت اس امر کا پایا لفظ بالکل دل و دماغ کی قوت یا زور طبیعت کے ماتحت ہے

## فصل نمبر ۶۶

### ترک حیوانات

قانون قدرت کا اقتضا ہے اور انتظام عالم یوں ہی رکھا گیا ہے کہ ایک مخلوق فنا ہو کر دوسری مخلوق پیدا ہوتی ہے ایک شے کی فنا پر دوسری شے کا منو ہوتا ہے ایک دوسرے کو کھا کر پلتا ہے۔ ایک کا تنزل دوسرے کی ترقی کا سبب ٹھہرتا ہے۔ انسان بھی ایک مخلوق ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں کسی دوسری شے کا فنا ہونا یا دوسرے جاندار کا نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اسکی انسانیت مقتضی ہے کہ دوسروں کی برائی میں اپنی سبھلائی سمجھے۔ ہاں حسن معاشرت کے لئے جو قاعدے مقرر ہیں انکی پابندی بس یہی ایک ابتدائی سمجھو یا انتہائی کمال یا صفت انسان کی ہے۔

مفصلہ بالا باتیں تمثیلاًوں سے بخوبی سمجھ میں آجائیں گی۔ زمین ایسی کمزور چیز بھی اپنے سے کم طاقت والوں پر شیر ہے جہاں کوئی شے سر طگل کر اور اس طرح اپنی قوت زائل کر کے زمین کے پیچھے میں پھنسی بس فوراً اجزائے ارضی اس طرح اپنی قوت بڑھانے اور اس کے ذروں کو کھینچنے لگتے ہیں۔ جیسے چونک آدمی کا خون چوستی ہے۔ تھوڑے دنوں میں وہ شے غائب ہو گئی اور اس کی بدولت اجزائے ارضی کی قوت پیداوار بڑھ گئی۔ سو کبھی زمین میں سوکھا دانا ڈال دو تو زمین خود اپنی بالیدگی کی فکر میں ہوگی دانے کی کچھ دال نہ گلے گی۔ لیکن وہی دانا پانی کی مدد پا کر جب زمین پر غالب آتا ہے تو زمین کے تمام عمدہ ذرے جذب کرنے لگتا ہے۔ بیسیوں فٹ نیچے کا خزانہ نکال کر گزروں اوپر لے جاتا ہے بیچاری زمین کو کمزور اور مفلس کر ڈالتا ہے بڑے بڑے درختوں کے پاس چھوٹے چھوٹے درخت نشوونما نہیں پاتے اسکی وجہ کھلی ہوئی ہے۔ شیر کے سامنے گیدڑ کو حرات نہیں ہوتی کہ شکار کرے زمین کے ذرے بڑے درخت کی کشش سے بچنے نہیں پاتے۔ چھوٹے درخت کو منو ہو تو کس چیز سے۔ بعض بعض درختوں کی ہڈیاں آسمان



سے باتیں کرتی ہیں لیکن تحرک بالارادہ کی قوت ہی دوسری ہے۔ ادنیٰ بھنگا اور چھوٹے چھوٹے کیرے اس خصوص میں درختوں سے زبردست ہیں۔ جن پتیوں کو درخت ہزارشکلی سے برسوں کی محنت میں تخت السری سے نکال کر اپنی زیبائش کی غرض سے باہر لا کر اپنا ساز و برگ درست کرتا ہے کیرے کوڑے ہیں کہ بے دریغ پتیوں کی صفائی میں مشغول ہیں۔ اچھے فاصحے درخت کو دوچار گھنٹے میں برہنہ اور بے سروسامان کر دیا اور کہیں ٹڈیوں سے پالا پڑا تو گھنٹہ بھی پورا نہیں ہونے پاتا۔ آفتاب سے جو نسبت شبنم کو ہے وہی نسبت ٹڈیوں کو سبزہ زار سے ہے۔ کہیں ایسی حالت میں کوئی مینا قریب آ بیٹھے جب سیر دیکھیے جن حضرات کے دانت بیچارے درخت کے پتوں پر آ رہے سے بھی زیادہ تیز تھے وہ بے تکلف بی مینا کے پیٹ میں بہ یک بینی و دو گوش گھستے اور ہضم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بلی نے اس موقع کو دیکھ پایا اور وہ بے پاؤں قریب پہنچ کر جھپٹی تو مینا کی گردن اس کے منہ میں ہے۔ پھر کیا تھا اسکی عید ہے۔ مینا ہتیرا پر پھڑ پھڑاتی ہے لیکن بلی کو کچھ پروا نہیں وہ مطمئن ہے کہ بازو جھاڑنے سے گردن چھٹ نہیں سکتی۔ بلی کا پیٹ جو بھرا تو آپ میدان کی طرف کھانا ہضم کرنے کی غرض سے خرماں خرماں چہل قدمی کو نکلیں۔ سامنے سے ایک کتا کئی دن کا بھوکا تاؤ زدہ چلا آتا تھا۔ آنکھیں جا رہی تھیں کہ بلی بھاگی اور کلب بیگ پیچھے لگے۔ دوڑے۔ سو پچاس قدموں کے بعد بلی اسی طرح کتے کے منہ میں ہے جس طرح ابھی آدھو گھنٹہ پہلے مینا کی گردن بلی کے منہ میں تھی۔ اب ناظرین منتظر ہونگے کہ کتا کسی شیر کے منہ میں نظر آئے گا۔ لیکن تجربہ ایسا نہیں بتاتا۔ زبردست کمزور کو کھاتا ہے نہ کہ برابر والے کو۔ اسی لئے ایک شکاری جانور دوسرے کسی شکاری جانور کا گوشت نہ کھائے گا۔ بلی کو گوشت نے پکڑ لیا اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ اسے کھا بھی لے گا اس کا صرف یہ کام ہے کہ وہ بلی کو مار کر اجڑے اراضی کی بالیدگی کے لئے چھوڑ دے یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ زبردست شکاری جانور کے لئے اپنے سے کمزور شکاری جانور کا کھانا محال ہے۔ ممکن ہے کہ بھوک کی بیباکی اپنا زور بھی دکھلائے لیکن یہ تو مسلم ہے کہ کمزور شکاری جانور اپنے سے زبردست شکاری جانور کے گوشت سے نفرت یا خوف کھاتا ہے۔ ہم نے ایک معزز شخص سے سنا کہ ایک مرتبہ شیر کا گوشت اس نے طاق پر رکھ دیا تھا بلی نے اسے کھانے کے لئے گرایا لیکن پھر اسکی بو سے محوف یا متنفر ہو کر بھاگ گئی۔

مفصلہ بالابالتوں سے ایک سرسری طور پر انتظام عالم کا نقشہ دکھانا تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھانا تھا کہ زبردست کمزور کے مقابلہ میں جائز طور پر اپنی خود غرضی کا پیش کرنا کوئی مضائقہ



نہیں رکھتا۔ اب جو کچھ گفتگو ہے وہ جائز و ناجائز کی تفریح میں ہے۔ میری سمجھ میں جائز اور ناجائز کو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ کھیت میں دانا پڑا۔ درخت اگا۔ پھل لگا اور پکا۔ اگر انسان پھلوں کو توڑ کر کھا جائے تو کچھ بیجا نہیں اگر پھل سڑ کر گر جائیں تو افسوس ہوگا۔ جو شے پیدا ہوئی اس کو ایک دن فنا ہونا ہے۔ اگر آدمی پھلوں کو نہ کھائے اور نہ کسی جاندار کو کھانے دے تو ایک نہ ایک دن وہ ضرور سڑ گریں گے۔ فرض کر دو کہ پھلوں میں روح ہے اور ایک نہ ایک قسم کی جان تو تمام چیزوں میں مانی ہی پڑتی ہے ہندی میں اسے انس کہتے ہیں۔ ہر شے کی ہیئت مجموعی جس حیثیت سے قائم ہو وہی اسکی جان ہے اب پھلوں کو کھاتے وقت یہ سمجھنا کہ پھلوں کو دکھ ہوتا ہے کتنی نادانی ہے۔ اگر پھلوں میں انسان کی سی روح ہوتی تو سڑ گل کر گر جانا آدمیوں کے کھا جانے سے انھیں کہیں سخت گزرتا۔ انسان اگر اپنے درختوں کے پھل ہر سال توڑ کر کھایا کرے تو وہ ظالم نہیں ہے ہاں اسوقت وہ ضرور ظالم کہا جائے گا جب درختوں کی شاخ کو وہ بلا ضرورت مروڑ ڈالے اور اس طرح درختوں کو بے کام کر دے۔ غرض کہ ہر شے کے پیدا ہونے کا عمدہ نتیجہ یہ ہے کہ وہ کسی عمدہ کام میں صرف ہو جائے یا اس کام میں لگ جائے جس کے لئے اس کا پیدا کیا جانا بظاہر سمجھا جاتا ہے۔ بکری کا بچہ آج ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ نہ ہے اس لئے دودھ کی امید نہیں اور نہ بکریوں کی کچھ گاؤں میں قلت ہے کہ نسل بڑھانے کے لئے اس کا زندہ رہنا مناسب متصور ہو۔ اب اس وقت دو صورتیں سامنے ہیں ایک تو یہ کہ وہ ذبح کیا جائے اور گاؤں والوں کا ذائقہ درست ہو اور دوسری یہ کہ بچوں ہی چھوڑ دیا جائے کہ عمر طبعی کو پہنچ کر اور بڑھاپے کی معیتیں جمیل کر اپنی جان دے۔ سوال یہ ہے کہ پہلی صورت پر عمل کرنا مقتضائے دانش ہے یا دوسری پر۔ اس حلوان کا نہ کھانا ویسا ہی فطرت (نیچر) کے ساتھ ظلم کرنا یا کفران نعمت کا مرتکب ہونا ہے جیسے باغ کے میووں کا نہ کھانا اور یہ گوارا کرنا کہ وہ سڑ کر زمین میں بلجائیں۔

اب یہاں تھوڑی سمجھ والے یہ اعتراض کریں گے کہ میووں میں روح نہیں ہوتی جانوروں میں روح ہے اور اس لئے ان کو تکلیف دینا سقاوت ہے۔ اول تو ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ نباتات میں روح نہیں ہے۔ ہم نے جو تعریفنا روح کی اس مضمون کے اغراض کے لئے اختیار کی ہے وہ نباتات میں ضرور پائی جاتی ہے اور پھر فرض کر لیجئے کہ پھل کو ٹوٹنے میں وہ تکلیف نہیں ہوتی جو جانوروں کو ذبح ہونے میں ہوتی ہے۔ ہم یہ کہیں گے کہ اپنی موت سے مرنا ہر حالت میں مرگت مفاعلات رفوری ہلاکت سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ اور اس طرح جانوروں کو ذبح کر کے



کھا جانا اس معنی سے بھی ان پر احسان کرنا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ سچرا اس اعتبار سے تو قاتل مقتول کا محسن ہے؟ ہم اس کے جواب میں کہیں گے بے شک محسن ہے۔ ایک دن سب کو مرنا ہے ایریاں ریگڑ کر مرنے سے یہ کہیں اچھا ہے کہ تلوار یا گولی سے دو منٹ میں خاتمہ ہو جائے لیکن یہ احسان صرف مقتول پر ہوتا ہے۔ مقتول کے اعزہ۔ نیچر۔ سوسائٹی اور گورنمنٹ پر ظلم ہوتا ہے اور اس لئے ناجائز سمجھا گیا۔ نیچر پر ظلم ہونا کسی قدر محتاج تشریح ہے۔ انسان کو عقل انسانی کا ایک ایسا جوہر دیا گیا ہے کہ جس نے دوسری مخلوقات سے انسان کو ممیز اور با شرف کر رکھا ہے۔ انسان کی عقل کے متعلق بہت سی خدمتیں کی گئی ہیں دوسرے مخلوقی عالم کی ترتیب و آراستگی بھی ایک کام عقل انسانی کا ہے عقل انسانی کی پختگی کے لئے تجربہ درکار ہے اور تجربہ چاہتا ہے عمر کی درازی اس لئے کسی کو اسکی عمر طبعی کے پہلے ہلاک کرنا عام مخلوقات کے ساتھ ضمناً ظلم کرنا ہے۔ لیکن با ایں ہمہ جو شخص اچھے کام کی کوشش میں یا اصلاح مخلوقات کی سعی میں اپنی جان دیتا ہے تو تمام مذاہب میں سمجھا جاتا ہے کہ اس کا خاتمہ سب سے اچھا ہوا کیوں؟ بس اسی لئے کہ مرنا برحق ہے۔ ایک دن تو وہ مرتا ہی۔ اب جو اچھا کام کرنے یا آراستگی انتظام عالم میں اس کی جان نکلی تو اس نے مرتے دم تک گویا نیچر کے فرائض کو پورے طور پر ادا کیا اسی طرح سمجھو کہ بکرے کو ایک دن مرنا تھا ہی لیکن اس طرح اس کا مرنا کہ اشرف المخلوقات کی جسمانی اور عقلی قوت بڑھانے میں اس سے مدد پہنچی۔ ذی عقل کے نزدیک ضرور مستحسن خیال کیا جائے گا اور یہ سمجھا جائے گا کہ اس جانور کے لئے عمدہ سے عمدہ غایت جو خیال نہیں آسکتی ہے اس تک یہ پہنچ گیا۔

ہماری پھلی تحریر سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ بکری (مادہ) یا کیاب بکرے (نر) کا گوشت ممنوع ہے۔ کیونکہ انکی زندگی ان کے گوشت سے زیادہ نفع بخش ہے۔ بعض قومیں ایسا ہی سمجھتی بھی ہیں۔ لیکن فی الواقع ایسا نہیں ہے۔ جو لوگ ان کے گوشت کھانے کا فتویٰ دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ان جزئیات پر نظر قانون عام کے خلاف ہے موقع اور مقام کے اعتبار سے اپنی مصلحتوں کا سوچنا ہر ایک کی اختیار ہے تمیز پر محدود ہونا چاہیے۔ ملکی یا ربانی قانون کے ساتھ جزوی اختصاص نامناسب ہے۔

مفصلہ بالا تقریر اس امر کے ثابت کرنے کو کافی ہے کہ گوشت کا کھانا کسی طرح عیب یا بیرحمی میں داخل نہیں ہے۔ تاریخ سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ مچھلی گوشت دودھ اور شہد جنگلی میوے یہی سب ابتدائی غذائیں تھیں موجودہ حالت پر اگر نظر ڈالی جائے تو دنیا میں اس وقت بہت کم لوگ



ایسے نکلیں گے جو گوشت کھانا عادتاً یا مذہباً برا جانتے ہوں۔

فیثاغورس اور اس کے تلامذہ ترک حیوانات کو بڑا ثواب جانتے تھے شاید قدیم مصری بھی اسی خیال کے تھے۔ لیکن اس فرقہ نے زیادہ ترقی نہ کی۔ ہندوستان میں گوبودھ بھی حیوانات کا کھانا پسند نہ کرتا تھا لیکن اس کے نیم معتقد چین والے چوہا اور بلی تک کھا جاتے تھے۔ بودھ مذہب کے پیرو جو ہندوستان میں چین کھلتے ہیں وہ البتہ اس خصوص میں اپنے مرشد کے قدم بہ قدم چلتے ہیں مگر تعداد میں وہ اتنے کم ہیں کہ کسی شمار میں نہیں۔ دو چار پنتھ فیروں کے بھی ایسے ہیں جن کے متبع ترک حیوانات کے پابند ہیں۔ مسلمانوں میں بھی بعض درویش گوشت کا کھانا چھوڑ دیتے ہیں اس پر جب ان کے مولوی کہتے ہیں کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کا حرام ٹھہرانا اور اپنے کو خدا سے زیادہ رحیم یا حکمت والا سمجھنا انھیں قطعی کے بالکل خلاف ہے تو ان بیچاروں کو یہی کہتے بتاتے ہیں کہ ہم گوشت کو حرام نہیں سمجھتے بلکہ

بہ تمنائے گوشت مردن بہ از تقاضائے زشت قصاباں

پر عمل کرتے ہیں خود رائی کا الزام ہم پر نہیں ہو سکتا یہ ناداری کا نباہ ہے۔

غرض کہ دنیا کے ہر حصہ میں گوشت کھانے کا رواج انسان میں جاری ہے۔ ان میں بعض قومیں تو ایسی ہیں کہ نباتات کی طرح تمام حیوانات کا گوشت کھا سکتی ہیں اور بعض شرطیں لگاتی ہیں کثیف اور بے چارے جانوروں کا گوشت اس لئے حرام سمجھتی ہیں کہ کہیں یہ عادتیں گوشت کے ذریعہ سے کھانے والوں میں بھی سرایت نہ کر جائیں گوشت کے نہ کھانے والے ایک حجت یہ بھی پیش کرتے ہیں کہ گوشت جو بدن ہوتا ہے اور اس لئے گوشت کھانے والوں میں حیوانوں کی خاصیت زیادہ اثر کر جاتی ہے۔ یہ کہنا ایک حد تک درست ہے اور اسی خیال سے حلال اور حرام جانوروں کی فہرست قائم کی گئی ہے۔ اس فہرست پر زیادہ سختی کے ساتھ مسلمان عمل کرتے ہیں۔ سور۔ کتا۔ بلی۔ گیدڑ۔ شیر۔ ہاتھی۔ چوہا۔ سانپ۔ کیڑا مکوڑا۔ باز بھری۔ گدھ۔ طوطا وغیرہ وغیرہ بہت سے چرند و پرند ایسے ہیں جنکو اہل اسلام نہیں کھاتے بعض قومیں ایسی ہیں کہ وہ سور بھی کھاتی ہیں۔ جاپانی چینی اور چند وحشی قومیں ایسی ہیں کہ کتا بلی چوہا بھی نہیں چھوڑتے انصاف شرط ہے گوشت کھانے میں جو اعتدال مسلمان برتتے ہیں دنیا کی کسی قوم میں یہ بات نہیں ہے ہندو بھی اس خصوص میں مسلمانوں کے ہم پلہ ہیں بلکہ انکی احتیاط کسی قدر سے متجاوز ہے اس وقت ہم یہ کہنے کو تیار نہیں ہیں کہ مسلمانوں کی صحبت نے ہندوؤں پر یہ اثر ڈالا یا خود ان کی



تہذیب کا یہ اقتضا ہے۔ بہر حال یہ مسلم ہے کہ اس خصوص میں اہل اسلام اور ہندو زیادہ تر معتدل طریقے پر چلتے ہیں۔ خیر الامور اور وسطیانہ تو یہ گوشت کا کھانا حرام سمجھتے ہیں اور نہ آنکھ بند کر کے کیرٹا مکوڑا سب ہی کچھ کھانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ گوشت کھانے والوں پر بڑا بھاری الزام سقاوت کا لگایا جاتا ہے جس کو تصریح کے ساتھ ہم نے اوپر سمجھا دیا اور اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ گوشت جو اپنی نوعیت میں بنی نوع انسان کے لئے کسی طور پر مضر یا خلافت مصلحت ہے اس کو خود شارع نے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ اب رہا یہ امر کہ گوشت انسان کی خوراک نہیں ہے اس سے خون صالح پیدا نہیں ہوتا اسکی حدت نقصان کرتی ہے۔ یہ علم طب کی بحث ہے ترکیاری اور مصالحہ کا گوشت میں ملانا انھیں امور پر نظر ڈال کر راسخ ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ کوئی پہلو اس میں مفرت کا نہ ہو۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حال کی تحقیقات میں ڈاکٹروں نے یہ ثابت کیا ہے کہ انسان کا دانت گوشت کھانے کے لئے نہیں بنا ہے۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ کچا گوشت کھانے کے لئے انسان کا دانت نہیں بنا ہے۔ یہ کون کہتا ہے کہ شیروں کی طرح انسان کو بھی صرف گوشت اور کچا گوشت کھانا چاہیے۔

خلاصہ یوں سمجھنا چاہیے کہ جن لوگوں کو ترک دنیا کر کے گوشہ نشینی نہیں کرنی ہے۔ بلکہ قوت بازو سے کام کرنا ہے۔ ہاتھ۔ پیر۔ دماغ۔ قلب اور جسم میں وہ زور چاہتے ہیں ہمت اور مستعدی سے ان کو کام کرنا ہے، وہ گوشت بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتے۔

اب اس بارے میں اسلام کا بہ اعتدال قابل لحاظ ہے۔ چینیوں کے نزدیک سوائے انسان کے ہر جاندار کا گوشت کھانے کے قابل ہے۔ ہندوؤں میں جو مذہبی گروہ کے لوگ ہیں وہ گوشت بالکل نہیں کھاتے اور جو کھاتے ہیں وہ بے وجہ محقول بہت سے جانوروں کا گوشت حرام سمجھتے ہیں۔ اس زمانے کی مہذب قومیں ان دونوں درجوں کے وسط میں ہیں۔ اور ان مہذب قوموں میں بھی وہ اعتدال ملحوظ نہیں ہوتا جو اسلام تعلیم کرتا ہے۔



# فصل نمبر ۶

## زمزم

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پیغمبر نے اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسمعیلؑ کو مکہ کی زمین غیر ذی ذرع میں چھوڑا تو وہاں کسی قسم کی آبادی نہ تھی اور نہ پینے کو پانی اور نہ رہنے کو کوئی گھر تھا۔ خانہ کعبہ کی نسبت مسلمان مورخوں نے لکھا ہے کہ حضرت آدم کے وقت میں اسکی تعمیر ہوئی تھی اور مسلمانوں کے نزدیک یہ دنیا میں پہلا گھر تھا لیکن جس وقت کا حال ہم لکھ رہے ہیں اس وقت یہ مکان بالکل منہدم تھا کسی قسم کی مکانیت نہ تھی۔ وہاں کی زمین کسی قدر اونچی تھی جس سے یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ یہاں پر کسی زمانے میں عمارت تھی۔ دانے اور پانی کا ذخیرہ جب ختم ہوا تو ہاجرہ کو فکر ہوئی۔ رزاق مطلق کی قدرت کا نمونہ یہ دیکھنے میں آیا کہ ایک چشمہ وہیں جاری ہوا یہ چشمہ تھوڑے دنوں کے بعد زمانے کے تصرف یا انسانی صنعت کی بدولت کنوئیں کی صورت میں آگیا اور اب چاہ زم زم کے نام سے مشہور ہے۔

عرب میں پانی کی بڑی قلت تھی اور اب بھی ہے کنوئیں یا چشمہ کا ہونا آبادی کے لئے پہلے زمانے میں ایک بہت بڑی تحریک تھی اور اب بھی کم و بیش ایسا ہی ہے قدیم عرب کے ایک خانہ بدوش گروہ بنو جرہم نے اس چشمہ کے پاس آباد ہونا چاہا۔ حضرت ہاجرہ نے نہایت خوشی سے ان مہمانوں کی آؤ بھگت کی اور مہمانوں نے نہایت احسان مندی سے وہاں سکونت اختیار کی اس اشار میں حضرت ابراہیمؑ کی آمد و رفت بھی جاری رہی اور عبادت الہی کے لئے ایک گھر کی تعمیر کھولنے نے حضرت اسمعیلؑ کی مدد سے کی جو آج تک کسی قدر ترمیم اور تبدیلی کے ساتھ قائم ہے خانہ کعبہ نام ہے اور تمام دنیا کے مسلمانوں کا مرجع ہے۔

قبیلہ بنو جرہم میں ایک شخص مداد تھا جسکی لڑکی سے حضرت اسمعیلؑ کا عقد ہوا اور اس طرح جو نسل حضرت اسمعیلؑ کی پھیلی جس میں غالباً اسمعیلؑ کی بیویوں کی اولاد بھی شامل ہے وہ طحرب کہلاتا اور آج کل عرب کی غالب آبادی انھیں لوگوں سے ہے۔ قریش اور پیغمبرؐ آخر الزماں بھی اسی نسل سے ہیں۔

ایک زمانہ بنو اسمعیلؑ پر ایسا آیا کہ بنو جرہم نے ان کو خانہ کعبہ سے بیدخل کر دیا اور وہ لوگ



عرصہ تک باہر باہر گھومتے رہے۔ صدیوں کے بعد بنو جرہم کی حالت کثرت فسق و فجور سے بہت کمزور ہو گئی اور اس طرح بنو اسمعیل کو پھر خانہ کعبہ پر قابض ہونے کا موقع ہاتھ آیا۔ بنو جرہم جب مکہ سے بھاگنے لگے تو خانہ کعبہ کے قیمتی اسباب گچاہ زمزم میں ڈال دیا اور اوپر سے پتھر بھر دیئے اور اس طرح گچاہ زمزم صدیوں تک معدوم رہا۔ پیغمبر آخر الزماں کے دادا عبدالمطلب نے اس کنوئیں کو بڑی محنت سے کھدوایا اور قدیم زمانے کی طرح لوگ پھر اسکے پانی سے مستفید ہونے لگے۔

اسلام سے قبل گچاہ زم زم کو لوگ مذہبی خیال سے نہیں دیکھتے تھے اور نہ اسلام پھیلنے کے بعد ہجرت مدینہ تک کوئی خیال مسلمانوں میں گچاہ زمزم کی عظمت کا قائم ہوا۔ ہر جگہ اچھے کنوئیں کی طرف گاؤں والوں کا خیال عموماً رجوع ہوتا ہے۔ بس وہی حالت گچاہ زمزم کی تھی۔ لیکن ہندوستان کی حالت پر قیاس نہ کرنا چاہیے۔ جہاں پانی آسانی سے دستیاب ہونے کی وجہ سے کوئی بڑی نعمت نہیں سمجھا جاتا۔

کفار مکہ نے جب مسلمانوں کو بہت تنگ کیا تو وہ گھبرا کر بھاگ کر مدینہ کی طرف پھلے گئے وہاں کی آب و ہوا بہ نسبت مکہ کے بہت زیادہ مرطوب تھی۔ سفر کی تکلیف و ظن چھوٹنے کا غم بے سرو سامانی کی حالت افلاس کی مصیبت تو تھی ہی آب و ہوا کی ناموافقیت سب پر بالائے۔ چند مہینوں کے بعد مہاجر مسلمانوں میں جاڑے بخار کی بیماری پھیلی۔ شدت بخار میں جب یہ نیربان بکتے تھے تو خانہ کعبہ۔ گچاہ زمزم اور مکہ کے مشہور مقامات کا نام لیتے تھے۔ چونکہ بیماری زیادہ تر پانی کی ناموافقیت سے تھی اس لئے وہ لوگ مکہ کے پانی یعنی گچاہ زمزم کو اس طرح یاد کرتے تھے جس طرح عشاق شب ہجران میں معشوق کو یاد کرتے ہیں۔ مکہ والوں کو جنکی سبب سے گچاہ زمزم چھوٹا تھا اس طرح کوستے تھے جس طرح شب فراق میں رقیبوں کو گالیاں دینا عشاق کی زبان سے ایشیائی شعرا باندھتے ہیں۔ بیماری کی حالت تو تھوڑے دنوں تک رہی لیکن مہاجروں کے دل میں یہ خیال برابر جا رہا کہ زمزم سے اچھا پانی دنیا میں نہیں ہو سکتا۔ ہاں غم ہے تو وہ ہے مقوی ہے تو وہ ہے مردوں کے لئے گچاہ زمزم سے اچھا پانی ہفت اقلیم میں پیدا نہیں ہے۔ جس طرح قریش باشندگان مکہ اپنے کو تمام دنیا سے افضل سمجھتے تھے اسی طرح مکہ کی ہوا اور گچاہ زمزم کے پانی کو بھی وہ تمام دنیا سے اچھا جانتے تھے۔ حب الوطنی بھی ایک سبب تھی۔ لیکن اس میں کلام نہیں ہو سکتا کہ جن اوصاف کو قریش پسند کرتے تھے وہ اعلیٰ درجہ پر مکہ ہی کی آب و ہوا سے مخلوق ہو سکتا تھا۔ آٹھ دس برس تک مہاجروں کو مکہ میں آنا نصیب نہیں ہوا اور اس زمانے میں گچاہ زمزم اور



سواد مکہ کے دیدار کے وہ بہت مشتاق تھے۔ فراق میں گیت بنائے گئے تھے۔ قصیدے لکھے گئے تھے۔ مرثیے لکھے گئے تھے۔ غرض کہ اپنے ذوق شوق کو ان لوگوں نے مختلف طریقے سے ظاہر کیا تھا۔

ناظرین خود اس خوشی کا اندازہ کر سکتے ہیں جو فتح مکہ کے بعد ہاجروں کو مکہ میں آنے سے حاصل ہوئی۔ کنوئیں کے گرد مسلمان کودتے تھے اچھلتے تھے۔ خوشی کے لغز بند کرتے تھے۔ بے پیاس بھی پانی پیتے تھے ہاتھ منہ دھوئے تھے۔ آنکھوں میں پانی ملنے لگتا تھا بجائے تیل کے سر میں لگاتے تھے۔ یہ زمانہ چند ہفتوں میں گزر گیا۔ مسلمانوں کو پھر چاہ زم زم چھوڑنا پڑا۔ جہاں تک ہو سکا انہوں نے چھا گلیں بھر لیں اور پھر حسرت سے چاہ زم زم چھوڑ کر مدینہ کا راستہ لیا۔ مدینہ میں پہنچ کر زم زم کا اشتیاق پھر دلوں میں موجزن ہوا اور حسرت و یاس نے چاروں طرف سے گھیرا غھوڑے ہی دلوں کے بعد پندرہ بیس برس کے اندر اندر یعنی ہجرت کے تیس تیس برس پورے ہونے سے قبل ہاجر مشرق میں افغانستان تک مغرب میں افریقہ کے شرقی و غربی سواحل تک۔ شمال میں بحرِ کسپین سی، آرمینیا۔ سرحدِ قسطنطنیہ، ترکستان تک پہنچ گئے۔ مدینہ سے تو غیر چند دنوں کا راستہ تھا۔ اب وہ اتنی دور پہنچ گئے کہ مہینوں کا سفر کریں تو مکہ میں پہنچنا نصیب ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ مکہ کی سی گرم خشک اور لطیف آب و ہوا ان مقامات مفتوحہ میں سے کسی کی نہ تھی۔ سواد مکہ اور چاہ زم زم کا شوق ان پہلوؤں کے ساتھ ہفت اقلیم تک پھرا یہ خود تو مشتاق تھے ہی۔ کہنے سننے سے انکے بچے، بیویاں انکے پڑوسی ان کے اجاب بھی چاہ زم زم کے مشتاق تھے۔

بسا کین دولت از گفتار خیزد

نہ تمنا عشق از دیدار خیزد

حج کعبہ کے فرض ہونے نے اور بھی سواد مکہ، خانہ کعبہ، جبل عرفات، مقام منا، صفا و مروا اور چاہ زم زم کا لوگوں کو شائق بنایا۔ خود تو ہاجر ہاتی نہ رہے اور نہ ان کے ملنے والے زندہ رہے لیکن جو شوق کہ دلوں میں یاروں نے مذہبی خیال کے ساتھ مل جل کر پیدا کیا تھا اس کو روز بروز ترقی ہی ہوتی رہی۔ غرض کہ انہیں سب خیالات نے مل جل کر وہ نتیجہ پیدا کیا جو فی زمانہ دیکھنے میں آتا ہے۔ یعنی حج کرنے والے مسافر خاک، خلافت کعبہ کا ٹکڑا، سرے کے پتھر، چاہ زم زم کا پانی تبرک لاتے ہیں اور لوگ نہایت خلوص نیت اور مذہبی دل سے ان چیزوں کو چومتے ہیں اور آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ مرتے وقت چاہ زم زم کا پانی موجود ہو تو مرنے والے کے حلق میں پھلتے



ہیں۔ مرتے وقت کہیں کہیں کفن پر بھی چھڑک دیتے ہیں یا غسل کے بعد جسم پر ڈالتے ہیں۔ جتنے  
 برکات مکہ سے حاجیوں کے ساتھ آتے ہیں ان میں آب زمزم سب سے زیادہ متبرک سمجھا جاتا ہے۔  
 یہ ایک تاریخی حالت بیان کی گئی تاکہ معلوم ہو کہ آپ زمزم کی عظمت مسلمانوں میں کیونکر  
 قائم ہوئی۔ بعض لوگ پیغمبر کے ان اقوال سے استدلال کرتے ہیں جو چاہ زمزم کی خوبیوں میں بیان کئے گئے  
 تھے۔ لیکن ہمارے نزدیک ان اقوال کے تذکرہ کی چندان ضرورت نہیں ہے۔ مختصر طور پر سمجھ لینا  
 چاہیے کہ جس طرح مجنوں کو لگ لگی لیلیٰ عزیز تھا اسی طرح مکہ اور مدینہ کی تمام چیزیں مسلمانوں کے  
 نزدیک پیاری ہیں۔ خوبیوں کے لئے حدیث کے نقل کرنے کی ضرورت اس لئے بھی نہیں ہے کہ شہد  
 شہد کی خوبی خود قرآن میں مذکور ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بمقابلہ چاہ زمزم کے شہد کی بھی کچھ  
 عظمت لگ رہی ہے۔ اس میں مٹھاس نہ ہوتی تو شاید لگتا۔ کوئی جانتا بھی نہیں ہے۔ اس مٹھاس پر  
 بھی ہندوستان میں قند اور مہرئی کے سلسلے سے کوئی نہیں پوچھتا اور کوئی پوچھتا بھی ہے تو نص  
 قرآنی کی سفارش پر نہیں بلکہ اطباء کی تشہیر پر ایسے عالم جو ان کے ذریعے سے شہد کو شفا را مرض  
 سمجھ کر اس کا استعمال کریں اور یہ عقیدہ رکھیں کہ اس میں کوئی ضرر نہیں ہے بہت کم ہیں۔ اور انہیں  
 قرآن کا منشا بھی یہ نہیں ہے کہ شہد کو لوگ بدمذہب امراض میں رد اور استعمال کریں بلکہ شہد کے  
 فوائد اور لذات کو یاد دلا کر خدا کی قدرت کا بندوں پر ظاہر کرنا مقصد اصلی ہے۔ اسی قبیل میں وہ  
 حدیثیں بھی ہونگی جو چاہ زمزم کے متعلق لوگ ذکر کرتے ہیں۔

ان جملہ امور کے ظاہر کرنے سے ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ چاہ زمزم کی وقعت مسلمانوں  
 کے دل میں کہاں تک مناسب یا غیر مناسب طور پر چھی ہوئی ہے۔ بلکہ ہم کو صرف یہ بتانا ہے کہ  
 اب عام مسلمانوں کے خیال میں چاہ زمزم کی وقعت اور عظمت ایک مذہبی اثر رکھتی ہے اور  
 اس کی توہین کرنا گویا مسلمانوں کا دل دکھانا ہے۔ غلطی پر ہیں وہ انگریزی اخبار جو چاہ زمزم کی  
 برائیوں کے بیان کرنے میں یہ نہیں سوچتے کہ مسلمانوں کو اس کے منہ سے صدمہ ہوتا ہے۔ ممکن ہے  
 کہ بعض مسلمانوں پر اس کا اثر نہ پڑے۔ لیکن چونکہ عوام تعداد میں زیادہ ہیں اور "لاکڑ حکم الکحل"  
 کے اعتبار سے عام مسلمانوں کے مصداق بھی وہی ہیں ہم یہ کہتے ہیں کہ آب زمزم کی برائی کجائے  
 اور مسلمان اسے سن کر خوش ہوں یہ غیر ممکن ہے۔

زمزم کی برائی کی ہر طرف خیالات اس وقت سے پھرتے ہیں جب سے وہائی امراض کی کثرت مکہ  
 میں ہونے لگی ہے چونکہ ان حاجیوں کی بدولت اور ممالک میں بھی مہینہ پھیلتا ہے اس لئے



یورپ کے ڈاکٹروں نے تمام تر توجہ اس کے اسباب دریافت کرنے کی طرف منطقت کی ہے گرم ملک ہے اور گرم ملک میں دہائی مرض زیادہ پھیلتا ہے۔ جہاں زیادہ لوگ جمع ہوں اور صفائی کا بندوبست عمدہ نہ کیا جائے تو مرض زیادہ پھیل سکتا ہے۔ یہ سب وجوہ معقول ہیں۔ جہاں تک صفائی کا تعلق ہے مسلمانوں کو منتظموں۔ انتظام کی تحریک پیش کرنے والوں یا ایسی خواہش ظاہر کرنے والوں کا شکوہ ہونا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ بعض ڈاکٹروں کا یہ قول ہے کہ مکہ کی ہوا لطیف نہیں ہے بلکہ وبا پیدا کرنے میں اس کو خاص دخل ہے۔ یا یہ کہ چاہ زمزم کے پانی میں کوئی خاص نقص ہے۔ گندہ پانی کنوئیں کے اندر سوتوں سے پہنچتا ہے اور اس طرح عام طور پر پانی کو خراب کر دیتا ہے۔ یہ رائے ان لوگوں کے نزدیک قابل مضحکہ ہے جو مکہ کی زمین چاہ زمزم کے موقع اور وہاں کی ہوا کی لطافت سے واقف ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دہائے کے اسباب کیا ہیں۔ جہاں تک غور کیا گیا ہے کوئی سبب ظاہر نہیں ہوا۔ کیونکہ سبب ظاہر ہونے کے بعد ازالہ سبب مشکل نہ تھا اور پھر قطعی طور پر یہ کہا جاسکتا تھا کہ وبا کار و کنا انسانی کوشش کے اندر داخل ہے لیکن جب تمام ڈاکٹر اس خصوص میں اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہیں تو ہم سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ اسباب دریافت کرنے میں انکی رائے قاصر ہیں۔ صفائی کی طرف ازالہ مرض میں زیادہ تر ڈاکٹروں کو توجہ ہوتی ہے اور صفائی خود بذاتہ ایک عمدہ چیز ہے اس لئے طبیعتیں بے دلیل اسے مان لیتی ہیں ان ایام میں صفائی بہت ضروری ہے اور صفائی کے ہونے سے ایک گونہ تسکین خاطر بھی ہوتی ہے۔ لیکن یہ کبھی یاد رکھنا چاہیے کہ گندگی اصلی سبب مرض پھیلنے کا نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو بیماری پھیلنے پر بھنگیوں کی موت کا اوسط زیادہ ہوتا اور بھنگی گندگی صاف کرنے کیلئے اور دھو بی کپڑا دھونے کے لئے میسر نہ آتے

مکہ میں قربانی کی وجہ سے اگر گندگی پھیلنے کا خیال قائم کیا جائے تو بادی النظر میں پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ جب اس امر پر غور کیا جائے کہ مکہ کی لطیف اور خشک ہوا خون کو سڑنے نہیں دیتی کثافت بھی دور پھینکی جاتی ہے۔ گندگی سڑنے کے بعد پیدا ہوگی اور سڑنے کیلئے کچھ وقت چاہیے۔ حاجی اس وقت کے آنے سے پہلے سواد مکہ چھوڑ دیتے ہیں تو پھر یہ مشکل کہا جاسکتا ہے کہ قربانی کو کچھ بھی تعلق ہیضہ پھیلنے سے ہے۔

زمزم کے پانی کی نسبت جو کچھ بیان ہے وہ اتنا پورچ اور لچر ہے کہ کہنے والے پر سمت حیرت ہوتی ہے۔ زمزم کا پانی اگر ہیضہ کا سبب ہوتا تو ایام حج سے پہلے بھی ہیضہ پھیلتا رہتا۔ اور ایام حج میں اس لئے کہ پانی زیادہ بھرت ہونے سے صاف ہو جاتا ہے پانی کی برائی کو مٹ جانا یا صاف ہو جانا



چاہیے۔ دوسرے یہ کہ جس پانی میں ہیضہ پیدا کرنے کی خاصیت ہے اسے تمام مکہ کے لوگ پیتے رہیں ہفت اقلیم کے مسلمانوں کے پاس ہزاروں میل کے فاصلے پر تبرک کے طور پر جائے۔ تمام دنیا اندھی کیرے کسی کو نظر نہ آئیں صرف یورپ کے چند ڈاکٹروں کو نظر آئیں یورپ کے ڈاکٹر سچے اور پانی بھی اچھا۔ درمیان میں زیادہ ایام گزرنے سے خود بخود کپڑوں کا پیدا ہو جانا یا طرف کی خاصیت سے پانی کا بگڑ جانا فرض کر لیا جائے استعمال ہے۔

کنوئیں کا موقع پہاڑی زمین اور کنوئیں کا امتیٰی دیکھنے کے بعد کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کنوئیں کے گرد گندہ پانی جمع ہو سکتا ہے اور اگر ایسا پانی جمع بھی ہو تو وہ کس طرح اندر جا سکتا ہے۔  
 زمزم کوئی چھوٹا سا کنواں نہیں ہے۔ بہت ہی عریض اور طویل ہے۔ پانی بھرنے والے مشروب ہیں۔ اس کے قریب کوئی نہانے نہیں پاتا۔ صفائی کا عمدہ انتظام رہتا ہے۔ دور تک سفر پر پتھر پٹی زمین ہے۔ کہیں سے یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ گندہ پانی سوتوں کی راہ سے اندر جا سکتا ہے۔ پانی بھرنے کے لئے چمڑے کے ڈول ہیں۔ مٹی کے گھڑوں سے پانی بھرا نہیں جاتا اور نہ ہر شخص پانی بھرنے کا جواز ہے اس لئے پانی بھرنے میں بیرونی گندگی کا اندر جانا قریب قریب نہیں ہے۔ ہندوستان کے کنوئیں کو عمارت کرنے کے لئے جتنا پانی نکالا جاتا ہے اتنا پانی وہاں روز نکلتا رہتا ہے اور ایام حج میں تو اس سے کہیں زائد نکلتا ہے۔ کنوئیں کی گہرائی غالباً سطح سمندر کے برابر ہے۔ وہ کنواں ایسا نہیں ہے کہ کوئی چیز اس میں گرے تو پتہ لگے یا کوئی چاکر اسے نکال لائے۔ وہ ایک قدرتی چشمہ ہے اور جس طرح چشمہ کے پانی کو گندہ نہیں کہہ سکتے اسی طرح آب زمزم کو بھی آلائشوں سے پاک و صاف سمجھنا چاہیے۔ قیاس تو یہ چاہتا ہے کہ چشمہ ایک طرف سے دوسری طرف کو چلا گیا ہے اور بیچ میں تقوڑا سا کھل گیا ہے جس کو چاہے زم زم کہتے ہیں لیکن اگر چاہے زمزم ہی چشمہ کی انتہا پانی جائے جب بھی پانی اس کثرت سے خرچ ہوتا ہے کہ آب زم زم کو چشمہ جاری کا آب رواں بے تکلف کہہ سکتے ہیں۔



## فصل نمبر ۶۸

جھاڑ، پھونک، دعا، تعویذ!

دعا، تعویذ، جھاڑ، پھونک یہ سب ڈھکوسلے اسلام میں نہیں تھے ہندوستان کے مسلمانوں نے ان معاملات میں ہندوؤں کی پیروی کی اور اسلام میں یہ باتیں بڑھالیں یا یوں کہیے کہ اسلام کی چادر پر یہ بد نما دھبے ڈال دیئے۔ اسلام جو ادھام باطلہ کے مٹانے کے لئے آیا تھا وہ ان باتوں کا مٹانے والا تھا نہ کہ رائج کرنے والا۔ ایام جاہلیت میں بچوں کو تعویذ پہناتے تھے سب سے معلق کا ایک مصرعہ ہے۔

فاہلیتہا من ذی تمام مملوئی

اس میں ذی تمام لڑکوں یعنی تعویذ پہننے والے بچوں کا تذکرہ ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ اسلام نے بھی کہیں اس خیال کی تائید کی ہے۔ مسلمانوں کو تعویذ گنڈے کا عاشق فالٹا اور حاضرات کا معتقد، جھاڑ پھونک کا دلدادہ دیکھ کر یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ ان کے اسلاف مابین کا بھی شیوہ تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مریضوں کو دیکھتے جاتے تھے تو ان کے سر پر دست شفقت پھیرتے تھے اور تسلی کے لئے فرماتے تھے "طوب انشاء اللہ تعالیٰ" یعنی اللہ چاہے گا تو تم صحیح ہو جاؤ گے (گھبراؤ نہیں) اور اکثر یہ بھی فرماتے تھے "اللہم اشفعہ لاشفاء الا شفاک" اے اللہ اس کو شفا دے کہ تیرے سوا کوئی دوسرا شفا دینے والا نہیں ہے۔ یہ کہنا گویا مریض کو تلقین کرنا تھا کہ تم خدا پر ہروسہ کرو اور ادھام باطلہ سے پرہیز کرو۔ آنحضرت کا یہ فرمانا ایسا ہی تھا جیسا کہ کوئی بزرگ شخص کسی کو مصیبت میں دیکھ کر ہائے ترحم تسکین دینے والے کلمات کہتا ہے اور عموماً اس مصیبت زدہ کے قلب اور طبیعت کو ایک قسم کی شگفتگی ہوتی ہے اور قوت پہنچتی ہے۔

اب اگر کوئی مریض کے سر ہانے کھڑا ہو کر "طوب انشاء اللہ" کہے یا اللہم اشفعہ لاشفاء الا شفاک پڑھے اور خیال کرے کہ یہ کلمات ازالہ مرض کے لئے اسلام میں موضوع ہوسے تھے تو یہ شارع اسلام کی پیروی نہیں ہے۔

حصہ حصین ایک حدیث کی کتاب ہے جس میں ہر قسم کی دعائیں حدیث شریف سے منتخب



کر کے ایک جگہ جمع کر دی گئی ہیں۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ ہر حالت اور ہر موقع پر ایک خاص قسم کی دعا پڑھتے تھے جس کو عام لوگ سمجھتے ہیں کہ جس وقت اور موقع کی وہ دعا ہے گویا اس وقت اور موقع کی بلا ٹالنے کے لئے ہے یعنی جو دعا جائے ضرور کوہلنے کے لئے آنحضرتؐ پڑھتے تھے اس دعا کا یہ اثر ہے کہ اس کے پڑھنے سے وہاں کی یہ بلا دور رہتی ہے یہ خیال شارع کے خیال سے بالکل دور ہے۔ ہرگز آنحضرتؐ کوئی دعا اس لئے نہیں پڑھتے تھے کہ اس دعا کے پڑھنے سے بھوت بریت سے بچنا مقصود ہوتا تھا۔ ہرگز ہرگز نہیں ایسی باتیں اسلام سے بہت دور ہیں۔ ان دعاؤں کی اصلیت یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے لوگوں کو یہ تعلیم دی تھی کہ خالق عالم کو کبھی سوتے جاگتے چلتے پھرتے بیکاری یا باکاری کی حالت میں نہ بھولو۔ ہر وقت اس کو یاد رکھو اور اسکی صنعتوں پر دھیان کرو۔ نماز تو پانچ وقت کے لئے مقرر ہے جو ایک طور پر فوجی قواعد ہے لیکن خدا کا ذکر ہر وقت کرو قرآن میں تاکید ہے کہ خدا کا ذکر کرو لیکن اس ذکر کے لئے کوئی خاص قاعدہ مقرر نہیں ہوا ہے دل سے۔ زبان سے۔ خیال سے کھڑے، بیٹھے لیٹے ہوئے جس طرح ممکن ہے اسے یاد کرو آنحضرتؐ نے نماز کے متعلق تو ضرور قاعدے بتائے کہ وہ ایک طور پر فوجی قواعد تھی لیکن ذکر کے لئے کوئی خاص قاعدہ نہیں بتایا ہر شخص کی رائے اور آسانی پر چھوڑا۔ لیکن خود اپنے لئے مناسب الفاظ مناسب مواقع کے لئے آپ نے جن لئے تھے۔ چنانچہ رات کو سوتے ہوئے جب کبھی آپ کی آنکھ کھل جاتی تھی اور آسمان نظر آتا تھا تو یہ آیت پڑھتے تھے: ان فی خلق السموات والارض واخلاق اللیل والنهار آیات لا ادنی الالباب الذین یدرون اللہ قیاماً و تعویداً و علی جہوہم ویتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت ہذا باطلا سبحانک قضا عذاب النار۔ ترجمہ: آسمان اور زمین کی خلقت میں اور رات اور دن کے اللہ پھیر میں ان عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں جو اللہ کو اٹھتے بیٹھے لیٹے ہوئے یاد کرتے ہیں اور خلقت آسمان و زمین میں غور کرتے ہیں کہ اسے رب تو نے اسکو بے فائدہ نہیں بنایا یعنی یہ عالم اسباب بڑی عنایت پر مبنی ہے، تو پاک ہے عذاب جہنم سے بچو بچا۔ اُدھی رات کو یہ کلمات آسمان کی طرف منہ کر کے کہے جائیں تو بے انتہا خلوص اور بید معرفت الہی پائی جائے گی۔ لیکن انھیں کلمات کو کوئی شخص رات کے سناٹے میں بلیات سے بچنے کے لئے پڑھے تو ظاہر ہے کہ کس درجہ شارع اسلام کے مقصود سے دوری ہو جائے گی۔

مرغ سحر جس کو مؤذن صبح سمجھنا چاہیے جب اپنی آواز سے لوگوں کو بیدار کرتا ہے تو اس کی اس خدمت کی قدر دانی یہی ہے کہ فوراً آنکھ ملنے ہوئے اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔ چنانچہ آنحضرتؐ



مرغ سحر کی آواز کو بہت معتنم سمجھتے تھے اور آواز سنتے ہی بجائے آنکھ ملنے کے زبان کو جنبش دیتے تھے اور فرماتے تھے: اللہم انے اسک من فضلک، اے اللہ ایسا ہی تیرا فضل میں برابر چاہتا ہوں کہ روز صبح کو اٹھ کر تیری یاد کروں۔ اب اگر کوئی یہ سمجھے کہ مرغ سحر کسی بلا کو دیکھ کر شور مچاتا تھا اور آنحضرتؐ رد بلا کے لئے دعار پڑھتے تھے تو ظاہر ہے کہ وہ اصل مقصد سے کتنا دور ہے۔ اس تحریر کا منشا یہ ہے کہ جو دعائیں ہیں وہ حکیم کے نسخوں کی طرح الگ الگ امراض کیلئے بنائی نہیں گئی تھیں ایسا بنا خدا کی قدرت میں ہے۔ خدا کی قدرت سے بحث نہیں ہے بحث یہ ہے کہ شارع نے دعاؤں کے یہ قاعدے بھی بتائے ہیں یا نہیں۔ رہا یہ امر کہ دعار کا رفع تکلیف کی غرض سے یا حاجت برامی کے لئے پڑھنے کا فائدہ ہے یا با فائدہ اس وقت موضوع اس بحث کا نہیں ہے۔

میرا عقیدہ یہ ہے کہ تمام دعاؤں سے مقصود اللہ کا ذکر ہے اور خضوع و خشوع سے اسکو پکارنا ہے۔ ورد میں حسب حال الفاظ کہنے سے خضوع اور خشوع میں مدد ملتی ہے اور شان عبودیت کا بخوبی اظہار ہوتا ہے جو تمام طاعات کی شرط ہے اتنا تو ظاہر ہے۔ اور اس سے بڑھ کر اگر یہ نیت ہو کہ خدا قانون قدرت کو توڑ کر حاجت روائی کر دے گا تو ایمان کے خلاف نہ ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ خدا قانون قدرت کے خلاف نہیں کرتا لیکن یہ سمجھنا کہ وہ کرنا چاہے جب بھی نہیں کر سکتا سخت بے ادبی ہے۔ بلکہ کفر ہے۔ جس خدا نے قانون قدرت بنایا ہے وہ اسکو توڑ بھی سکتا ہے پنکھے کی ڈر کو جو اندھا بیٹھا ہوا کھینچتا ہے اس کے اختیار میں تو اتنا ہے کہ اسے چھوڑ دے تو ہوا رک جائے اور خالق عالم باوجود خالق ہونے کے یہ قدرت نہ رکھے کہ خلقت عالم کے کسی میں قاعدہ کو مٹائے تو وہ خالق عالم کا ہے کو ہے خالق عالم کا مزدور بھی نہیں ہے۔ بہر حال اللہ سے دعا مانگنا کہاں تک درست ہے اور اس کے قبول ہونے کی امید کے کیا معنی ہیں یہ جدا بحث ہے۔ یہاں صرف چند اشعار مولانا کے روم کے ہدیہ ناظرین ہیں۔

از دعا ہائیت بس مقصود شان	جز سخن گفتن بہ آں شیریں دہان
گر کند مقبول بس فهو المراد	بادل و دیدار نقد آئند مشاد
گر کند دولت آں بیشتر	بہر تقریب دگر بار دگر با



## فصل نمبر ۶۹

### اسلام اور غلامی

اپنے غلاموں کے ساتھ جو سلوک مسلمانوں نے کئے ان کا بیان فصل ۹ " غلاموں کی حالت میں دیکھیے۔ فصل ۱۱ " مسلمانوں کے احسانات دنیا پر۔ میں بھی غلامانِ مصر کی حالت بیان کی گئی ہے۔ یہاں صرف یہ دکھانا ہے کہ قرآن نے غلامی کا انسداد بھی کیا یا یہ کہ محض اس کے طریقے مہذب کئے اور اس کے قائم رکھنے کا حکم دیا۔ میرا خیال یہ ہے کہ انسداد کیا۔ پہلے غلامی کی تشریح کرنا چاہیے تاکہ سمجھ میں آئے کہ غلامی کیا شے ہے اور بعد ازاں پھر یہ بتایا جائے گا کہ قرآن نے کیونکر اس کا انسداد کیا۔

دنیا کی تاریخ پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء خلقت سے تمام دنیا میں یہ دستور جاری تھا کہ لوگ لڑائی کے قیدیوں کو مولیشیوں کی طرح اپنے قبضہ میں رکھتے تھے اور جس طرح چاہتے تھے ان کے ساتھ برتاؤ کرتے تھے۔ حتیٰ کہ انکی نسل کو بھی اپنی نسل سمجھتے تھے یہ وہ صورت غلامی کی تھی کہ کسی مہذب سے مہذب قوم نے بھی اسے ناجائز خیال نہیں کیا تھا اور دوسری صورت غلامی کی یہ تھی کہ فریب یا چوری سے کمزور زبردست کی قید میں آتا تھا اور کبھی کبھی زر کے معاوضے میں بھی ایسا ہوتا تھا۔ یہ صورت ضرور اخلاقاً مذموم سمجھی جاتی تھی لیکن اس کا سداج مثل اور بری باتوں کے تمام عالم میں تھا اور کوئی قوم اپنی خود غرضی کے سلسلے اس کے رد کرنے کی طرف کامل توجہ نہیں کرتی تھی۔

یہودیوں، ایرانیوں، ہندوؤں، یونانیوں اور رومیوں نے اپنے اپنے زمانے میں بڑے بڑے عروج پائے۔ لیکن غلاموں کی حالت کہیں بھی مہذب نہیں کی گئی۔ رومیوں نے ضرور کچھ اپنے غلاموں کے حقوق کی حفاظت کی تھی۔ لیکن بہت کم برائے نام۔ اور کثرت فتوحات کی وجہ سے رومیوں کے قبضہ میں جتنے غلام تھے پہلے کبھی دوسری قوموں کے پاس اتنے نہ تھے ان تمام قوموں میں دو توں قسمیں غلامی کی بے تکلف جاری تھیں۔

اسلام کی برکت دیکھیے کہ دوسری قسم کی غلامی اسلام کے جاری ہوتے ہی ان تمام ممالک سے اٹھ گئی جہاں اسلام کا جھنڈا پہنچا۔ اور اگر پھر قائم ہوئی تو اسلام کے منصف کے ساتھ قائم



ہوئی۔ یعنی جہاں کہیں زمانہ مابعد میں اصول اسلام سے چشم پوشی کی گئی۔ وہاں اور برائیوں کے ساتھ دوسری قسم کی غلامی بھی جاری ہو گئی۔ لیکن اسلام پر اس کا الزام عاید نہیں ہو سکتا تمام علماء زمانہ اسے تسلیم کرتے ہیں۔ رہی پہلی صورت۔ اس کی نسبت ہم یہ ضرور کہیں گے کہ اسلام نے اس کو مٹانا چاہا تھا مگر اسکی بیخ کنی عملی طور پر نہ ہو سکی۔ بعد زمانہ رسول کے وہ مسلمانوں میں قائم رہی لیکن یہ دلیل اس امر کی نہیں ہو سکتی کہ اسلام نے بھی اسکی اجازت دی ہے۔

پہلے ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اسلام نے اس کا انسداد کرنا چاہا اور بعد ازاں پھر ہم یہ دکھائیں گے کہ اس پر عمل کیوں نہ ہوا۔

عرب میں اسلام پھیلنے کے وقت چھ قسم کی غلامی جاری تھی۔ اول خود کو بیچ ڈالنا۔ دوم اپنی اولاد صغیر کا بیچ ڈالنا۔ سوم چھوٹے لڑکے یا لڑکیوں کا پھسلا کر یا چرا کر بیچ ڈالنا۔ چہارم زبردستی اور ڈاکہ زنی یا رہزنی سے کسی کو پکڑ کر لانا۔ پنجم زمانہ جنگ میں دشمن کی رعایا کو پکڑ لانا۔ ششم حالت جنگ میں مردوں عورتوں اور بچوں کو قید کر لینا۔ ان جملہ اقسام کے غلام عربوں کے پاس تھے اور جو جتنا ہی زبردست تھا اتنے ہی زیادہ غلام اس کے پاس تھے آنحضرت نے قطعی حکم غلاموں کے آزاد کرنے کا نہیں دیا۔ کیونکہ یہ بالکل ہی غلاف مصلحت تھا لیکن موجودہ غلاموں کے آزاد کرنے کو بے حد باعث ثواب بتایا بلکہ بہت سے جرائم کا کفارہ اسے قرار دیا اور آئندہ غلامی کے انسداد کے لئے صریح حکم سنائے۔

سورہ محمد میں خدا فرماتا ہے: جب تم مقابل ہو کافروں کے تو انکی گردنیں کاٹو اور جب ان پر گھمسان کر چکو تو ان کو قید کر لو پھر قید کرنے کے بعد یا تو ان پر احسان رکھ کر یا ان سے فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دو۔

اب اس سے زائد تر وضاحت کیا چاہیے۔ صاف محکوم ہوا کہ احسان رکھ کر چھوڑ دو۔ یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ کوئی تیسری یا چوتھی صورت نہیں بتائی گئی یعنی قید یا ان جنگ کے قتل کرنے یا غلام بنانے کا حکم قرآن میں کہیں نہیں دیا گیا۔ وہی صورتوں میں انحصار کر دیا گیا یعنی صرف احسان رکھ کر یا فدیہ لے کر چھوڑ دینا بتایا گیا۔ مشرکین عرب کی بہت سی بری رسمیں اس وقت تک مسلمانوں میں جاری تھیں جب تک انکی ممانعت کی نص قطعی نہیں آئی تھی۔ مثلاً جب تک شراب پینے کی ممانعت قرآن میں نہیں ہوئی مسلمان شراب پیتے تھے اور اسی طرح وہ دو بہنوں

لے فاذا نزلتم الذین کفروا خضرب الرقاب حتی اذا استخفتموہم فشدوا الوثاق فاما من بعد واما فداؤ۔ سورہ محمد۔



کو ایک ساتھ زوجیت میں بھی رکھتے تھے۔ باپ کی بیوا کی بھی جب تک اسکی ممانعت نہیں آتی مسلمانوں کی زوجیت میں آتی تھیں۔ اور جب ممانعت ہوئی تو موجودہ عورتیں بدستور زوجیت میں رہیں اور آئندہ کے لئے ممانعت نافذ سمجھی گئی اسی طرح آیت حریت کے بعد وہ غلام جو پہلے سے موجود تھے بدستور حالت غلامی میں رہے لیکن انسداد غلامی کی آیت نازل ہونے کے بعد پھر کوئی نیا غلام نہیں بنایا گیا۔

جو غلام موجود تھے انکی آزادی اور آسائش کے لئے احکام صادر ہوئے غلاموں کا آزاد کرنا پیغمبر نے باعث ثواب بتایا۔ گناہوں کا کفارہ بھی اسے مقرر کیا۔ یہ بتایا کہ غلام اپنی قیمت خود ادا کرنا چاہیں تو ان سے اقرار نامہ لے کر ان کو کمانے کی اجازت دید و اور ایسے غلاموں کے لئے چندہ کرنے کی ترغیب دی۔ بیت المال سے روپیہ دینا بھی جائز رکھا۔ بعض حالتیں ایسی مقرر کیں کہ لونڈیاں خود بخود آزاد ہو جائیں۔ غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی از بس تاکید کی ان سب احکام سے عالموں کو یہ دھوکا ہوا کہ غلامی قائم ہے حالانکہ آئندہ غلامی کو روک کر موجودہ غلاموں کے لئے یہ احکام بتائے گئے تھے۔

قیدیان جنگ مسلمانوں کے قبضہ میں آکر ان کے حسن سلوک سے ایسا خوش ہوتے تھے کہ وہ گھڑکانام بھی نہیں لیتے تھے اور اس لئے احسان رکھ کر چھوڑ دینا یا فدیہ لے کر چھوڑ دینا یہ ایک حق تھا جس کا مطالبہ غلاموں کی طرف سے نہیں کیا گیا۔ پیغمبر کے بعد حبیب مسلمانوں میں دولت بڑھی اور حسن اخلاق میں ترقی ہوئی تو غلاموں کو آزاد رہنے سے قید رہنا کہیں اچھا معلوم ہوتا تھا اور پھر وہ غلامی نہیں رہی وہ ایک قسم کی اخوت تھی جس طرح ہندوستان میں منہی بیٹا بنانے کا دستور ہے۔ چیلے خوشی سے گھر چھوڑ کر گرو کے گھرتے ہیں اسی طرح یہ غلام بنائے ہوئے بھائیوں کی طرح عیش و عشرت میں عربوں کے ساتھ بسر کرتے تھے۔ اور گھڑکانام بھی نہیں لیتے تھے اسی طرح رفتہ رفتہ قیدیان جنگ کا غلام بننا جس کا انسداد پیغمبر نے کیا تھا عربوں میں اور ان کے ذریعہ سے تمام بلاد اسلام میں قائم رہ گیا۔

قرآن میں جہاں کہیں احکام غلاموں کے مذکور ہوئے ہیں وہاں نئیغہ مافی مستعمل ہوا ہے جس سے صریح ظاہر ہوتا ہے کہ گزشتہ غلاموں کے متعلق یہ احکام تھے۔ قرآن میں کوئی ایسا لفظ نہیں آیا ہے جس سے معلوم ہو کہ آئندہ رقیہ کے متعلق کوئی حکم ہے احادیث اور سیر کی کتابوں کو بخوبی پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر خدا کے زمانے میں بعد اس آیت حریت کے کوئی قیدی جنگ



غلام نہیں بنایا گیا۔ قرآن کی نص قطعی اور آنحضرت صلعم کا فعل صریح ثبوت اس کا ہے کہ غلامی کا انسداد اسلام نے کیا۔

آج کل یورپ میں قیدیوں جنگ کے ساتھ برابر کا برتاؤ ہوتا ہے۔ نہایت آرام سے وہ رکھے جاتے ہیں اور جنگ ختم ہونے کے بعد وہ چھوڑ دیئے جاتے ہیں کبھی تو بطور احسان کے اور کبھی خرچہ جنگ کا معاوضہ کر۔ قیدیوں جنگ کا قتل کرنا یا انکو بطور مال مغرورہ کے ہاتھ تقسیم کر لینا کسی طرح جائز نہیں ہے۔ اور اس کے خلاف ہونا صریح بد تہذیب ہے اور خلافت انسانیت سمجھا جاتا ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن جسکو دعویٰ ہے کہ وہ ہر قرن اور ہر قوم کے مناسب حال ہے اور تمام امور کی نسبت اس میں ہدایتیں ہیں اس بارہ میں کیا حکم دیتا ہے یہ سوال اول اول سرسید کے دل میں پیدا ہوا اور انہوں نے ایک رسالہ اس پر تحریر کیا اور ثابت کیا کہ قیدیوں جنگ کا قتل کرنا یا غلام بنانا قرآن میں محکوم نہیں ہے اور نہ پیغمبر خدا نے آیت حریت نازل ہونے کے بعد کبھی قتل کرنے یا غلام بنانے کا حکم دیا اس پر سرسید نے قرآن سے اور قول پیغمبر سے عمدہ عمدہ طور پر اپنا دعویٰ ثابت کر دیا ہے لیکن آخر میں انہوں نے یہ لکھا ہے کہ خلفائے اربعہ کے زمانہ میں غلام بنانے کا قاعدہ جو جاری تھا وہ بجا تھا۔ خلفائے اربعہ معصوم نہ تھے اور نہ ان کا فعل بہ مقابلہ فعل رسول کے قابل سند ہے۔ "میشک" خلفائے اربعہ معصوم نہ تھے اور ان کا فعل بہ مقابلہ فعل رسول کے قابل سند نہ تھا لیکن وہ قرآن اور فعل رسول کو ہم سے اچھا سمجھتے تھے اگر ہم قرآن و حدیث سے افعال خلفائے اربعہ و اعمال مسلمانان مقربین کی مخالفت قائم نہ ہونے میں تو یہ ہماری بڑی کامیابی ہے اس لئے سرسید کے خیالات پر مفصلہ . . . ذیل مضمون کا اعتراف کیا جائے تو بجا نہ ہوگا۔

قرآن میں یہ حکم ہے کہ "احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو" یوں محکوم نہیں ہے کہ "فدیہ لے کر چھوڑ دو یا احسان رکھ کر چھوڑ دو" اگر پھیلی صورت ہوتی تو چھوڑنا لازم ہوتا۔ پہلی صورت میں چھوڑنا اسی وقت لازم آتا ہے کہ کوئی فدیہ لے کر آئے اور فدیہ بھی مقبول ہو اور کہے کہ فلاں غلام میرا عزیز ہے اور یہ اس کا فدیہ ہے چھوڑ دو۔ کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خلفائے اربعہ کے پاس کوئی فدیہ لے کر آیا اور اس کا عزیز یا ہم قوم اسکی درخواست پر چھوڑا نہیں گیا جب ایسا نہیں ہوا تو خلفائے اربعہ پر خلاف نص صریح کے عمل کا الزام عاید نہیں ہوتا۔ جب تک احسان رکھ کر چھوڑنا یا فدیہ لے کر چھوڑنا عمل میں نہ آتا قیدیوں میں رہنا لازم تھا مسلمان اگر بجائے قید نہائی کے قیدیوں کو اپنے گھروں میں بطور شاگردوں کے رکھتے تھے اور انکو ہر طرح کا آرام دیتے تھے ایسا آرام کہ وہ قیدی اپنا



گھر بھول جاتے تھے یہ صحت اچھی تھی بری نہ تھی۔ غلام آزاد کرنے کا بڑا دستور مسلمانوں میں تھا اور یہ صریح طور پر احسان رکھ کر چھوڑنا کہا جائے گا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح پیغمبر خدا بعد آیت حریت کے جنگ ختم ہوتے ہی قیدیوں کو چھوڑ دیتے تھے ویسا خلفائے اربعہ نے کیوں نہ کیا اس کا جواب یہ ہے کہ پیغمبر نے ایسا جو کیا وہ شان پیغمبری تھی اور دوسرے یہ کہ پیغمبر کے عہد میں لڑائیاں ملک عرب میں ہوئیں لڑائی فتح ہوئی اور فوراً قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ تمام قیدی مسلمان ہو کر فوج میں داخل ہو گئے خلفائے عہد میں غیر قوم کے قیدی منزلوں طے کر کے لائے جاتے تھے نہ وہ بولی سمجھتے تھے اور نہ ملکی رواج سے ہی واقف تھے۔ اپنے ملک میں رہتے تو فساد کرتے۔ عرب میں احسان رکھ کر چھوڑ دیئے جاتے تو بھیک مانگتے۔ بھیک مانگنے سے ان کا کسی کے گھر میں بھائی بن کر رہنا اچھا تھا احسان رکھ کر چھوڑنا مناسب نہ تھا اور فدیہ دینے والا کوئی موجود نہ تھا کہ فدیہ دیکر ان کو اپنے گھر لے جائے ایسی حالت میں سوائے قید کے دوسری صورت نہ تھی اور قید کی بہترین صورت تھی کسی کے گھر میں انکو رکھنا اور یہ کہہ دینا کہ جب موقع آئے تو احسان رکھ کر آزاد کر دینا بس یہی حالت خلفائے اربعہ کے زمانے کے قیدیوں کی تھی۔

قرآن میں یہ حکم نہیں ہے کہ خواہ مخواہ قیدیوں کو چھوڑ دو اور نہ ایسا حکم مناسب ہو سکتا تھا اب بھی کسی مہذب گورنمنٹ کا یہ قانون نہیں ہے کہ خواہ مخواہ قیدی چھوڑ دیئے جائیں قیدیوں کے قتل کرنے کی ضرور ممانعت ہے اور خلفائے اربعہ کے زمانے میں بھی کوئی آدمی قتل نہیں کیا گیا تھا۔ فتوحات اسلام کے زمانہ میں ریل نہ تھی۔ تار نہ تھا مترجم زبانوں کے بکثرت نہ تھے۔ راستہ کی سہولت نہ تھی فتوحات کی کثرت تھی۔ مسلمانوں کے اخلاق دلوں کو مسح کر رہے تھے۔ جو قیدی مدینہ میں آیا اس کے بھائی بند گھر پر ہی مسلمان ہو گئے اب بجائے اس کے کہ وہ قیدی کے تھپڑ لے کے لئے فدیہ بھیجتے ان کو قیدی کی حالت پر رشک آنے لگا کہ اسے کاش ہم بھی قید ہو گئے ہوتے تو مدینہ اور مکہ کی زیارت کرنے کا خلیفہ وقت کی صورت دیکھتے۔ ہمارا سبب بڑا خوش نصیب تھا کہ اسکی ہجرت کے لئے غیب سے ایک صورت پیدا ہو گئی۔

قرآن کا یہ معجزہ ہے کہ وہ ہر حالت کے مناسب ہے آیت حریت پر پیغمبر خدا نے جس طرح عمل کیا وہی مناسب تھا بعد ازاں خلفائے اربعہ کے وقت میں جس طرح اس پر عمل ہوا وہی ٹھیک تھا اس وقت اس سے اچھا عمل اس پر ہو نہیں سکتا تھا اب سلطان روم یا شاہ ایران وغیرہ شاہان اسلام کو لڑائی کی نوبت آئے اور قیدیوں کے ساتھ یورپین تہذیب کے ساتھ وہ عمل کریں تو کہا جائے گا کہ قرآن کے موافق انھوں نے عمل کیا قرآن میں قیدیوں کے قتل کرنے کا حکم آیت حریت میں نہیں ہے یورپین بھی



سپنے قیدی قتل نہیں کرتے۔ رہبان کا چھوڑنا۔ یہ لازم نہیں ہے یورپین کبھی کبھی احسان رکھ کر چھوڑتے ہیں اور کبھی زچہ ہنگسے کر چھوڑتے ہیں اور خرچہ جنگ نہیں ملایا حسب خواہ نہیں مالتو نہیں بھی چھوڑتے یہی قرآن بھی کہتا ہے اور یہی اس وقت کی مہذب قوموں کا دستور ہے۔

## فصل نمبر ۱۰

### سود خواری

سود خواری کے متعلق آیات قرآن حسب ذیل ہیں۔

”سود کھلنے والے (قیامت میں) ایسے کھڑے ہوں گے گویا انہیں شیطان نے چھو کر بھڑکا کر دیا ہے یہ ان کے اس کہنے کی سزا ہے کہ جیسا معاملہ بیع مسلم ہے ویسا ہی سود کا ہے۔ حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔۔۔ اللہ سود کو گھٹاتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے (یعنی اس میں برکت نہیں دیتا اس میں برکت دیتا ہے)۔۔۔ مسلمانوں تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو۔“

”مسلمانوں! سود نہ کھاؤ کہ دگنا چوگنا ہوتا چلا جائے گا اور اللہ سے ڈرو۔ عجب نہیں کہ تم فلاح پاؤ گے۔ تم لوگوں کے مال میں زیادتی کے لئے سود دیتے ہو تو اللہ کے نزدیک اس سے زیادہ نہیں ہوتی۔ خدا کے لئے جو زکوٰۃ دے رہے ہیں وہی بڑھا رہے ہیں۔“

۔۔۔۔۔ سود کے ممنوع ہونے کے کئی وجوہ مذکور کرنے سے سمجھ میں آتے ہیں۔ اول یہ کہ سود پر روپیہ دینا مخالفت ہے تجارت کے۔ شرع نے سود خواری سے باز رکھ کر زکوٰۃ کا ٹیکس لگا دیا ہے تاکہ خواہ مخواہ لوگ تجارت کریں۔ تجارت میں علامہ قومی نفع کے تجارت کے ذریعہ سے قوم مالدار ہوتی ہے۔ شخصی نفع بھی ہے یعنی سود سے اتنی دولت بنتی ہے کہ تجارت سے جمع ہو سکتی ہے۔

دوم یہ کہ سود پر روپیہ دینا اگر مدیون کی خانگی ضرورت کے لئے ہے تو ضرورت سے قوت ہے اور اگر مدیون کو تجارت کے لئے دینا ہے تو قمار بازی کی ترغیب دینا ہے اور دونوں صورتیں مذموم ہیں سودی روئے سے تجارت کرنا ایک قسم کی قمار بازی ہے اس کے متعلق میں خور ایک اپنا واقعہ درج کرتا ہوں۔ میں نے اپنے ایک عزیز کو کچھ روپیہ تجارت کے لئے دیا۔ اس عزیز نے دو تین برس میں اصل کو دگنا کر دیا اور یہ کامیابی کی صورت تھی مجھ کو خبر ہوئی تو میں نے صرف اتنا کہا کہ: تجارت میں زکوٰۃ ضروری جلسے اور سود پر کوئی معاملہ نہ کیا جائے۔ ورنہ بغیر ان دونوں باتوں کے تجارت



میں برکت اور پائیداری نہیں ہوتی۔ عربوں کی تجارت پشتہا پشت چلتی تھی پانچ پانچ سو برس تک ان کی تجارت قائم رہتی تھی۔ مصر کے خاندانی تاجروں کی دولت کی نسبت مورخوں نے لکھا ہے کہ بادشاہوں کو ان سے کوئی نسبت نہ تھی اور آجکل کی یورپین تجارت گویا کچھ سوت کا جال ہے روز ہی دیوالہ نکلا کرتا ہے۔ پونجی کچھ نہیں اور انتظام تمام خدائی کا ذرا بل پڑا اور دیوالہ نکلا۔ صنعت و حرفت کو ان لوگوں نے تجارت کے ساتھ ملا دیا ہے اس لئے ذرا پائیداری ہے اور جہاں کہیں نری تجارت ہے وہاں کچھ بھی قیام نہیں ہے۔ غرض کہ اس عزیز نے میری نصیحت پر کچھ بھی عمل نہیں کیا اور نتیجہ بد دیکھنے میں آیا نقصان ہوا تو ایسا کہ اصل اور نفع سب جاتا رہا خیریت ہوئی کہ کچھ گھر سے دینا نہیں پڑا تفسیق اس اجمال کی یہ ہے کہ پانچ ہزار سے تجارت شروع ہوئی تھی تیسرے برس دس ہزار ہو گئے اور اس دس ہزار کا گھی غنا نہ نیپال سے لے کر کلکتہ روانہ کیا گیا آڑھت میں مال پہنچنے ہی ساڑھے نو ہزار سو دی مل گئے فوراً ساڑھے نو ہزار کا مال بھینچا گیا اور نو ہزار پھر مل گئے غرض کہ اسی ہیر پھیری میں ایک لاکھ کا گھی دو ماہ کے اندر کلکتہ پہنچ گیا اور ۹ ہزار سو دی قرض اس مال کی ضمانت پر گویا تجارت کے سر آیا۔ اتفاق دیکھیے کہ گھی کا بازار روز بروز اترا گیا اور اتنے میں برسات آگئی اور گھی خراب ہونے لگا اب تک مجھے خبر نہیں ہوئی تھی کیونکہ کار کسی دوسرے صاحب تھے یہ حالت دیکھ کر میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ بیدار ہو جاویے نہیں تو گھر کی جائداد بھی نیلام ہوا چاہتی ہے۔ تمام حالات مجھ کو ان سے معلوم ہوئے تو مجھ کو کبھی پریشانی ہوئی کہ جب گھی خراب ہو جائے گا تو ضروری ہے کہ ۹۰ ہزار میری ذات اور جائداد سے وصول کیا جائے گا یا میری جائداد سے نہ سہی اس شخص کی جائداد سے جس کے نام سے تجارت جاری تھی بہر حال اب مجھ کو فکر ہوئی اور کسی طرح میں نے اس گھی کے بکنے کا بندوبست کیا خیریت ہوئی کہ درگا پو جا کا زمانہ آگیا اور گھی کسی طرح فروخت ہو گیا اور دس ہزار کا نقصان ہوا اصل رقم اور تین سال کا نفع اس نقصان کی نذر ہوا نفع ہوتا تو لاکھ پر ہوتا اور نقصان ہوا تو وہ بھی لاکھ کے پرتہ سے ہوا نفع سے ایک دم سے کام ہونے جانے کی امید تھی اور نقصان میں ایک دم سے سب کاروبار بگڑ گیا اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ لوگ جو کہتے ہیں کہ آجکل کی تجارت بغیر سود کے نہیں چلتی اس کا مطلب یہ ہے کہ آجکل کی تجارت قمار بازی ہے یہ تجارت نہیں ہے حالانکہ تجارت وہی ہے جو شرع میں محکوم ہے کہ سود کا معاملہ نہ کیا جائے اور نہ قمار بازی کی صورت پیدا ہو۔ جتنی دولت ہو اس کی مقدار سے تجارت کی جائے اور تجارت میں بکری نقد ہوا ادھار نہ ہو لوگ کہتے ہیں کہ ادھار بیچے بغیر تجارت نہیں چلی سکتی یہ غلط ہے۔ ادھار بیچنا بھی ایک قسم کی قمار بازی ہے بجائے ۲ آنے فی روپیہ لینے کے ۳ آنے کے لالچ میں لوگ قرض دیتے ہیں قرض وصول ہو گیا تو بن گئے اور نہ وصول ہوا تو بگڑ گئے بجائے دو آنے کے پونے دو آنے قبول کئے جائیں اور ۳ آنے نہ



منظور کئے جائیں تو تجارت میں پابندی ہوتی ہے۔ اس وقت ۲ ملتے ہیں اور ۲ ماہ بعد ۳ ملیں گے یہ سود نہیں تو اور کیا ہے۔ غرض کہ سود کے معاملتے شرع محمدی نے روک کر انسانی ہمدردی اور اصول تجارت کا پورا اور پکا سبق مسلمانوں کو سکھایا ہے۔

سوم یہ کہ سود لینے سے دلوں میں کمزوری اور نیتوں میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ بے محنت کھانے کو ملتا ہے اور انسان کے لئے سب سے بڑی بلا یہ ہے کہ اسکو محنت نہ کرنا پڑے اور کھانے کو ملتا جائے۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سود خوار بننے ہندوستان کے بڑے مالدار اور ایمان دار ہوتے ہیں اور نہایت لطف سے زندگی بسر کرتے ہیں حالانکہ وہ بالکل خلاف شرع عمل کرتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ بمقابلہ تاجر کے سود خوار کم معمول ہوتے ہیں سواہل بھر کے تاجروں سے مقابلہ کیا جائے تو سود خوار بننے نہایت قلیل البضاعت ثابت ہوں گے رہی انکی ایمانداری۔ میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ ہندوستان کے دیگر پیشوں سے سود خواری اچھی ہے اور اس لئے نسبتاً سود خوار ایماندار بھی ہیں اور خوشحال بھی ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سود خواری تجارت سے اچھی ہے ایک پیشہ ملازمت کا بہرہ بیان کی ملازمت میں رشوت کو اخلاقاً میوب نہیں سمجھتے کتنے ملازم جو سیکڑوں روپیہ ماہانہ رشوت لیتے ہیں اور سود خوار کے گھر کا پانی نہیں پیتے اور کہتے ہیں کہ سود خوار کے گھر کا پانی حرام ہے حالانکہ رشوت لینے اور خیانت کرنے سے سود کھانا اچھلے ہے اسی طرح جو زمیندار آسامیوں پر جبرنا جائز کر کے اور پٹی داروں سے بے ایمانی کر کے روپیہ پیدا کرتے ہیں انکی زمینداری سے سود خواری اچھی ہے۔ رقص و سرود کے پیشے سے جس میں زنا کاری لازمی ٹھہرائی گئی ہے سود خواری بدتر ہے ہرے حتیٰ کہ تجارت میں جھوٹ بولنے والے اور دغا دینے والے بھی سود خوار سے بدتر ہیں۔ مال تقیم کھانے والے دوسروں کی جائداد پر قبضہ ناجائز رکھ کر تمادی کا عذر پیش کرنے والے بھی سود خوار سے برے ہیں میں ڈرتا ہوں کہ میری تحریر سود خواری کی ترغیب نہ دے۔ سود کھانا برا ہے اور ضرور برا ہے لیکن اس وقت سود کھانے سے بھی زیادہ برے دستور کسب معاش میں جاری ہیں ان سے بھی اجتناب چاہیے اور سود خواری سے بھی بچنا چاہیے پھر اہل حلال میں وہ لطف آئے گا اور دولت اتنی جمع ہوگی کہ رکھنے کی جگہ نہ ہوگی یہ خیال غلط ہے کہ فاتہ کشتی کے لئے اسلام آیا ہے اسلام پھینکا گیا ہے انسان کو معمول کرنے کے لئے اسلام کے قاعدوں پر عمل کرنے سے جتنی دولت جمع ہوتی ہے دوسرے ذریعہ سے جمع نہیں ہو سکتی بشرطیکہ ان پر پورا پورا عمل کیا جائے۔



## فصل نمبر ۱۷

### رسم پردہ

عورتوں کے پردہ کے متعلق جو احکام قرآن میں ہیں وہ یہ ہیں -

دو پیغمبر مسلمانوں سے کہو کہ وہ اپنی نظر میں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اس میں انکی زیادہ صفائی ہے وہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ کو معلوم ہوتا ہے۔ اور مسلمان عورتوں سے کہو کہ وہ بھی اپنی نظر میں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنے مقامات زینت ظاہر نہ ہونے دیں سوائے اس مقام کے جس کا ظاہر کرنا لابدی ہے اور اپنے سینوں پر دو پٹیوں کی بکل مار سے رہیں اور شوہر، باپ، سسر، بیٹے، شوہر کے بیٹے، بھائی، بھتیجے، بھانجے، میل جول کی عورت، لونڈی، غلام، مرد خدام جو عورتوں سے عرض نہیں رکھتے یا ایسے لڑکے جو عورتوں کے پردے سے آگاہ نہیں ہیں ان کے سوا دوسروں پر اپنے زینت کے مقامات ظاہر نہ ہونے دیں اور چلنے میں اپنے پاؤں ایسے زور سے نہ رکھیں کہ لوگوں کو ان کے اندرونی زیورات کی خبر ہو۔ مسلمانو! تم سب اللہ کی جناب میں توبہ کرو کہ تم فلاح پاؤ گے۔

بڑی بوڑھی عورتیں جن کو نکاح کی امید باقی نہیں رہی اگر وہ اپنے اوپر کے کپڑے اتار لیں تو اس میں ان پر کچھ گناہ نہیں ہے بشرطیکہ اپنا بناؤ دکھانا منظور نہ ہو۔ اور اگر اس کی بھی احتیاط رکھیں تو اور اچھا ہے۔ اللہ سنتا ہے اور جانتا ہے۔

دو پیغمبر تم اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمان عورتوں سے کہدو کہ اپنی چادروں کے گھونگٹ نکال لیا کریں اس سے غائباً وہ پہچان پڑیں گی بیویاں ہیں۔ پھر ان کو کوئی نہ چھپڑے گا۔ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

ان آیتوں پر غور کیجئے۔ پہلی آیت میں عورتوں کو صرف یہ تاکید ہے کہ وہ اپنے مقامات زینت نہ ظاہر ہونے دیں اور سینوں پر ایسا کپڑا رکھیں کہ سینے کا اجماع نظر نہ آئے مقامات

۱۔ سورہ نور رکوع ۴ -

۲۔ سورہ نور رکوع ۸ -

۳۔ سورہ احزاب رکوع ۸ -



زینت میں سے وہ مقام جنکا ظاہر کرنا لایہدی ہے مستثنیٰ کئے گئے ہیں۔ فقہ کا مسئلہ یہ ہے کہ منہ اور ہتھیلیوں کے سوا عورتوں کو اپنا تمام جسم چھپانا چاہیے۔ شرع میں تاقصی کے سامنے عورتوں کو منہ کھول کر اظہار دینا محکوم ہے۔ تمام عورتیں مسلمانان سابق کے برابر سفر کرتی تھیں۔ باہر نکلتی نہیں۔ آخر وقت تک پیغمبر خدا اپنی ازواج کو برابر اپنے ساتھ ساتھ سفر میں لے جاتے تھے ہندوستان میں جس طرح عورتیں چار دیواری کے اندر قید رہتی ہیں۔ عدالت میں کبھی جانے کا اتفاق ہوا تو ڈول کے اندر لوٹوں کر گئیں ریلوے اسٹیشن پر ٹرین سے اترتے چڑھتے وقت تمام مسافروں کا تماشہ بنی رہیں۔ یہ دستور اسلام نے نہیں سکھایا ہے۔ اب بھی عرب مصر۔ شام وغیرہ تمام بلاد اسلام میں عورتیں بے تکلف گھوڑوں پر چڑھتی ہیں سب کام بازار کا کر لاتی ہیں منہ پر برقعہ رکھتی ہیں۔ لیکن یہ برقعہ اچھا ہوا یا برا قرآن میں محکوم نہیں ہے اور نہ پیغمبر خدا کے زمانے میں شروع ہوا۔ جس طرح کعبہ کے گرد چار مصطفیٰ بن گئے اسی طرح بعد کو برقعہ بھی جاری ہوا۔ اس کے بدعت ہونے میں کلام نہیں۔ حسنہ اور سیئہ کا تصفیہ کرنا نہیں چاہتا۔

غرض کہ منہ چھپانے کا حکم قرآن میں کہیں نہیں ہے۔ البتہ سورہ اٰحزاب میں گھونگٹ نکالنے کا حکم ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح دہلی اور لکھنؤ میں مہاجروں کی عورتیں دیا۔ بازار یا مقامات پر تش وغیرہ کو پیادہ پا گھونگٹ نکالے ہوئے جھنڈ کی جھنڈ جاتی ہیں اسی طرح قرآن میں بھی مسلمان عورتوں کی نسبت حکم ہے کہ وہ گھونگٹ نکال کر چلا کریں۔ اگر یہ معنی صحیح ہوں جب بھی جو طریقہ پر وہ کامسلمانوں میں رائج ہے اس کی تائید اس سے نہیں ہوتی لیکن واضح رہے کہ گھونگٹ نکال کر چلنا "یہ متفق علیہ ترجمہ نہیں ہے یہ ترجمہ باعتبار رواج مولوی نذیر احمد صاحب نے اختیار کیا ہے اور ممکن ہے ان کو دھوکہ ہوا ہو مولوی عبدالقادر کے حاشیہ سے۔ جس میں لفظ گھونگٹ کا استعمال کیا گیا ہے۔ یا تفسیر حسینی میں جو عبارت "ابن پوشیدن سرور سے و بدن" ہے اس نے انکو مخالفتہ دیا ہوا کوئی اور ترجمہ متاخرین کا انھوں نے دیکھا ہے بہر حال دیگر مستند تراجم میں گھونگٹ نکالنا نہیں ہے بلکہ چار دیواری لکھا ہوا ہے۔

مختلف ترجمے :-

مولوی نذیر احمد : اپنی چادروں کے گھونگٹ نکال لیا کریں۔

مولوی شاہ ولی اللہ : فر و گزارند بر خود چادر ہائے خود۔

سعدی علیہ الرحمۃ : فر و گزارند بر خود از چادر ہائے خود



مولوی رفیع الدین، نزدیک کر لیں اور اپنے بڑی چادریں اپنی۔

شاہ عبدالقادر، نیچی لٹکالیں اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں۔

مولوی نذیر احمد نے وہ مضمون صاف کر دیا جس کو دب دب کر مولوی عبدالقادر نے لکھا تھا

لیکن مولوی رفیع الدین کے ترجمہ سے ذرا بھی گھونگٹ نکالنے کی طرف اشارہ نہیں نکلتا۔ اور نہ

سیاق عبارت سے ایسا معلوم ہوتا۔ شان نزول آیت یہ ہے کہ جب مدینہ کی عورتیں باہر نکلتی

تھیں تو لوگ دل لگی کرتے تھے۔ شریف کی عورتوں کی شکایت پر لوگوں کو یہ عذر ہوتا تھا کہ لونڈیوں

میں اور شریف کی عورتوں میں جب کبھی فرق نہیں ہوتا تو غلطی ہو جاتی ہے۔ حکم ہوا کہ عربوں میں

جو دستور پہلے سے تھا کہ عورتیں کٹی تہہ کپڑے پہنتی تھیں وہ کیوں نہ جاری رہے یعنی عورتیں سب

کپڑوں کے اوپر ایک بڑی سی چادر اوڑھ لیا کریں۔ اس طرح وہ پہچان پڑیں گی کہ بیویاں ہیں اور پھر

کرنی انکو نہ چھڑے گا۔ اس وقت عرب میں گھونگٹ نکالنے کا دستور نہ تھا۔ کہیں سے اس کا

پتہ نہیں چلتا۔ اگر عرب کی عورتیں گھونگٹ نکال کر چلتیں تو پھیرنا موقوف نہ ہوتا وہ تو اور ایک

تماشہ ہو جاتا۔

بہر حال عورتیں اسلام میں اسی طرح چل پھر سکتی ہیں اور بے تکلف باہر نکل سکتی ہیں۔

جس طرح یورپین لیڈیاں۔ صرف اس قدر فرق ہے کہ یورپین لیڈیاں۔ صرف اس قدر فرق ہے

کہ یورپین لیڈیاں جو سر اور گردن کو کھلا رکھتی ہیں اور سینہ پر کوئی اور ٹھنی نہیں رکھتیں یہ خلاف شرع ہے

اگر وہ اس قدر ترمیم کر لیں تو انکی پوشش اور روش شرع محمدی کے مطابق ہو جائے۔

بعض ہندوؤں کا قول ہے کہ رسم پردہ مسلمانوں سے ہندوؤں نے لی ہے حالانکہ یہ بالکل غلط

ہے۔ عرب سے کابل تک پردہ کی نوعیت میں وہ سختی نہیں ہے جو شریف ہندوؤں یا شریف مسلمانوں

میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پردہ کی موجودہ حالت ہندوؤں میں تھی مسلمانوں نے اسکی تقلید

کی اور اتنا مبالغہ کیا کہ ہندوؤں سے بھی بڑھ گئے۔ میں اپنے قیاس کی دلیل یہ رکھتا ہوں کہ قوم منکوب

کا شعار ہے عورتوں پر سختی کرنا۔ عرب کو دیکھیے زمانہ انحطاط میں وہ کچھ اور نہ کر سکے تو عورتوں کے

لئے برقعہ بنا یا۔ یہ برقعہ سر سے پاؤں تک ایک خول کی صورت میں نہایت تکلیف دینے والا

ہوتا ہے۔ جن کو عادت نہیں ہے ان کا تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ لیکن پھر بھی شکر ہے کہ ہندوستان

کی قید و وام سے تو اچھا ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوؤں میں رسم سستی جاری تھی عقیدہ یوگانا

کا انسداد تھا۔ عورتوں کو مثل لونڈیوں کے رکھتے تھے۔ کیا کسی عورت سے جب تک وہ



قید کی حالت میں نہ رہے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ شوہر کے ساتھ چتا پر جلنے کو تیار ہوگی۔ یا جوانی کی حالت میں بیوہ ہو کر غیر مرد کی طرف دیکھنا پسند نہ کرے گی۔ اگر ذرا سی بھی عقل لیکن بدھی عقل ٹیڑھی نہیں ہمارے دماغ میں ہے تو ہم سو اس کے اور کچھ نہیں سمجھ سکتے کہ پہلے عورتوں کا پردہ قائم ہو اس کے بعد ان سے فرمائش ہوئی کہ بیوہ ہونے پر پھر کسی مرد کا منہ نہ دیکھو اور بہتر ہے کہ مرد کے ساتھ تم بھی جل جا یا کرو۔ یہی وجہ ہے کہ جن رذیل قوموں میں خانگی کاروبار کے جھگڑوں کی وجہ سے رسم پردہ قائم نہ ہو سکی وہاں مردوں کی ہمت اس قسم کی فرمائش کی طرف مائل نہ ہو سکی۔ جس خاندان میں رسم پردہ نہیں ہے وہاں عقد بیوگان جاری ہے جہاں مسلمانوں نے اور بہت سی برائیاں ہندوستان میں سیکھیں وہاں یہ بھی سیکھا کہ جن عورتوں کو گھوڑوں پر دوڑاتے ہوئے اور میدان جنگ کی ہوا کھلاتے ہوئے وہ یہاں تک لائے انکو یہاں مکان کی چار دیواری میں ہمیشہ کے لئے قید کر دیا۔

اس وقت جس طرح ہندوؤں میں چھوت کا بچا رہنمائی شرافت ہے۔ جو جتنا ہی شریف ہے وہ اتنا ہی اس کا پابند ہے اسی طرح یہاں کے شریف مسلمانوں کی پہچان انکی عورتوں کا پردہ ہے۔ جن کے گھروں میں جتنی ہی سختی کے ساتھ پردہ جاری ہے اتنا ہی پرانا خاندانی شریف انکو سمجھنا بجا ہے۔ اور ایک حد تک یہ صحیح بھی ہے۔ ہندوستان کی موجودہ شرافت کی قائم رکھنے والی گھر کی بیویاں ہیں اگر رسم پردہ اٹھا دی جائے تو بہت بڑا انقلاب ہو جس طرح مرغ قفس قفس سے نکل کر دوسرے جانوروں سے خود کو بچا نہیں سکتا اسی طرح پردہ کی بیویاں اگر ایک دم سے باہر کر دی جائیں تو بہ نسبت رزیلوں کے انکو اپنی عصمت کا محفوظ رکھنا زائد دشوار ہوگا اور ایک بہت بڑا اثر قوم پر ہوگا اور دوسری طرف یہ وقت ہے کہ عورتوں کی تعلیم انکے حقوق کی حفاظت اور انکی جائز آزادی کا قیام منحصر ہے۔ رسم پردہ کی سختیوں کے اٹھنے پر اور انکی تعلیم اور جائز آزادی پر منحصر ہے قوم کی آئندہ ترقی۔ موجودہ حالت میں عورتیں غلام جن سکتی ہیں مرد میدان پیدا نہیں کر سکتیں۔ جب وہ خود غلامی کی حالت میں ہیں تو اولاد کو آزادی کا سبق نہیں سکھا سکتیں۔ دونوں پہلو بتا دیئے گئے یہی خواہاں قوم غور کریں کہ ان کو کیا کرنا چاہیئے۔



## فصل نمبر ۷۷

روح اور مسئلہ تناسخ

اسلام میں روح کی نسبت اتنا ہی بتایا گیا ہے کہ وہ خدا کا حکم ہے۔ لوگوں نے پیغمبر خدا سے روح کی حقیقت پوچھی۔ وحی آئی "قل الروح من امر ربی" ترجمہ دینے پر بتا دے کہ روح خدا کا حکم ہے (یہ) نہ سمجھنا چاہیے کہ روح کی حقیقت بیان کرنے سے انکار کیا گیا ہے۔ ہرگز نہیں اس عالم ناسوتی میں اس سے زاید اگر سمجھایا جاتا تو سمجھ میں نہ آتا۔ کوئی سمجھ سکتا ہے تو معرفت اتنا ہی کہ یہ خدا کا ایک حکم ہے اور اس لئے مخاطب کی سمجھ کے مطابق جواب دیا گیا۔ اور در پردہ یہ بتایا گیا کہ اس سے زائد کوئی سمجھنا چاہے تو سمجھ نہیں سکتا کوشش کرنا بیکار ہے۔

حکیموں اور فلسفیوں نے روح کے سمجھنے کی کوششیں کی ہیں اور مختلف زمانہ میں اور مختلف فرقوں میں اس کی مختلف صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ ایک ہوا ہے جو آتی ہے اور نکل جاتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ باری تعالیٰ کی ذات کا ایک پر تو ہے کوئی کہتا ہے کہ وہ ایک الگ شے ہے جس کے تعلق سے حیات قائم رہتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ہیت مجموعی سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اسی کا نام روح ہے اسی طرح بہت سی باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ جو مذہب اسلام سے نہ موافق ہیں اور نہ مخالف ہر ایک رائے زن اپنی رائے کی نسبت یقین نہیں رکھتا۔ صرف اتنا کہتا ہے کہ ممکن ہے کہ یوں ہو۔ اور یہ کسی طرح اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ جو کچھ خلاف ہے وہ اس کے متعلق رائے زنی کرنا ہے۔ یہ ایک راز خلقت ہے اور پیغمبر خدا نے کہا کہ اس پر غور نہ کرو۔ غور کرنے والے جب تھک کر کسی رستے پر قائم نہیں ہوتے تو سوچتے ہیں کہ اسلام نے اس پر غور کرنے سے گریز کیا تو بیجا نہیں کیا۔

مسلمانوں کے یہاں روح کی حقیقت بیان نہیں کی گئی ہے لیکن یہ بتایا گیا ہے کہ تمام جسم میں روح ہی اصل ہے اور اس پر صحیح طور پر اطلاق انسان کا ہوتا ہے یہ جسم خاکی کے نابود ہو جانے کے بعد بھی قائم رہے گی اور جسم خاکی سے تعلق رکھنے کے زمانے میں جس قدر برائیاں اور کمبلایاں اس سے سرزد ہوئی ہیں ان سب پر اس کو افعال اور مسرت ہوگی بعضوں کے نزدیک اسی افعال اور مسرت کو زبان تمثیلی سے دوزخ اور بہشت سے تعبیر کرتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب



لیکن اتنا ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ عمدہ کام کی ترغیب اور برے کاموں سے اجتناب کے لئے دوزخ اور بہشت کا ہونا زاائد ترقین قیاس صورت اور پراز حکمت بیان بہ نسبت اس قول کے ہے کہ تاسیخ کے ذریعہ سے روح کو اپنے اچھے برے افعال کا نتیجہ اس عالم میں معلوم ہوگا۔ ظاہر ہے کہ دوزخ اور بہشت میں روح کو اپنی سابق حالت کا خیال ہوگا تو وہ اسکی خوشی یا رنج کا باعث ہوگا۔ لیکن تاسیخ کا مسئلہ اصلاح حال میں کچھ مدد نہیں دیتا اس عالم میں کوئی شخص کتنی ہی بری حالت میں ہے۔ لیکن اس کو کبھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ گزشتہ جنم میں ہم نے فلاں برائی کی تھی اس لئے اس حال کو پہنچے۔

اسلام کہتا ہے کہ برے کام کرو گے تو دوزخ میں چلے جاؤ گے اور وہاں اپنی برائیاں یاد کرو گے اور پھٹاؤ گے۔ اچھے کام کرو گے تو جنت ملے گی اور جنت میں اپنی بھلائیاں یاد کرو گے تو یاد کرو گے اور سمجھو گے کہ تمہارے اعمال کا یہ بدلہ ملا ہے ناظرین اس کا فیصلہ خود کر لیں گے کہ اچھے کاموں کی ترغیب دوزخ اور بہشت کے وجود پر ایمان لانے والوں کو ہوگی یا مسئلہ تاسیخ پر یقین کرنے والوں کو۔؟

## فصل نمبر ۷۴

### تجہیز و تکفین

طریقہ تجہیز و تکفین کی نسبت قرآن میں کچھ حکم نہیں ہے۔ جو طریقہ پہلے سے جاری تھا وہی جاری رہا۔ پیغمبر خدا نے اسے مسدود نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ شرع محمدی نے اسے پسند کیا۔ نماز جنازہ پڑھنے کا طریقہ آنحضرتؐ نے البتہ مستزاد کیا اور یہ بطور شعار طریقہ محمدی کے قائم کیا گیا جس طرح آج کل عیسائی قومیں ہر کام کے ساتھ کھانے کا انتظام ضرور کرتی ہیں اسی طرح مسلمانوں میں ہر جمع کے ساتھ نماز یعنی ذکر خدا کا دستور قائم ہوا ہے۔ مسلمان نماز خدا پڑھ کر خدا کی امانت خدا کو سونپتے ہیں اور چپ چاپ مردہ کو زمین کے اندر دفن کر کے چلے آتے ہیں۔ دنیا میں اس تہذیب و شائستگی کی نظیر نہیں ملتی۔

نماز جنازہ سے الگ ہو کر طریقہ دفن پر اگر گفتگو کی جائے تو ہندوؤں کے جلانے یا دریا میں بہانے اور پارسیوں کے زاسخ و زغن کے کھلانے سے مسلمانوں کا قبر کے کپڑوں کی لبری سے بری



صورت ورنہ قبر میں کیڑوں کا کھانا لازم نہیں ہے اور بہت سی لاشیں بغیر اس کے بھی جزو زمین ہو جاتی ہیں۔) نذر کرنا دیکھنے میں بھلا اور نہایت ہی شائستہ معلوم ہوتا ہے۔

پارسیوں کے طریقے پر عمل کر کے ہوا کا خراب کرنا یا ہندوؤں کے طریقے سے آب دریا کا خراب کرنا بدیہی طور پر بد مناسبت ہے جس کا معرض بحث میں لانا ہم نہیں چاہتے۔ صرف جلانے کا طریقہ جس کو بعض مہذب یورپین نے بھی پسند کیا ہے قابل لحاظ ہے۔ واضح رہے کہ مردوں کا جلانا یا تو کمال نا شائستگی کے زمانے میں قائم ہوا جبکہ آدمی کو آدمی شیخ پر سمجھوں کر کھا جاتا تھا اور اتنی بھی تہذیب نہ تھی کہ تین چار ہاتھ کا گڑھا وہ آسانی سے کھو سکتا۔ یا اعلیٰ درجہ کی تہذیب پھیلنے کا یہ نتیجہ ہے۔ جیسا کہ اب بعض یورپین لوگوں نے اختیار کیا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ جو طریقہ اس وقت مردوں کے پھونکنے کا جاری ہے کہ تھوڑی لکڑی پر رکھ کر ان کے اعزہ شیخ کے کباب کی طرح مردوں کو الٹ پلٹ کر کسی طرح نیم برشٹ کر لیتے ہیں یہ طریقہ نہ تو یورپ میں پسندیدہ ہو سکتا ہے اور نہ ہندوؤں کی مقدس کتاب کی رو سے جائز ہے۔ جلانا وہی پسندیدہ ہے کہ آنکھ سے مردہ نہ نظر آئے اور تھوڑی دیر میں اسکی خاک دیکھی جائے۔ یہ طریقہ سب سے اچھا لیکن زیر زمین دفن کرنے سے کسی طرح بہتر نہیں ہے۔ علاوہ بد نما ہونے کے خلاف مصلحت بھی ہے بعض حالتیں سکتے کی ایسی ہوتی ہیں کہ پانی سے یا قبر سے مردہ پھر زندہ واپس آیا ہے۔ لیکن آگ کے شعلوں سے آج تک کسی کو زندہ واپس آتے ہوئے نہیں سنا۔ بد نمائی کی نسبت بعض کہتے ہیں کہ قبر کا گھنا سڑنا آگ کے جلنے سے کم ہے۔ یہ صحیح ہے مگر اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ انسان کے شکم میں تمام آلائش بھری ہوتی ہے اور کچھ بھی بد نمائی نہیں ہے وہ ظاہر ہوا اور پھر دور نہ کی جائے۔ تو البتہ بد نما اور سخت بد نما ہے۔

اس موقع پر ایک حکایت قابل تذکرہ ہے۔ میرٹ پاس ایک پنجاب کا مسافر آیا اور اس نے بیان کیا کہ میں سکھ تھا اور مسلمان ہو گیا۔ اس زمانے میں کوئی مسلمان ہو جاتا ہے تو توجہ کو بہت کم خوشی ہوتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ وہ کڑا ہی سے نکل کر آگ میں . . . . . گرا بہت پرستی چھوڑ کر قبر پرستی اختیار کی تو اس نے کیا ترقی کی۔ میرا خیال اس مسافر کی نسبت یہ ہوا کہ کسی مسلمان عورت سے تعلق پیدا ہونے سے مسلمان ہو گیا ہو گا یا جھوٹ بولتا ہو گا ایک روز برسبیل تذکرہ اس نے بیان کیا کہ مجھ کو اسلام کے طریقوں کی طرف عرصہ سے رغبت تھی اور جب کوئی مردہ پھونکا جاتا ہے تو مجھے برا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن براوری کے تعلقات سے مسلمان ہونے کی طرف میری ہمت نہیں ہوتی



تھی۔ اتفاق سے میرے باپ کا انتقال ہوا اور مجھے جو ان کا سچو نکلنا لازم آیا۔ طوعاً و کرہاً میں نے انکو جلایا لیکن طبیعت بہت زیادہ بدحظ ہوئی۔ گھر پر آتے آتے میں نے اعلانیہ کلمہ پڑھ لیا تاکہ لوگ واقف ہو جائیں اور پھر ایسی سخت خدمت کی توقع مجھ سے نہ رکھیں۔ اس کا یہ بیان سن کر مجھ کو اس سے ہمدردی ہوئی اور میں نے خیال کیا کہ ممکن ہے اس کا بیان سچ ہو اور اس نے مارل کر ج (اخلاقی بہادری) کے مقتضایہ سے اسلام قبول کیا ہو۔

## فصل نمبر ۷

### مختلف مباحث پر نصوص قرآنی شہادت

آپس کے معاملات میں گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ نظر بہ ضعف حافظہ انسانی دو گواہ شرع میں ضروری ہوتے ہیں اور عورتیں بہ لحاظ اپنی کمزوریوں کے دو ایک مرد کے برابر سمجھی جاتی ہیں۔ قرآن میں گواہی سے گریز کرنا گناہ قرار پایا ہے۔ آیات قرآنی یہ ہیں۔

”اپنے لوگوں میں سے جن پر تمہارا اطمینان ہو دو مردوں کو گواہ کر لیا کرو۔ دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں کہ ایک سچول جائے گی تو دوسری اسے یاد دلا دیگی اور گواہی کو نہ چھپاؤ۔ جو کوئی اسے چھپاتا ہے وہ دل کا کھوٹا ہے۔“

### حب دنیا

• انسان کو مرغوب چیزوں یعنی بیویوں، لڑکوں، سونے چاندی کے بڑے بڑے ڈھیروں عمدہ عمدہ گھوڑوں، مویشیوں اور کھیتی کے ساتھ دل بستگی ہوتی ہے حالانکہ یہ دنیا کی زندگی کے چند روزہ فائدے ہیں اور اچھا ٹھکانا اسی اللہ کے ہاں ہے۔“

### صبر

دنیا کی زحمتوں کا مقابلہ کرنے والی کوئی شے ہے تو وہ صبر ہے۔ اس کے متعلق قرآن میں ہے۔

۱۔ سورہ بقرہ۔ رکوع ۳۹۔

۲۔ سورہ آل عمران رکوع ۲۔



• مسلمانوں تکلیف برداشت کرنا اور تکلیف برداشت کرنے کی تعلیم دینا اور آپس میں مل کر رہنا۔ اللہ سے ڈرنا کہ تم اپنی مراد کو پہنچو۔“

• تکلیف برداشت کرنا کہ اللہ نیکو کاروں کے اجر کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔“

### صَادِقُ الْبَيَانِ وَالْيَفَاءُ وَعَدَهُ

زمانہ جاہلیت کے عربوں میں تمام عیوب تھے لیکن وعدے کے وہ بچے ہوتے تھے اور کذب کو نہایت مذموم جانتے تھے باوجودیکہ اس کے متعلق عربوں کو چنداں تعلیم کی ضرورت نہ سمجھی پھر بھی قرآن میں اس کے متعلق بہت سی آیتیں ہیں۔ اگر عربوں کی حالت اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کی سی ہوتی تو شاید قرآن کے دوحصوں میں عقدہ بیوگان اور ایفاء وعدہ کے احکام ہوتے اور ایک حصہ میں دیگر احکام درج کئے جاتے۔ قرآن کی آیتیں جو اس کے متعلق ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

• مسلمانوں! اپنے اقراروں کو پورا کرو۔“

• تمہاری لالیعنی (یعنی غیر ارادی) قسموں کا خدا مواخذہ نہیں کرے گا۔ ہاں بچی قسموں کا تم سے مواخذہ کرے گا اور اس کا کفارہ ہے دس مساکین کو بیچنا یا اس کا کھانا کھلانا جیسا کہ بال بچوں کو کھلاتے ہو۔ یا دس مساکین کو کپڑا پہنانا یا ایک بردہ آزاد کرنا۔ پھر جسے یہ قدرت نہ ہو وہ تین دن روزہ رکھے۔“

• جب کہو تو قرابت مندی کیوں نہ ہو الفصاف کی کہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ اللہ تم کو یہ حکم دیتا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔“

• مسلمانوں! خدا سے ڈرو اور سچ بولنے والوں میں رہو۔“

• اور جب تم آپس میں قول و اقرار کر لو تو اللہ کی قسم کو پورا کرنا اور قسموں کو جب پکی کر لو نہ توڑو۔ حالانکہ تم اللہ کو اپنا ضامن ٹھہرا چکے ہو۔ اللہ تمہارے افعال سے ضرور واقف ہے۔“

۱۔ سورہ آل عمران رکوع ۲۰ سے سورہ ہود رکوع ۱۸ سے سورہ مائدہ رکوع ۱  
۲۔ سورہ مائدہ رکوع ۱۲ سے سورہ الانعام رکوع ۱۹ سے سورہ نحل رکوع ۱۳







کوئی شخص کسی کا شفیع (سفارش کرنے والا) نہیں ہو سکتا مگر اس (خدا) کی اجازت سے۔  
 ”اس دن کی شفاعت (سفارش) کام نہ آئے گی مگر اسکی جسکو خدا اجازت دے اور اسکا بولنا پسند کرے“

### مداخلت

یہ کچھ نیکی نہیں ہے کہ پھوڑے سے گھروں میں آئے۔ بلکہ نیکی یہ ہے کہ پرہیزگاری اختیار کرے اور گھروں میں آئے تو اس کے دروازوں سے ہو کر آئے۔ ”ایام حج میں عرب پھوڑے سے مکانوں میں آتے تھے حکم ہوا کہ یہ لغو حرکت ہے“  
 ”مسلمانو! اپنے گھروں کے سوا اور گھروں میں گھر والوں سے پوچھے اور ان کو سلام کئے بغیر نہ جایا کرو۔ تمہارے حق میں یہ بہتر ہے۔ تمہیں چاہیے کہ اس کا خیال رکھو اگر گھر میں کوئی نہ ہو تو جب تک اجازت نہ ملے تم اس میں نہ جاؤ اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس جاؤ تو واپس جایا کرو کہ یہ تمہارے لئے زیادہ صفائی کی بات ہے اللہ کو تمہارے اعمال کی خبر ہے۔“

آج کل تمام مہذب قوموں کا اس پر عمل ہے اور اگر کوئی ہندوستانی اس پر عمل کرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ انگریزوں کی تقلید ہیچا ہے اور یہ نہیں سمجھتے کہ قرآن کے حکم کی تعمیل ہے۔  
 ”جب تمہارے لڑکے بلوغ کو پہنچیں تو جس طرح ان سے بڑے (گھروں میں آنے کے لئے) اجازت مانگتے ہیں اسی طرح انکو بھی اجازت مانگنا چاہیے۔“

### صدقہ

خیرات کا مال بس حق ہے فقیروں کا محتاجوں کا ان کا رکنوں کا جو صدقات پر تعینات ہیں اور ان لوگوں کا جن کے دلوں کا پرچانا منظور ہے اور گردنوں کے چھڑانے میں بھی خرچ کرنا چاہیے اور قرضداروں اور محتاجوں اور مجاہدوں اور مسافروں کو بھی دینا چاہیے یہ اللہ کے ٹھہرائے ہوئے حقوق ہیں کہ وہ علیم و حکیم ہے۔  
 اگر خیرات ظاہر میں دو تو وہ بھی اچھا ہے اور اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے ایسا دینا تمہارے گناہوں کا کفارہ ہو گا۔ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔“

### مال یتیم

”یتیموں کے مال ان کے حوائج کو اور مال طیب کے بدلے مال حرام نہ لو یعنی اپنے خراب مال سے یتیموں کا اچھا مال نہ بدلو اور نہ ان کے مال اپنے مالوں میں ملا کر خورد برد کرو۔ یہ بڑے گناہ کی بات ہے... یتیموں کو کاروبار میں لگائے نہ ہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچیں۔ اس وقت اگر ان میں صلاحیت دیکھو

۱۔ سورہ یونس رکوع ۱ ۲۔ سورہ طہ رکوع ۶ ۳۔ سورہ بقرہ رکوع ۲۲ ۴۔ سورہ نور رکوع ۸ -  
 ۵۔ سورہ توبہ ۸ - سورہ بقرہ رکوع ۳۷



تو انکا مال ان کے حوالے کر دیا اور ایسا نہ کرنا کہ ان کے بڑے ہونے کے اندیشے سے جلدی جلدی انکا مال فضول خرچی کر کے کھاپی ڈالو (روٹی) یا مقدور کو یتیم کے مال سے بچا چاہیے اور حاجت مند بقدر ضرورت کھالے تو مضائقہ نہیں) اور جب یتیموں کو انکے مال حوالے کرنے لگو تو گواہ کر لو ورنہ حساب لینے کو تو اللہ بس ہے... جو لوگ ناحق یتیموں کا مال خرید کر دیتے ہیں وہ اپنے پیٹ انکار سے بھرتے ہیں اور عنقریب دوزخ میں پڑیں گے۔

کون ہے جس کے پاس چھوٹے چھوٹے بھانجے اور بھتیجے یتیم ہو کر رہتے ہیں اور وہ قرآن کے مطابق ان کے مال ان کے بلوغ پر گواہوں کے سامنے ان کے سپرد کرتا ہے اور انکی نابالغی میں سمجھتا رہتا ہے کہ ان کے بلوغ پر حساب دینا ہوگا اس زمانہ انحطاط میں کوئی ایسا نہیں ہے لیکن اپنے عروج کے زمانہ میں جب تین بھتیجے تمام مسلمان ایسا ہی کرتے شاعری :- شاعری تو نام ہے کلام سوزوں کا لیکن عرب میں بھوگوئی اور تغزل کا نام شاعری تھا قرآن میں اس لغو گوئی کے متعلق ارشاد ہوا۔ ”شعرا کے پیرو گمراہ ہوتے ہیں۔ تو اس بات پر نظر نہیں کرتا کہ شعر (خیالی) میدان میں سرگرداں رہتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو خود نہیں کرتے۔“ لیکن حدیث سے ثابت ہے کہ شاعروں نے جب اسلام کے متعلق قصیدے لکھے اور پیغمبر کی تعریف کی تو پیغمبر نے پسند فرمایا۔

حرام و عطلال :- ”اس نے تو تم پر بس مرا ہوا (جانور) اور خون اور سور کا گوشت حرام کیا ہے اور نیز وہ جو خدا کے سوا کسی اور کیلئے نامزد کیا جائے۔ جو مجبور ہو عدول حکمی کرنے والا اور حد سے بڑھنے والا نہ ہو اسپر کسی چیز کے کھالینے کا گناہ نہیں ہے اللہ بے شک بخشنے والا مہربان ہے۔“

چار پائے جانور تمہارے لئے حلال کر دیئے ہیں باسٹنائے ان کے جو آگے تم کو سنائے جائیں گے لیکن حالت احرام میں تم شکار کو حلال نہ سمجھو۔“

مرا ہوا جانور خون۔ سور کا گوشت اور وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور کے لئے نامزد کیا گیا ہو گلا گھٹنے سے مر گیا ہو چوٹ سے مرا ہو گر کر مرا ہو اور سینگ لگ کر مرا ہو۔ یہ سب تم پر حرام ہیں اور نیز وہ جانور جن کو درندوں نے کھایا ہو مگر جبکو تم حلال کر لو وہ حرام نہیں ہے۔ اور وہ بھی حرام ہے جو کسی تھان پر ذبح کیا گیا ہو اور تیروں سے جو آپس میں تقسیم کرتے ہو یہ گناہ ہے۔ ”دیہ ایک قسم کی تمار بازی تھی کہ اونٹ کے گوشت تیروں سے جہاں عرب باہم تقسیم کرتے تھے۔“

## فصل نمبر ۷۵

مسلمانان ہند کی حالت زار

یا ابا الفضل رسول عربی کی امت :- نفس سرکش کی مقلد ہے خدا کی قدرت

۱۔ نثار رکوع ۱۱۷ شعرا رکوع ۱۱۷ بقدر رکوع ۲۱۱ المائدہ رکوع ۱۱۷ المائدہ رکوع ۱۱۷



بندۂ خاص تھے ہم موردِ الطاف تھے ہم  
 دن برے آئے تو مت بدل زمانہ بدلا!  
 راہِ ٹیڑھی جو چلے اس کا نتیجہ دیکھا  
 چھوڑ دی پروئی دین محمد ہم نے  
 اپنے مذہب کا پتہ ہی نہیں چلتا ہم کو  
 ہم نہ مومن ہیں نہ کافر نہ مجوسی نہ یہود  
 پارسی ہیں نہ مسیحی نہ کوئی اور طریق  
 بت پرستوں کے مقلد ہیں دلوں میں لیکن  
 اپنی آنکھوں سے لگاتے تو ہیں قرآن کو ضرور  
 یا تو مجموعہ احکام سمجھتے ہی نہیں  
 یوں تو پڑھ لیتے ہیں اک رات میں قرآن تمام  
 پیر جیلاں سے ہے اس طرح حکایت منسوب  
 حضرت قدوہ جیلاں نے یہ ارشاد کیا  
 یہی کہتے کہ جماعت ہے یہ دیوانوں کی  
 اور وہ دیکھتے تم کو تو تھیسر ہوتا  
 آخری دورِ منغل میں تھا اتر جیسا ہند  
 دن دکھائے یہ جہالت نے انھیں آخر کار  
 سندھ سے قاہرہ تک کفر کا آوازہ بھقا  
 شانِ مجبور کہ کفارِ مسلمان ہوئے  
 شرک کا نام مٹا دورِ معاصی گزرا  
 کچھ دنوں تک رہی پابندی احکامِ بول  
 رفتہ رفتہ ہوئی پھر اس میں خرابی پیدا  
 چھا گئیں آکے جہالت کی گھٹائیں ہر سو  
 جس طرف دیکھیے ادبارِ فلاکت طاری  
 جہل ہی جہل ہو پھر کیوں نہ ہو کمزور خیال  
 جہل اک نام ہے اخلاق کی کمزوری کا

یو جدار ہتی نہ تھی ہم سے خدا کی رحمت  
 اپنی نیت نہ بدلتی تو نہ ہوتی یہ گت  
 دیکھیے اور دکھاتی ہے ابھی کیا قسمت  
 جاہ و دولت نے ہمیں چھوڑ دیا یا قسمت  
 کون مجبور ہے اور کیا ہے ہماری نکت  
 دہریہ ہونے سے ہم کو ہے بظاہر نفرت  
 ہم کو آتشکدہ اور چرچ سے بھی ہے نفرت  
 منہ سے انکار ہے انکار میں از حد شدت  
 اس کے احکام سے لیکن ہے سراسر وحشت  
 یا نہیں جانتے قرآن کی اعلیٰ عظمت با  
 ضد ہے مفہوم سے لفظوں سے بظاہر رغبت  
 پوچھی اک روز مریدوں نے صحابہ کی سفت  
 تم اگر دیکھتے اصحابِ نبی کی صورت  
 یہی کہتے کہ نہیں ہے یہ نبی کی امت  
 کہتے کفار سے بھی انکی ہے بدرجہا لنت  
 اس زمانہ میں تھی ویسی ہی عجم کی حالت  
 ہوئے کفارِ منغل وارثِ تخت و دولت  
 کعبۃ اللہ میں تھے نام کو اہل سنت  
 اور پھر ان سے ہوئی دین کی اپنے عزت  
 نورِ اسلام نے دنیا سے مٹائی ظلمت  
 کچھ دنوں تک رہی اسلام کی اچھی حالت  
 رفتہ رفتہ ہوئی پھر اس میں نمایاں نکت  
 چھا گئی دیکھتے ہی دیکھتے کیسی ظلمت  
 نہ ترقی نہ و اقبال نہ علم و دولت  
 علم کے ساتھ گئی ساری دماغی قوت  
 اور تعلیم کا حاصل ہے صفائی قوت



عبرت اے دیدہ بینا کہ ہوا ہے کیا حال  
 کتنے ہم بڑھ گئے تھے جبکہ نہ تھے ہم کچھ بھی  
 سارے ملکوں میں برا ملک ہمارا افسوس  
 ساری قوموں سے بری قوم ہماری اے اے  
 واہ ری ہند کی اقلیم ترا کیا کہنا  
 انہیں قوموں میں تھی اک قوم مسلمان جو آج  
 کوئی درجہ نہیں ہے شرمی و گمراہی کا  
 بت پرستی کے جو دشمن تھے انہیں کی اولاد  
 بھولی توحید کو قوم مسلمان۔ افسوس  
 دیوتا ہند میں دس تھے تو مسلمانوں نے  
 ہائے انصاف کرے کوئی موجد ہم میں  
 منہ سے کہتے ہیں خدا نہیں ہیں لیکن دل میں  
 اور ہم لوگوں میں وہ جہل کہ خالق ہے سچ  
 بخش کے ساتھ عمر زید۔ بکر کی ترکیب  
 کوئی غازی کہیں بچلے ہے کہیں کوئی شہید !  
 پیر و شاہ صغی قوم کے اصلی افراد  
 گنبد و قبر پرستی سے تھی نفرت پہلے  
 شرم ہم کو ہے نبی کی نہ خدا کا ڈر ہے  
 گھر میں بیوائیں چھپے چوری جو چاہیں کر لیں  
 پردہ داری سے ہے مقصود نہ سو پردہ دری  
 ہوں جو لوہے کے گھر سے ٹرے تو سیدھا کریں  
 وانے بارود کے قلعوں کو اڑا دیتے ہیں !  
 بھاڑ کر پیٹ زمین کا نکل آئیں شاخیں  
 فرض کر لو کہ ہزاروں میں کہیں ہیں دو چار  
 ایک کا مورد الزام بھی ہونا ہے بہت  
 قوم کی رسم نے مجبور کیا خا طی کسوا !

مگر افسوس کہ سمجھ میں تو بھری ہے غفلت  
 کس قدر گٹ گٹی ہے بڑھ کے ہماری ہمت  
 سارے عالم میں برائی کی ہماری شہرت  
 سب کی قسمت سے بری آج ہماری قسمت  
 تیری قوموں کا عروج اور وہ انکی رفعت  
 نفل ظلت کو سمجھتی ہے فردغ عزت  
 جبکی تکمیل میں قاصر ہو ہماری ہمت  
 بت پرستی کو سمجھتی ہے شعار ملت  
 ہیں اگر ہم میں موجد تو نشان ندرت  
 کر دیئے ہیں یہ بے شرک کی انکے حالت  
 یا یہ عیسائی کہ تثلیث ہے جن کی ملت  
 یہ سمجھتے ہیں کہ سب میں نہیں خالق کی صفت  
 روح کو مردوں کو حاصل ہے یہ دست قدرت  
 نام ہی سے ہے عیاں قوم کی پوری حالت  
 کم کہیں پیر و پمیر سے خدا کی طاقت  
 ہند میں آئے تو انکی بھی بنی کیسی گت  
 اب اسی کو وہ سمجھتے ہیں شعار ملت  
 کفر سے شرک سے مملو ہے ہماری بدعت  
 عقد کا نام کہیں آئے تو آئے شامت  
 ایسے پردوں سے دبا ہے کہیں زور فطرت  
 دیکھ لو آنکھ سے تم بھگے جنوں کی طاقت  
 دم دے کیسے ہی مضبوط ہوں آئے شامت  
 روکنے سے کبھی رکتا نہیں زور فطرت  
 ایسے گھر جن میں کم آتی ہے گناہ کی نوبت  
 منہ دکھائے نہ کبھی قوم جو ہو کچھ غیرت  
 قوم کے فعل سے پہنچی یہ گناہ گناہ



کامیابی بھی اگر تم کو ہوئی فرزند کیا  
 تو بھی سمجھو کہ ہوا کام یہ تم سے کیسا  
 مردوزن کی کبھی رکنے کی نہیں یکجائی  
 آفرینش کے قوانین بدل دے کوئی  
 آفرینندہ عالم کو بڑھانا مقصود  
 چاند پر خاک نہ ڈالو کہ غلط ہے کوشش  
 یہ لڑائی تو ہے اللہ سے توبہ - توبہ  
 کج روی تم میں جہالت کی ہے کیا کام چلے  
 اس شرافت سے رذالت ہی کہیں بہتر ہے  
 انکی بیوائیں کریں عقد رہیں با عصمت  
 اپنے دستور سے پابند یہ عصمت کی زمیں  
 یہی اطوار ہے اور جو کچھ دن قائم  
 ناز جس بات پہ اسلاف کو تھا آج وہی  
 عورتوں پر جو مظالم ہیں وہ لاکھلی ہیں  
 عورتوں کے جو ہیں مرقوم قصص قرآن میں  
 وہ تو اترا نہیں قرآن زبان میں انکی  
 ہر جگہ اپنی جہالت کا اثر دکھلاتے  
 کفر ہے کفر کہ قرآن کو اچھا نہ کہیں  
 کہے اللہ کہ دختر کو پس سے دو نصف  
 عشر بھی دیتے ہیں دس بیس میں دو چار کہیں  
 انکو تر کہ کی ریاست کی نہیں کچھ برواہ  
 بعض ایسے ہیں کہ انکا ہے شمار مذہب  
 قول یہ اور عمل یہ کہ عیاذاً باللہ !  
 کم ہیں وہ لوگ کہ لیں کام جو تاویلوں سے  
 کیسے کیسے شرفاران میں معزز عمت از

رہ گئی عفت و عصمت کی سراسر عزت  
 ہائے وہ کام سراسر جو خلاف سنت  
 جان لو خوب کس پر ہے مدار خلقت  
 غیر ممکن ہے نہیں اتنی کسی میں قدرت  
 ہائے افسوس گھٹانے کی تمہاری نیت  
 خاک بر سر تمہیں رکھے گی تمہاری ذلت  
 اس کے احکام سے آئین سے تم کو نفرت  
 کام آہی نہیں سکتی ہے کبھی الٹی مست  
 اچھے اچھوں سے رذیلوں کی ہے اچھی حالت  
 انکی بیوائیں رہیں قید اٹھائیں ذلت  
 جن گھروں میں کہ ہو قرآن وہاں یہ حالت  
 کیا عجب ہے جو رذیلوں سے ہو بدتر حالت  
 فہم و دانش میں ہمارے ہے ہماری ذلت  
 بڑھتی ہی جاتی ہے جو راور ستم کی شدت  
 ناخوش امپر ہے رسولِ عربی کی امت  
 کیا غضب تھا جو سمجھ جاتے یہ اسکی آیت  
 اور رکھا جاتے یہ تو ریش کی ہر اک آیت  
 یا یہ سمجھیں کہ ہے قرآن خلاف حکمت  
 یہ کریں عشر کے دینے میں بھی تو سوجت  
 ورنہ کہہ دیتے ہیں لڑکی کو نہیں ہے رغبت  
 گو کریں بنت نبی باغ فدک پر حجت  
 غضب اور ظلم پہ تسبیح میں پڑھنا لعنت  
 شیر مادر کی طرح بہنوں کے حق سے رغبت  
 بہت ایسے نہیں تاویل کی جنکو حاجت  
 خود بھی رہ جانتے ہیں آپکو فخر مدت



ناز اس فعل پہ جو فعل کہ قرآن کے خلاف  
 کوشش اسکی کہ نہ دے قوم سے کوئی حصہ  
 باپ ماں کی جو یہ حالت ہو تو بھائی نا حق  
 سیر چشمی کے سبق بھول گئے ہیں ہم سب  
 کوئی مہمان جو آجائے تو گھبرا جائیں !  
 کہے اللہ کہ وعدے کر والیفا اپنے  
 ہوئے محتاج کہ تھے مست مئے جام عزور  
 جہل و نخوت سے سروکار ہے ہم کو بالکل  
 نہ تو غیرت ہے نہ ہمت نہ حمیت ہم میں  
 کر لیا آکے تو کل نے گھرا اپنا ہم میں  
 نہ سفر کرنے کا ہے شوق نہ علم روزی کا  
 ہم کو کچھ فکر نہیں کل کی کہ ہم کیا ہونگے  
 جھوٹ سچ ہے جو بزرگوں کی کمائی باقی  
 ہائے کیا ہو گیا وہ خلق وہ ہمدردی قوم  
 یا وہی ہم تھے کہ تھے رونق بزم تمکین  
 یا وہ سطوت کہ چمکتے تھے لسان خود نشید  
 یا وہ سرگرمی تحصیل کہ اللہ - اللہ  
 یا اسی ہند میں تھے تاج سیراہل غرور

حق منصوص کے دینے میں ہے کیا کیا حجت  
 کہ نہیں دخت و نسا کو ہے کچھ اسکی حاجت  
 کیوں ہو بد نام کہ انساں ہے خلیص الخلق  
 نجل و اسراف سے ہے دل کو ہمارے رغبت  
 ہم کو مہمان کی صورت ہے قہقا کی صورت  
 اور وعدوں کی نہ ہو دل میں ہمارے عزت  
 آیا ادبار کہ تھی علم و ہنر کی قلت  
 اور تعلیم و تعلم سے نہیں کچھ رغبت  
 پکیشن میں ٹھہرنے کی یہی ہے صورت؟  
 ہو گئی کب معیشت سے ہمیں جب نفرت  
 نہ تجارت سے تعلق ہے نہ شوق محنت  
 جانتے ہی نہیں دنیا کی ہے اب کیا حالت  
 ہوتی جاتی ہے وہ سب نذر بساط عشرت  
 ہائے کیا ہو گئی آخر وہ محبت الفت  
 یا وہی ہم ہیں کہ ہیں نقش بساط نفرت  
 یا یہ حالت کہ ہیں اب شمع سحر کی صورت  
 یا یہ درندگی شوق کہ عبرت - عبرت  
 یا یہیں کھو گریں کھاتے ہیں خدا کی قدرت

نہ وہ اسلام نہ اب وہ برکات اسلام  
 بستر عیش پہ ہے قوم کو خواب غفلت

تمام شد



# الاسلام

حصہ دوم

از

علامہ ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی

نہیں کیلپی

کراچی

بلاس اسٹریٹ

قیمت دس روپے